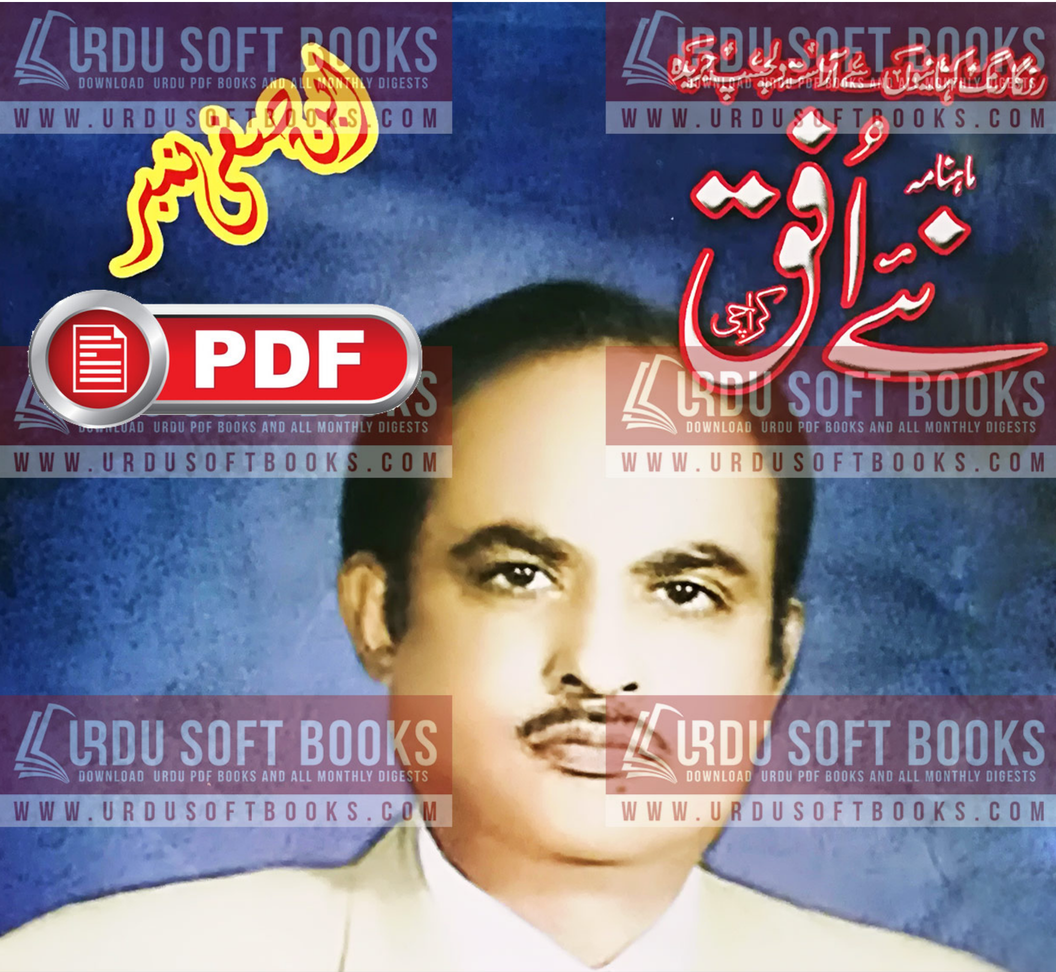


Naye Ufaq Digest July 2018

نئے اُفق

رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہر احمد قریشی
مزئین
نورالدین

پاکستان (فی پرچہ)............50 روپے	
پاکستان (سالانہ)............600 روپے	

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد	42
شمارہ	06
جولائی	2018

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
editorufaq@aanchal.com.pk

NAEY UFAQ PUBLICATION

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

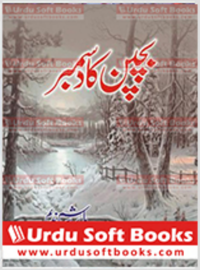
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74400 فون نمبرز 021-356203771/2

فیکس 021-35620373 نئے افق پبلی کیشنز کے زیرِ مطبوعات ای میل info@aanchal.com.pk

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download





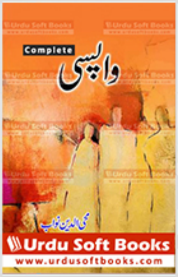
















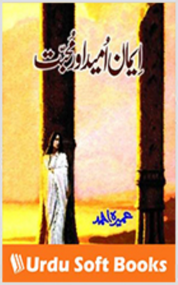












دستک

مشتاق احمد قریشی

درخت لگائیں ملک بچائیں

1947ء سے میں کراچی کا رہائشی ہوں، شروع کے دنوں میں ہم گھر سے باہر سڑکوں پر کھیلا کرتے تھے، جگہ جگہ سڑکوں کے کنارے درخت لگے ہوتے تھے، کہیں بیر کے درخت کہیں گولر تو کہیں گوندنی، کہیں پیپل سب کے سب سایہ دار درخت ہوا کرتے تھے، جب مسافر چلتے چلتے تھک جاتے تو ان ہی درختوں کے سائے میں دم لینے رک جایا کرتے تھے، گلی محلوں تک میں درخت اور پھول دار بیلیں ہوا کرتی تھیں، تب بارشیں بھی خوب ہوا کرتی تھیں، سرِ شام گرمیوں کے موسم میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلا کرتی تھیں، بجلی کسی کسی گھر میں ہوا کرتی تھی، پھر بھی حبس یا گرمی سے تنگ آئے لوگوں کی کبھی فریاد نہیں سنی تھی۔ لوگ رات کو کمروں سے نکل کر دالان میں بستر لگا کر آرام سے سو جایا کرتے تھے، گرمیوں کے موسم میں بھی درجہ حرارت 30 سے 35 درجہ تک رہتا تھا، اس سے ہی گرمی کی شدت کا اندازہ ہوتا تھا۔ گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی خوب مزا دیتی تھی۔ آج کل کی طرح اذیت ناک نہیں ہوا کرتی تھی۔ پھر کیا ہوا اس شہرِ بے مثال کو کس کی نظر لگ گئی۔ کیسا اندھیر مچ گیا ہے۔ درجہ حرارت 42 سے 47 درجہ تک کیسے پہنچ گیا آخر کوئی تو وجہ ہوگی اس تبدیلی کی؟

ہمارے ایک شناسا جو ماہر نباتات و جنگلات ہیں، سے ہم نے دریافت کیا کہ آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ کراچی کے موسم کا سارا نظام ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو ہمارا اپنا کیا دھرا ہے۔ موسم اپنے آپ ہی تبدیل نہیں ہوا، اسے ہم ہی لوگوں نے تبدیل ہونے پر مجبور کیا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا ہے کہ جو درخت آکسیجن بنایا کرتے تھے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کیا کرتے تھے انہیں ہم نے خود جڑوں سے نکال کر پھینک دیا ہے۔ اب جو شجر کاری کی جا رہی ہے وہ ایسے درخت ہیں جنہیں یورپ اور امریکا نے دیس نکالا دیا ہوا ہے، یہ درخت جو اب اگائے جا رہے ہیں ان کے بارے میں خود امریکا و یورپ کے تحقیقاتی اداروں کی رپورٹ ہے کہ یہ آکسیجن جذب کرتے ہیں، انہیں پانی کی وہ ضرورت نہیں جو دوسرے اقسام کے پودوں، درختوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف زیرِ زمین پانی کو ختم کرنے کا باعث ہیں بلکہ شفاف ماحول کو بھی خراب کرنے کا سبب ہیں، ان سے نئی نئی بیماریوں کا پھیلاؤ ہو رہا ہے، سب سے اہم بات ان درختوں کے سلسلے میں جو تحقیق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ درخت بارش دشمن درخت ہیں، ان کی افزائش کی وجہ سے بارش نہیں ہوتی یا کم کم ہوتی ہے جو انسانی ضروریات کے مطابق قطعی نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ جو پانی کے ذخیرے متاثر ہو رہے ہیں وہ وقت دور نہیں اگر یہ درخت اسی طرح نمو پاتے رہے اور بڑھتے رہے تو نہ صرف کراچی بلکہ پورے ملک میں پانی نایاب ہو سکتا ہے۔ زیرِ زمین پانی جو پہلے پانچ سات فٹ پر ہوا کرتا تھا اب چالیس یا پچاس فٹ پر بھی مشکل سے میسر آتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ویسے ویسے پانی کی سطح نیچی اور نیچی ہوتی جائے گی۔ بارشیں نہ ہونے سے دریا، ندی، نالوں میں بھی پانی نایاب ہوتا جائے گا۔ یہ درخت جو آج ہمیں کراچی اور اس کے مضافات میں بلند و بالا نظر آ رہے ہیں یہ ہی ماحول دشمن اور آب دشمن درخت ہیں، اس سے طرح طرح کی بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ سب سے اہم اس درخت سے ماحول خراب ہو رہا ہے۔ انسانوں پر براہِ راست اس کا اثر ہو رہا ہے، سستی کاہلی، بے پروائی کا رجحان بڑھ رہا ہے، کچھ اہلِ دانش و تحقیق کا گمان ہے یہ درخت وطنِ عزیز میں دانستہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لگائے گئے ہیں۔

دشمن دندناتا ہوا نہ صرف ہمارے شہروں میں داخل ہو چکا ہے بلکہ ہمارے دروازے تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے ہمیں بے حسی کی نیند میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہماری افواج ہماری سرحدوں کی ہی نہیں نظریاتی سرحدوں کی بھی محافظ ہے۔ آج ہمیں ضرورت ہے کہ دفاعِ وطن کے لیے افواجِ پاکستان کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں، ہمیں صرف اتنا ہی تو

کرنا ہوگا کہ ہر فرد ایک ایک ایسا پودا لگائے جو ملکی ضرورت اور آب و ہوا کے مطابق ہو۔ وطن عزیز کی آبادی 22 کروڑ بتائی جاتی ہے۔ اگر ہر شخص نہیں ایک ایک ہی سہی گیارہ کروڑ درخت لگا کر اس امریکی بے حسی کے سازشی درختوں کو نکال پھینکے اور اپنے دیسی درخت اگا کر اپنے وطن کی اپنے ماحول کی حفاظت کریں کہ یہ ہی زندگی ہے۔ ورنہ تمام اہل وطن نہ سہی کثیر تعداد خصوصاً شہری آبادی بے حسی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو تباہ ہونے سے نہ بچا سکے گی اور بے حسی کی نیند سو کر دشمن کا شکار ہو جائے گی۔

ہماری انتظامیہ اتنی بھولی اور بے پروا ہے کہ انہیں ان درختوں کے نقصانات کا اندازہ ہی نہیں۔ وہ تو اس پر ہی خوش ہے کہ وہ کراچی کو سرسبز شاداب بنانے میں کامیاب ہو رہے ہیں اور خرچہ بھی کم سے کم ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کے نقصانات کا اندازہ ہی نہیں کیا جا رہا اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ ان درختوں سے کہیں بہتر تو کیکر کے درخت ہیں، ان درختوں کا بھی سایہ نہیں ہوتا نہ کسی کے کام آتا، لیکن اس کی افادیت ان درختوں سے کہیں زیادہ ہے۔ سائنس کا اصول ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن مل کر پانی بنتا ہے، ماحول کی آکسیجن جب یہ درخت چوس لے گا تو پانی بننے کا عمل کب اور کیسے ہوگا، ماحول میں بھی ہائیڈروجن کی مقدار ان بیرونی درختوں کی وجہ سے بڑھتی جائے گی جو انسانی صحت کے لیے نقصان کا باعث بنے گی۔ پانی اس کا مشہور مرکب ہے، یہ انسانی جسم پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، سانس کے امراض اور بلند فشار خون کا باعث بھی بنتی ہے، ہوا میں آکسیجن کی کمی کا سبب یہ درخت ہیں جو جگہ جگہ آسانی سے لگائے جا رہے ہیں جو تیزی سے نشو و نما پا رہے ہیں۔ اتنی ہی تیزی سے ماحول سے آکسیجن چوس کر جانداروں کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔

کچھ صاحب آراء محققین کا کہنا ہے کہ یہ نقصان دہ درخت امریکیوں نے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت پاکستان میں لگانے کی منصوبہ بندی کی ہے تاکہ اہل پاکستان بتدریج سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو جائیں اور سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے سے ہاتھ دھو بیٹھیں، یوں یہ تیز طرار قوم بے دام اس کی غلامی پر مجبور ہو جائے کیونکہ دشمن پاکستان قومیں سمجھتی ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم اور انگریزوں سے آزادی میں پیش پیش یہی مسلمان قوم ہی تھی، اس کی جدوجہد نے ہی انگریز کو برے وقت سے دوچار کیا تھا، پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس پاکستانی قوم نے ہی بلا کسی غیر کی شراکت اور سرپرستی کے از خود کوشش کر کے جوہری قوت حاصل کر لی۔ آگے جانے کیا کچھ کر سکتی ہے۔ انہیں اپنا ڈوبتا مستقبل بچانے کے لیے پاکستانی قوم کو ڈبونا ہی ہوگا۔ عسکری قوت یا اقتصادی قوت معاشی قوت کے استعمال کے ساتھ ساتھ بہت خاموشی سے ایسی قوت کا استعمال کیا جا رہا ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ یا یوں کہہ لیں سانپ بھی مارا جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بس ہمارے حکمرانوں، منتظمین کو سوچنا سمجھنا ہوگا کہ یہ بظاہر خوبصورت اور تن آور نظر آنے والے درخت ہمارے لیے کس قدر مضر اور نادیدہ دشمن ہیں، ان سے کیسے اور کس طرح بچا جا سکتا ہے اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا اور صحت بخش بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ان درختوں کو ہٹا کر اپنے دیسی درخت، گوندنی، پیپل، کیکر، شیشم، چیڑ، برگد اور دیگر ایسے ہی صحت آمیز درختوں کو لگانا چاہیے تاکہ ماحول ہی نہیں انسانی ذہن اور زندگی کو متاثر کرنے والے اس دشمن سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، اگر ہر پاکستانی اپنی صحت و زندگی کی حفاظت کے نام پر ایک پودا ایک درخت لگائے تو یہ ہمارا پیارا وطن اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ان ہوا اس لیوا، جان لیوا درختوں سے نجات پائی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی، اپنے وطن عزیز کی ان نادیدہ دشمن قوت سے حفاظت کر سکیں اور دشمن کی اس نادیدہ سازش کو ناکام بنا سکیں، اللہ تعالیٰ ہمارا محافظ ہو، آمین۔

گفتگو

اقبال بھٹی

عزیزان محترم...... سلامت باشد عید الفطر مبارک

تاریخ میں ایسے لوگ بہت عنقا ہیں جنہوں نے اپنے کردار وعمل اور تجربہ سے تاریخ کا رخ موڑ دیا ہو، ایسے لوگ پیغمبر اور اللہ کے نبی ہوتے ہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی میں انقلاب لا کر ان کی زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں انہیں اچھے برے کی تمیز دیتے ہیں ختم المرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کا سلسلہ بند کر دیا قرآن مجید کو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے علم کا منبع قرار دیا اور ہدایت کی کہ تحقیق کر کے فلاح کا راستہ تلاش کرو مجھے اپنے اندر تلاش کرو، لیکن ہم نے خود تحقیق کے دروازے بند کر دیے اور دنیا بھر میں احساس کمتری کا شکار ہو کر ذہنی غلام بن گئے گو اللہ تعالیٰ نے انبیا کا سلسلہ بند کر دیا ہے مگر ہدایت اور رہنمائی کا سلسلہ نہیں روکا اپنے ہدایت یافتہ نیک بندوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً ہماری رہنمائی کرتا رہتا ہے جب 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد قوم ہمت ہار بیٹھی تو سرسید احمد خان کے ذریعے ہم میں علم کی روشنی پھیلائی اور احساس دلایا کہ ہم علم حاصل کر کے ہی غلامی کی زنجیریں توڑ سکتے ہیں علامہ اقبالؒ جیسی عظیم ہستی ہمارے درمیان بھیج کر ایک انقلاب آفریں سوچ کو بیدار کیا یہ علامہ اقبال ہی تھے جس نے بکھرے ہوئے جتھوں کو ایک قوم کی شکل دی جس نے نہ صرف آزادی کا نعرہ لگایا آزادی کا خواب دیکھا بلکہ اس خواب کو شرمندہ تعبیر بھی کیا اسی طرح اردو ادب میں ہمارے ادیب جب مغرب کی فحش نگاری کا شکار ہوئے اور اسی کو ادب اور پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھنے لگے تو اسرار احمد جیسی شخصیت نے ابن صفی کے نام پر ایسے تفریحی ادب کی بنیاد ڈالی جس نے عام آدمی کی سوچ کا دھارا ہی بدل دیا۔ ان کی تحریروں میں نہ صرف تفریحی مواد تھا بلکہ قانون سے محبت کا سبق بھی تھا ان میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی تھی اور ادب کا تڑکا بھی دیکھتے ہی دیکھتے فحش نگاری کسی کونے میں گم ہوگئی اور لوگ ان کی تحریروں کا دیوانہ وار انتظار کرنے لگے محترم ابن صفی دنیا کے واحد ادیب ہیں جن کی زندگی میں سیکڑوں لوگوں نے ان کے کرداروں پر لکھا اور لکھ رہے ہیں انہوں نے جعلی صفی بن کر پیسہ تو کمایا اور کما رہے ہیں لیکن ان کے تخلیق کردہ کسی کردار سے انصاف نہیں کر سکے بلکہ اس کی نفسیات تک کو نہ سمجھ سکے محترم ابن صفی ہم انہیں مرحوم نہیں لکھ رہے کہ وہ اپنی تحریروں میں آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اس عظیم ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نئے افق جوان ہی کا لگایا گیا پودا ہے کی طرف سے ایک چھوٹی سی کوشش کر رہے ہیں ابن صفی نمبر کے لیے جن لوگوں، ادیبوں اور ان کے چاہنے والوں نے ہم سے تعاون کیا ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں اور جنہوں نے مصروفیت یا کسی اور وجہ سے تعاون سے معذرت کی ان کے بھی شکر گزار ہیں۔ (مشتاق احمد قریشی)

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ محترمی ومکرمی جناب انچارج گفتگو السلام علیکم سب سے پہلے تمام قارئین نئے افق اور اس کی ٹیم کو عید الفطر کی مبارک قبول ہو، اس بار ماہ جون 2018ء کا شمارہ مارکیٹ سے 25 مئی کو ملا اور یہ تیسرے چکر پر ملا۔ بہرحال سرورق خوب صورت اور قابل ستائش ہے دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب اس بار جتنے منہ اتنی باتیں لے کر آئے اس کے متعلق کچھ کہنا کچھ اندازے لگانا اب سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات ہے، بہرحال وجہ جو بھی ہے ہماری تو صرف یہ دعا ہے کہ خدا بزرگ و برتر ہمارے پیارے وطن کی حفاظت فرمائے اور دشمنوں کے عزائم خاک میں مل جائیں آمین۔ گفتگو میں محترم اقبال بھٹی صاحب تاجروں اور دکانداروں کو آئینہ دکھاتے نظر آئے واقعی ماہ رمضان میں مہنگائی کے جن کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور قیمتیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں اگلے ماہ کے لیے یہ نوید بہت خوش آئند اور شادی مرگ والی بات ہے کہ اگلا شمارہ ابن صفی نمبر ہوگا یہ تو ادارے کی بہت بڑی نوازش اور مہربانی ہے کہ عید کا لطف دوبالا کرنے کے لیے محترم ابن صفی کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ کام کرنے والے ہیں ویل ڈن محفل میں کرسی صدارت پر محمد رفاقت صاحب میرے قریبی پڑوسی بیٹھے ہیں واقعی آپ کا محبت نامہ اس سلوک کا مستحق تھا کیونکہ لفظ بولتے ہیں اور اپنی قیمت خود بتاتے ہیں ویسے رفاقت بھائی اخبار جنگ میں میں بھی کبھی لکھتا رہا ہوں بچوں کے صفحے کے لیے ایم حسن نظامی قبولہ شریف آپ کے خیالات سے میں متفق ہوں ریاض حسین قمر بھائی آپ کا خط محفل کی جان ہوتا ہے بجٹ میں جو امیدیں ہم لگائے بیٹھے تھے وہ تو اپنی موت آپ مرگئیں جب دس فیصد کا لولی پاپ تھما دیا گیا مہنگائی کے اونٹ کے منہ میں زیرہ دے دیا گیا اب دیکھتے ہیں لوگ بلکہ عوام الیکشن میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں آپ کا تبصرہ حسب معمول بہت جاندار اور مدلل ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ پرنس افضل شاہین آپ کا قطعہ ہر بار کی طرح بہت فٹ ہے سرورق پر عمران خان کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کی پارٹی میں بھی فصلی بٹیرے شامل ہو رہے ہیں خیر دیکھیں کیا ہوتا ہے جاوید احمد صدیقی صاحب ویل کم آپ کا خط ہر بات کا احاطہ کیے ہوئے ہے مشتاق احمد قریشی صاحب کی جن تصانیف کا ذکر نہیں کیا گیا ان کا ذکر ضروری ہے آپ نے اس کے متعلق یاددہانی کرا کے خوب دوستی کا ثبوت دیا ہے کبھی وقت نکال کر فون پر بات بھی کرلیا کیجیے اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف محترم سلیم اختر صاحب کی کہانی جھوٹی پجارن پڑھی بہت اچھی کہانی لگی عورت ایک پہیلی ہے اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے فریال آخر ایک طوائف تھی جس کا پیار جھوٹا، محبت بناوٹی اور ادائیں جھوٹی ہوتی ہیں ناصر بے وقوف تھا جو سائے کے پیچھے بھاگتا رہا اپنی دولت فریال کی جھوٹی اداؤں پر نچھاور کرتا رہا بقول ارسطو کے عشق محبوب کے عیبوں کے ادراک سے حس کا اندھا ہوتا ہے محمد رفاقت صاحب کی بلیو وہیل موضوع کے اعتبار سے ایک اچھی کہانی ہے لیکن اسے ذرا وضاحت سے لکھا جاتا تو اور بھی اچھی ہوسکتی تھی بہت جلدی میں کہانی کا گلہ گھونٹ دیا گیا بہرحال کوشش اچھی ہے اور تعریف کرنا تو بنتا ہے نا نسیم سکینہ صدف کی سمجھوتہ بھی پسند آئی بات وہی ہے کہ عورت کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ کہیں یہ وفا کی دیوی ہے اور کہیں فریال جیسی بے وفا، خود غرض اور مطلبی، تربیت یافتہ، محمد اکرم مپال کی کہانی میں ایک فرض شناس سیکورٹی گارڈ

نے اپنی جان پر کھیل کر مالکان کی جان و مال بچالی باقی کہانیوں میں خواہش سعادت مندی بہترین لگیں فن پاروں میں سارا انتخاب اچھا ہے اب بات ہو جائے ذوق آگہی کی اس میں پرنس افضل شاہین، عبدالجبار رومی، ایم حسن نظامی اور محمد جاوید بٹ کا انتخاب بہترین ہے خوش بو سخن میں سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ قابل احترام بھٹی صاحب آداب عرض سلام خلوص و مسرت امید ہے آپ اور نئے افق سے جڑے سبھی احباب خیریت سے ہوں گے رمضان المبارک نمبر بابرکت ماہ کی سعادت بھری گھڑیوں میں جلوہ افروز ہوا ٹائٹل پر خوبرو حسینہ مقدس ماہ کے احترام میں دوپٹہ اوڑھے سرنہوڑے نگاہ نیچی کیے براجمان پائی۔ خوشی ہوئی کہ رحمتوں بھرے مہینے کا احترام و تقدس برقرار رہا ذرا آگے جناب مشتاق احمد قریشی صاحب اپنی پر معنی سیاسی گفتگو اور موجودہ سیاستدانوں پر باریک بینی سے اپنا تجزیہ فرما رہے تھے۔ اپنوں کی گفتگو میں بھٹی صاحب موجودہ مہنگائی پر روشنی ڈالتے نظر نواز ہوئے انہوں نے ابن صفی نمبر کی بھی نوید سنائی اردو ادب میں لاکھوں کروڑوں لوگوں نے انہیں پڑھتے ہوئے اپنی اصلاح کی اور آج کے کامیاب لکھاری ٹھہرے۔ محمد رفاقت کرسی صدارت پر براجمان پائے جی مبارکباد قبول فرمائیں انہوں نے پر معنی گفتگو کی پرنس افضل شاہین، جاوید احمد صدیقی اور ریاض بٹ سبھی اپنی گفتگو کی باری پر عمدہ اور پیاری گفتگو کرتے پائے سبھی احباب نے میرے تبصرے اور نگارشات کو سراہا جس کے لیے ڈھیروں شکریہ اور ذرہ نوازی کہ ہم سبھی احباب مل بیٹھ کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور مسرتیں شیئر کر رہے ہوتے ہیں۔ طاہر قریشی صاحب خداوند کریم کی برکتوں، رحمتوں اور نوازنے والے نام کا ترجمہ تشریح اور فضائل اپنی قابلیت کی بنیاد پر بیان فرما رہے تھے یہ نئے افق کا ایمان پرور سلسلہ ہے جسے پڑھتے ہوئے دل و دماغ منور ہو جاتا ہے پرچے کی پہلی تحریر فرخ ندیم ملک کے حصہ میں آئی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر عمدہ ریسرچ کی بلیک ہارٹ اپنے انجام کو پہنچا اور جوئی مبارکباد کا مستحق ٹھہرا بہت خوب جی۔ وسیم بن اشرف نے بھی انگریزی ناول کو اردو کے خوب صورت قالب میں ڈھالا جو بہت بڑا کارنامہ ہے ان کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ خلیل جبار کا انداز تحریر بھی سراہنے کے قابل ہے انہوں نے پراسرار گمشدگی پر گہرا قلم چلایا اور اسماعیل کو ماورائی یاسمین کا پتا چل گیا۔ عمارہ خان کی تحریر ''وہ تیس دن'' کی پہلی کڑی معیاری انداز تحریر سے پر پائی سر سلیم اختر جھوٹی پجارن میں جلوہ گر پائے انہوں نے نجی زاویوں سے اس تحریر میں نئی روح پھونک دی اور جھوٹی پجارن سے خلاصی ہوئی۔ ابراہیم جمالی کے نوکیلے قلم سے نکلی تحریر بھی بہت سے اسباق دے گئی۔ محمد رفاقت نے نیٹ ورک پر اور اس کے استعمال پر خوب صورتی سے روشنی ڈالی نسیم سکینہ صدف، معاشرتی رویوں پر انمول لفظوں سے سمجھوتہ کرتی پائیں جیسا کہ راشدہ نے کیا۔ عرفان راے صاحب کالج کی محبت میں محبت کو مذاق، سودے بازی یا محض دل لگی سمجھنے والوں کے لیے عبرت کا مقام بتایا تو زریں قمر صاحبہ تاریخی اوراق پلٹنے میں مصروف پائیں جو انتہائی دشوار مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ محمد اکرم مپال تربیت یافتہ گارڈز کی روداد بیان فرما رہے تھے جو اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر مالکوں کی حفاظت کرتے ہیں مظہر سلیم بھی عورت

کی خواہش کو اچھے لفظوں کی مالا میں لیے جلوہ گر پائے۔ رانا زاہد حسین متکبرانہ حکمرانوں اور وڈیروں کی بڑائی کا تذکرہ بیان فرما رہے تھے بلاشبہ غرور کا سر نیچا ہوا کرتا ہے مگر یار یہ تو تحریر پہلے بھی ''جوتیاں'' کے عنوان سے لاہور کے ایک پرچے میں شائع ہوئی ہے آئندہ احتیاط کرنا۔ فن پارے میں نفیسہ سعید، عائشہ بٹ اور سلمان بشیر ٹاپ پر رہے خوش بوئے سخن شاعری دل کا آئینہ ہوتی ہے اور اچھی شاعری میں پورا عکس نظر آتا ہے نوشی صاحبہ نے اسے اچھا ترتیب دیا۔ ساحر جمیل سید بارہویں زینے پر جکڑے پائے اور تحریر مرشد کو منفرد مقام پر لے آئی۔ لو جی تبصرہ مکمل ہوا آپ نے عید الفطر کیسے منائی اور اپنے پڑوسیوں اور رشتے داروں سے کیسے پیش آئے ضرور بتایئے گا اور آخر میں

عید میرے سپنوں کی سعید نہ سہی
سنگ تری یادوں کا سہارا ہی تو ہے

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ مدیر محترم نئے افق سلام مسنون امید کامل ہے کہ آپ اور آپ کا عملہ فضل رب کریم خیریت سے ہوں گے اور ہم قارئین کے ذوق کی تسکین کے لیے شب و روز مصروف عمل ہوں گے خدائے لم یزل آپ سب کو صحت مند رکھے و ستک میں جس طرح محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب جس طرح حالات حاضرہ سے ہمیں آگاہ فرماتے ہیں وہ ان ہی کو زیبا ہے رب اللعالمین انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور ان کے قلم میں مزید قوت عطا فرمائے ہمارا پالا جس طرح ایک شاطر، فریبی اور غلیظ ترین دشمن سے پڑا ہے وہ ہمارے لیے سوہان روح ہے ایک تو اس نے پاکستان کی شہہ رگ ریاست جموں و کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے وہ اس کی مکاری اور انتہائی کمینگی کو ظاہر کرتا ہے اب سننے میں یہی آ رہا ہے کہ وہ دریائے نیلم کا رخ موڑ رہا ہے اس طرح وہ تاؤ بٹ سے لے کر مظفر آباد تک وادی نیلم کو خشک اور بنجر بنانا چاہتا ہے رب کریم اس کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملائے یہ ہمارا ذلیل ترین پڑوسی اس طرح آبی دہشت گردی کر کے ہمارے لیے لاینحل مسائل پیدا کرنا چاہتا ہے اللہ رب العزت اس کے اپنے ملک میں چلنے والی درجنوں آزادی پسند تحریکوں کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے آمین، اس بار گفتگو میں مختصر سے دوستوں نے شرکت فرمائی ایک ماہ بوجوہ محفل سے غیر حاضری ہوئی جسے بعض دوستوں نے محسوس فرمایا میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب آپ کیسے ہیں اور پیارے رمضان المبارک کی فیوض و برکات سے مستفیض ہو رہے ہوں گے رب کریم آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے، آمین۔ پیارے ویر عمر فاروق ارشد صاحب بھی کبھی کبھار غوطہ لگا جاتے ہیں پیارے محفل میں باقاعدگی سے تشریف لاتے رہا کریں آپ تو محفل کی جان ہیں مایوس نہ کیا کریں باقی قارئین کے خطوط اور تبصرے خوب ہیں ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن میں انتخاب لاجواب ہے کہانیوں کا انتخاب تو ہوتا ہی بے مثال ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس پیارے جریدے کو کامیابی کی بلندیوں تک پہنچائے، آمین۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب اور محترم اقبال بھٹی صاحب کو اور تمام اسٹاف کو میری طرف سے عید مبارک قبول ہو اور السلام علیکم ہمارا پیارا رسالہ نئے افق

مل گیا اور اس میں اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی یعنی دو دو خوشیاں ملی ہیں ایک عید کی دوسری بھی عید ہی کی طرح وہ اس لیے کہ میری کہانی جو رسالے میں تھی جناب اقبال بھٹی صاحب کا بہت بہت شکریہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مندر کھے اور بہت خوشیاں دے آمین۔محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے دستک میں جو نقشہ احسن اقبال کا کھینچا ہے وہ بالکل درست ہے یعنی نیب سے حاضری سے محفوظ ہو گئے ہیں اس دفعہ گفتگو میں صرف چھ عدد ہی خط تھے کیا بات ہے کہ خط وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے یا ہمارے دوستوں کے پاس وقت نہیں میری گزارش ہے کہ سب دوست وقت نکال کے اپنے خط وقت پر ارسال کریں تا کہ ان کی معلومات سے ہم جیسے بھی فائدہ حاصل کر سکیں ایم حسن نظامی صاحب، محترم ریاض حسین قمر صاحب، جناب پرنس افضل شاہین صاحب، محترم جاوید احمد صدیقی، جناب ریاض بٹ صاحب میں آپ سب کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے گفتگو میں شرکت کی اور اپنی حاضری یقینی بنائی آپ سب نے میرے خط کی تعریف کی جس کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں امید ہے کہ آئندہ اور دوست بھی شرکت کریں گے۔ان شاء اللہ فرخ ندیم ملک صاحب کی کہانی روحوں کا شکاری بہت پسند آئی مشتاق احمد قریشی صاحب سے گزارش ہے کہ ایسی کہانیاں رسالے کی جان ہیں انہیں ضرور جگہ دیں شکریہ رسالے کی دوسری کہانی گورکھ دھندہ، محترم وسیم بن اشرف صاحب کی یہ کہانی بھی خوفناک نمبر کی کہانی تھی جو اس رسالے میں شائع ہوئی اچھی کہانی ہے اس طرح کی ایک کہانی ضرور رسالے میں شامل ہوتی رہے تو رسالے میں جان پڑ جائے گی۔محترم خلیل جبار صاحب بھی اچھی کہانیاں لکھنے میں بہت مہارت رکھتے ہیں ان کی کہانی اصول روپ اس بات کی گواہی ہے قسط وار کہانی ''وہ تین دن'' عمارہ خان کی پڑھتے ہوئے دل ہی نہ کرے چھوڑنے کا دل کرے پڑھتے جاؤ دیکھو ابھی تک تو ٹھیک ہی ہے مرشد بھی نئے نئے موڑ مڑتی ہوئی خوب تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے سلیم اختر کی ''جھوٹی پجارن، متبادل، سمجھوتہ، کانچ کی محبت، تربیت یافتہ، خواہش، تکبر، سعادت مندی، فن پارے میں عائشہ بٹ کی کہانی نے متاثر کیا رسالے میں زرین قمر کی کہانی بالا کوٹ ایک بہترین کہانی ہے خوب صورت لکھتی ہیں مبارک ہو، ذوق آ گہی اور خوش بوئے سخن نے بھی اپنے صفحوں کا حق ادا کیا ہے۔بہت خوب جناب۔

وقت دیتا نہیں اجازت آگے بڑھنے کا
اس بات پر کے پھر ملیں گے دی زندگی نے اجازت

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار جون کا نئے افق رمضان المبارک نمبر خوب صورت سرورق سے سجا پچیس تاریخ کو ملا اور اٹھائیس تاریخ کو تبصرہ ارسال کر رہا ہوں نئے افق واقعی اس بار دلکش سرورق سے سجا تھا۔سرورق پر یہ قطعہ ہونٹوں پر مچلنے لگا۔

تم وہ پہلی لڑکی ہو جس کو دیکھ کے
دھوپ کا ہر اک ٹکڑا بادل ہوسکتا ہے
جس کو دیکھ کے چاند کسی شب
پورا پاگل ہوسکتا ہے

دستک میں انکل جی احسن اقبال پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتا رہے تھے یہ حملہ چاہے ڈرامہ ہو چاہے حقیقت ہوا ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا ہر سیاسی جماعت کو حق ہے وہ عوامی رابطہ مہم چلائے وہ الگ بات ہے کہ اس بار نون لیگ کو الیکشن میں دن کو بھی تارے نظر آ جائیں گے۔ کیونکہ اس بار پینتیس پنکچروں والا کام بھی نہیں ہوگا۔ ان سطور کی اشاعت تک نگراں حکومت قائم ہو چکی ہوگی اللہ کرے وہ بغیر دھاندلی کے الیکشن کرا دیں اور آنے والی حکومت عوام کے لیے رول ماڈل ہو اور عوامی خدمت کے ریکارڈ قائم کرے، آمین یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ جولائی کا شمارہ ابن صفی نمبر ہوگا ابن صفی کے بعد جاسوسی کہانیاں لکھنے کا آغاز کرنے والے مظہر کلیم ایم اے بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ابھی پرسوں ہی ان کی نماز جنازہ ملتان میں ادا ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ابن صفی اور مظہر کلیم اور ایم اے راحت کو جنت میں جگہ دے آمین۔ گفتگو میں آپ نے درست کہا کہ تاجر حضرات کرسمس اور بلیک فرائڈے پر اشیا پر پچاس فیصد کی رعایت دیتے ہیں مگر مسلمانوں کے ماہ مقدس رمضان میں پچاس فیصد اضافہ کر کے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں انہیں خدا کا کوئی خوف نہیں ہوتا یہ لوگ روز محشر اپنے نبی پاک ﷺ کے سامنے اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھائیں گے محمد رفاقت صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے رفاقت بھائی میں وہی پرنس افضل شاہین ہوں جو پہلے جنگ میں بھی لکھتا تھا آپ نے درست پہچانا ہے آج کل تو جنگ سنڈے میگزین، ایکسپریس، اخبار جہاں، روزنامہ دنیا میں لکھ رہا ہوں ایم حسن نظامی، ریاض حسین قمر، جاوید احمد صدیقی میری تحریریں پسند فرمانے کا بے حد شکریہ۔ ریاض بٹ صاحب آپ نے مجھے شعروں کا شاہین کہا یہ آپ کا حسن نظر ہے اس بار بھی خطوط کی تعداد بہت ہی کم تھی یعنی صرف چھ خطوط اتنے خطوط تو میرے ضلع بہاولنگر کے لکھاری لکھتے تھے یعنی فورٹ عباس، منچن آباد، بہاولنگر اس بار چلبلی اقرا جٹ کا خط بھی نہیں تھا جو کہ منچن آباد کی پہچان ہیں خطوط نگاروں سے اپیل ہے نئے افق میں حاضری لگوائیں ذوق آگہی میں عبدالجبار رومی، ریاض بٹ، اقرا افضل، غلام فاطمہ، کامران شاہد، خوش بوئے سخن میں فوزیہ شیخ، طاہرہ غفور، ایم حسن نظامی، نائلہ جبین، ریاض حسین قمر، اقرا جٹ چھائے رہے دعا ہے نئے افق اور ترقی کرے آمین۔

عبدالجبار رومی انصاری...... بوریوالا۔

جھکی جھکی پلکیں احساس پاکیزہ ہے
شرم و حیا کی پیکر دوشیزہ ہے
کیسی مہرومہ سی لگتی ہے
جھلکتا ہر ادا سے احترام کا فریضہ ہے

اس دفعہ نئے افق کا سرورق بہت پسند آیا اور دستک کی سچائی کے تو ہم دل سے قائل ہیں باقی بنگلہ دیش تو جغرافیائی طور پر بھی الگ تھا سو انڈیا کو کھل کے وار کرنے کا موقع مل گیا تھا اور پاکستان کی طرف تو وہ میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات ہی نہیں کر سکتا ہاں سازشیں کرنا اس کا کام ہے جو وہ شروع دن سے ہی کر رہا ہے اقبال بھٹی صاحب کی مختصر ا گفتگو اچھی لگتی ہے جو چھوٹے سے پیرائے میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں

اور جو حال دو غلے تاجروں کا بتایا اللہ کی پناہ بس رمضان ہی انہیں پورے سال کی کمائی میں نظر آتا ہے یہ نہیں کر سکتے کہ اس مہینے میں وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیں پتا نہیں یہ دنیا خرید کر آخرت میں کیا کریں گے اور ابن صفی نمبر کا تو خاص کر انتظار ہے چلو ایک مہینہ ہی رہ گیا ہے باقی تمام قارئین کو عید الفطر بہت بہت مبارک ہو ستاروں کی کہکشاں میں محمد رفاقت کا تبصرہ بھی زبردست رہا جو پرانی یادیں تازہ کرتے احسن طریقے سے انٹری دے رہے تھے بہت اچھے لگے۔ مسرتیں بانٹتے ایم حسن نظامی بھی بہترین رہے عمدہ رہی آپ کی غزل اور مراسلہ بھی بہت اچھا ہوتا ہے انکل ریاض حسین قمر کا تبصرہ بھی بے مثال تھا بہت اچھا لگا اور سچے دل سے آبیاری کیجیے ہر ماہ کی طرح غزل بھی بے حد عمدہ تھی جھانکتے خلوص کے ساتھ پرنس افضل شاہین بھی قطعے کے ساتھ بہترین موازنہ کر رہے تھے بہت عمدہ جاوید احمد صدیقی کا پر اثر تبصرہ بھی لائق تحسین رہا سچی باتیں اچھی لگتی ہیں اور قوم کو دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنے ووٹ سے بھی اپنی تقدیر بدل لینی چاہیے لیجیے بھائی ریاض بٹ نے تو ان کے حسن کا نظارہ کرنے سے انہیں خفا رکھا ہوا ہے کہیں ایسا نہ ہو ان کا نظارہ کرتے کرتے انہیں کھو ہی دیں بہرحال اپنی تحریروں کی طرح لاجواب تبصرہ بے حد پسند آیا پچھلی دفعہ اقراجٹ کی مچن آباد سے انٹری خوب رہی تھی اس دفعہ تو نظر نہیں آتیں کہیں مچن آباد کا تعارف تو نہیں کرانا تھا لیکن ہم تو مچن آباد کو اچھی طرح جانتے ہیں بہرحال غیر حاضر دوست جلدی حاضری دیں۔ بالا کوٹ 2005ء کا حادثہ جان لیوا تھا جہاں زلزلہ زدگان کی مدد کرنے والے تھے وہیں طارق سلمان جیسے بھی تھے جو رقم کی خاطر دشمن بن گئے اور ننھی نادیہ کو بھی اغوا کر لیا اور ایسے میں جاوید کو بھی پھر سے لوگوں کی مدد کرنے کا موقع مل گیا زرین قمر کی کہانی اچھی رہی سعادت مندی کا منا بھی قائم رہا اور نعیم بھی اپنی اور گھر والوں کی نظروں قابل فخر فرزند ثابت ہوا مختصر کہانی اچھی لگی بلو وہیل نے بھی انٹرنیٹ پر تہلکہ مچا دیا اور معصوم طالب علم جنھوں نے بھی اسے ڈاؤن لوڈ کیا اور تکلیفوں میں گھرتے گئے تو نوبت خودکشی تک پہنچ گئی اور دنیا میں اس گیم سے اموات بھی واقع ہوئیں اور میڈیا میں آنے اور عوام کی آگاہی حاصل کرنے سے اس سے کچھ نہ کچھ چھٹکارا ملا اب پھر بتا رہے ہیں کہ اس سے بھی خطرناک ایک گیم آ گئی ہے جس کے کھیلنے والے اپنے ہی لگائے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کرتے دکھائی دیتے ہیں بہرحال ایسی سب گیموں سے بچنا چاہیے روحوں کا شکاری، روحیں بھی کنٹریکٹ پر لیتا تھا اور پھر کرتب باز جونی نے عفریت کا روپ دھانے کے بعد اپنی محبت روکسین کو بچانے کے لیے بلیک ہارٹ کا خاتمہ کر دیا اور بوڑھے شیطان ایگار سے بھی نجات پائی عمدہ کہانی میری جاب اور روزی روٹی کا مسئلہ ہے وقاص چاہے بچوں کے ساتھ مکان کی بھینٹ چڑھ جائے دوسری طرف رانی سادھو کے ہاتھوں کھیل رہی تاکہ بچے لے سکے اور کالی بلی اف دہشت سے بھرپور کہانی ''وہ تیس دن'' کی پہلی قسط نے ہی سماں باندھ دیا زبردست کہانی آخر عمارہ خان نے انتظار ختم کرا ہی دیا کانچ کی محبت، شہاب جولی سے پیار تو کرتا تھا مگر اس کی کوکھ میں اپنے ہی بچے کا سن کر بد دل ہو گیا اس محبت کو کانچ کی طرح ریزہ ریزہ کر دیا اس سے اچھی تو اس کی ماں تھی جس نے جولی کو بیٹی بنا لیا تھا سکون کی تلاش میں نشے کا سہارا لینے والوں کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے جائز و ناجائز خواہشات پوری ہوں تو آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ ہی جاتی ہے پھر آنکھیں بند کیے

اصل مال پر ہی ہاتھ صاف ہوتا ہے جیسے سونیا اور فرہاد مرغ مسلم پر ہاتھ صاف کرتے نظر آئے اصل روپ کو دیکھتے ہی اسماعیل اور عمر دراز شرم سار ہوگئے یاسمین اسماعیل کی تو بیوی تھی لیکن عمر دراز سے جسمانی تعلق قائم کیا اور دھوکے بازی سے دونوں کو بے وقوف بنایا پراسرار یاسمین آسیبی خاندان سے نکلی اصل روپ کچھ ڈراؤنی اور دلچسپ رہی بوڑھی امرتا نے اپنے چاہنے والے دلیپ ورما کے لیے کچھ نہیں کیا مگر اس کی بیٹی کملا نے خود کو شادی کے لیے پیش کر کے بہترین متبادل ثابت ہوئی عمدہ کہانی مرشد میں چوہدری اکبر نے حسن آرا اور زینت کو بے بس کر کے پیٹرول میں نہلا دیا اور دوسری طرف مرشد بھی دشمنوں کے ہتھے چڑھ کر بے بس ہو چکا ہے دیکھو مرشد کی خاموشی اب کون سا طوفان اٹھائے گی اور اٹھائے تو زبردست ایکشن ہوگا، بے شک رزق کسی کے پاس چل کر نہیں آتا اس کے لیے جستجو کرنا پڑتی ہے رازق بہترین کہانی تھی طوطا چشم میں طوطے نے تو اپنی وفاداری ثابت کر دی لیکن پتھر کی بنی کوثر کو اپنی گھرداری کا احساس نہ ہوا کہانی اچھی لگی شاہ جی کی کہانی افسردہ کر گئی چار بیٹے اور وہ بھی ان کی خدمت نہ کر سکے آخر ایک بیٹے کو رحم آیا اور شاہ جی پرسکون نیند سوئے آخری امید ٹھیک رہی ذوق آگاہی سے اقرا افضل، غلام فاطمہ اور اشفاق حسن کے مراسلے اچھے رہے جبکہ غزل سے شہزاد نیر، انجیل صحیفہ اور نائلہ جبین کا منتخب کلام اچھا لگا۔ والسلام

اقرأ

طاہر قریشی

الخالق

(پیدا کرنے والا)

الخلاق: مبالغے کا صیغہ ہے۔ پیدا کرنے والا' اصل بنانے والا' ایک مخلوق کے بعد دوسری کو پیدا کرنے والا' اس کائنات میں موجود ہر مرئی اور غیر مرئی چیزوں کو پیدا کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے' اس کے لئے خلق کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی آفرینش' پیدائش' خلق لفظ خالق کا مادہ ہے۔ (خ ل ق) اس کے معنی کسی چیز کو بنانے' اس کا اندازہ لگانے توازن و تناسب قائم کرنا' ایک چیز کو دوسری سے بنانا' کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا' پہلی بار پیدا کرنا' اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم ہستی ہی ہر چیز کو پیدا کرتی ہے۔ عدم سے وجود بخشتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی خلاقِ اکبر ہے' اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کائنات کو وجود بخشا' وہی قادرِ مطلق خلاقِ عظیم ہے۔

ترجمہ:۔ یقیناً تیرا پروردگار ہی پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ (الحجر۔۸۶)

ترجمہ:۔ وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ (المومنون۔۱۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہی ہستی ہے جو کائنات کی تخلیق کا خلاقِ اعظم ہے اور احسن الخالقین ہے جس نے ہر شے کو بہترین تناسب اور احسن انداز سے پیدا کیا ہے۔ وہی ذاتِ عالی کامل قدرت و حکمت والی ہے وہ اختیار و ارادے والا خالق ہے۔

ترجمہ:۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ (یٰسین۔۸۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات قادرِ مطلق ہے اس نے اس کائنات کو پیدا فرمایا یہ زمین و سورج اس عظیم کائنات کی کہکشاؤں میں سورج ایک چھوٹا سا تابع سیارہ ہے۔ ہمارا یہ سورج جس کہکشاں کے تابع ہے اس کے اندر یہ ایک کروڑ ستاروں میں سے ایک ہے' جس سے ہمارے قریب کی یہ دنیا بنتی ہے۔ اس کائنات میں کئی اور کہکشائیں ہیں' ماہرین فلکیات اب تک ایک کروڑ کہکشاؤں کو دریافت کر سکے ہیں۔

ہماری کہکشاں سے قریب ترین دوسری کہکشاؤں کا فاصلہ سات لاکھ پچاس ہزار نوری سال کا ہے ایک نوری سال کا فاصلہ ۲۶ ملین میل ہوتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے مظاہر ہیں' کائنات کے تمام مجموعے فضاؤں میں تیر رہے ہیں ان فضاؤں میں اربوں اجرامِ فلکی چکر لگا رہے ہیں جن کی تعداد ابھی تک نامعلوم ہی ہے۔ اتنی عظیم کائنات کا خالق کیا کچھ تخلیق نہیں کر سکتا؟

ترجمہ:۔ آسمان اور زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے' لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔ (المومن۔۵۷)

انسان اگر اس عظیم کائنات پر غور و فکر کرے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے بستے ہیں سورج کے تابع ستاروں میں سے ایک چھوٹا سا ستارہ ہے۔ زمین سورج سے دس لاکھ گنا چھوٹی ہے اور یہ سورج جو ہمیں حرارت پہنچا رہا ہے اس قسم کے سو ملین (دس کروڑ) سورجوں میں سے ایک ہے جو فضاء ہمیں معلوم ہے وہ اس کائناتی فضاء کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ یہ زمین و آسمان انسان کے سامنے بچھے ہوئے ہیں۔ انسان کی طاقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات رکھی ہے کہ وہ ان کے حوالے سے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے' جب انسان اس کائناتی نظام پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے اور اللہ کی حقانیت' قدرتِ کاملہ کے آگے جھک جاتا ہے' اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ کائنات کی اور اس عظیم کائنات کے خالق کی عظمت و حکمت کو سمجھ سکتا ہے۔ ربّ کائنات یہی بات اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرما رہا ہے کہ اس عظیم کائنات کی تخلیق کرنا بڑا کام ہے یا انسان کو پیدا کرنا اس کو تخلیق کرنا بڑا کام ہے۔ اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی بات نہ بڑی ہے نہ چھوٹی' نہ مشکل ہے' نہ آسان وہ تو اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر چیز کو ایک کلمہ سے تخلیق کر سکتا ہے۔ اس عظیم کائنات کی تخلیق کے سامنے انسان کی تخلیق کوئی مشکل کام نہیں ہے' اللہ ہر چیز پہ پوری طرح قادر ہے وہ جب چاہے' جیسے چاہے' جو چاہے پیدا کر سکتا ہے' انسان اپنی کم علمی اور تکبر کی وجہ سے اس کی اطاعت سے کفر کرتا ہے۔

دی لیجنڈ آف واریئر

شبیہہ مظہر رانجھا

شبیہہ مظہر رانجھا خواتین ناول نگاروں میں ایک معتبر نام ہے' آپ نے ان کے افسانے اور ناول پڑھیں ہوں گے' ان کے لکھنے کا اپنا ایک انداز ہے وہ پڑھنے والے کو اپنی تحریر سے ہپناٹائز کرنے کے فن سے واقف ہیں' نئے افق کے قارئین پہلے بھی ان کے مختلف افسانے و ناول پڑھ چکے ہیں اور اس ناول سے قارئین کو ایک بار پھر متاثر کرنے حاضر ہے۔



کچی کیری کی طرح وہ میرے دل کی زمین پہ آ گری تھی۔ اس کی کھٹی میٹھی خوشبو محسوس کر کے میں پاگل سا ہونے لگتا اور پھر تنہائیوں میں بھی اسے تلاش کرنے لگتا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ عجیب کیفیت تھی، پہلے تو اچھا بھلا تھا، مجھے خود میری سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ بہت خوبصورت تو نہ تھی بس یونہی ڈھلتی شام کے سائے اس کی آنکھوں میں لہراتے نظر آتے اور میں پہروں بے چین پھرا کرتا۔ رنگ کھلتا سا سانولا، یوں جیسے تھوڑے سے دودھ میں زیادہ سا شہد ملا دو تو مانو وہ بن جائے۔

......☆☆......

ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے ساتویں جماعت میں ایک طرف لڑکوں کی لائن اور ساتھ ہی الگ رو میں لڑکیوں کی قطار بیٹھتی تھی، ہم لڑکے تھے تو شرارتی لیکن باجیوں کی موجودگی میں تمیز سے رہتے، کیونکہ میڈم بھی ہر وقت یہ ہی کہتی رہتیں کہ لڑکو شرم کرو تم سے تو اچھی لڑکیاں ہیں جو شرارتیں بھی نہیں کرتیں اور نمبر بھی اچھے لیتی ہیں۔ بس ان کی نظروں میں اچھا بننے کے لئے سارے بوائز کوشش میں لگے رہتے اور میں بھی اس کلاس میں پیار کا سبق چپکے چپکے پڑھ گیا تھا، مانو جیسے کوری اور صاف ستھری سلیٹ پر پہلی بار لکھا گیا ہو، فرزانہ، وہ اپنے نام جیسی ہی تھی میں بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا آگے پیچھے بچھتا جاتا، میرے جیسے ننھے دوست میرا مذاق اڑاتے لیکن میں باجی فرزانہ، کے کام ایک دیوانگی کے عالم میں کرتا چلا جاتا۔ ہاں کلاس میں کسی لڑکی کا سنگل نام پکارنے کی اجازت نہ تھی اور میں کیا جانوں کہ سماج اور پابندی کیا بلا ہے نہ ہی پیار کے مطلب کا پتہ تھا۔ اس عمر میں اکثر ایسا پیار ہوتا ہے کہ کسی ٹیچر کو پسند کرنا اور اس کے دلہن کے روپ والے خواب آنے شروع ہو گئے، پھر شادی کا پلان سوچ لینا یا پھر ساتھ پڑھنے والی کسی لڑکی کو دل میں ہی دل میں چاہتے چلے جانا اور ساتھ باجی بھی کہنا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ بھول بھال جانا لیکن میرے ساتھ لگتا تھا کہ معاملہ سیریس ہے، مجھے فرزانہ کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہ تھا، جی کرتا کہ وہ چوبیس گھنٹے نظروں کے سامنے رہے لیکن ظاہر ہے جب اسکول سے چھٹی ہوتی تب گھر تو آنا پڑتا اور میں گھر آتے ہی اسکول جانے کا انتظار شروع کر دیتا۔ دن ایسے ہی گزرتے رہے اور اس کی محبت میرے دل میں راسخ ہوتی گئی۔ اب بھی اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی یا ہم دونوں نے ضرورت نہیں سمجھی اس کی۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مجھے اس نے پاس بلا کے گال تھپتھپایا تو میں مرنے والا ہو گیا شاید کہ دل بند ہی ہو جاتا لیکن اس کی آواز نے آبِ حیات کا کام کیا۔

علی حسن میرے بھائی مجھے بازار سے نوٹ بک تو لا دو۔

پیسے میرے ہاتھ میں تھما کر وہ میرا جواب سنے بغیر واپس کلاس میں چلی گئی اور میں دو منٹ پچاس سیکنڈ کے لئے پتھر کا ہو گیا، میرے بولنے کا وہ انتظار کرتی بھی تو میں نے کیا کہہ لینا تھا، بہت مشکل سے خود پر قابو پایا اتنے میں دل جھومنے لگا انگ انگ خوشی سے بھر گیا یہ خوشی کیا کم تھی کہ آج اس نے مجھ سے بات کی ہے بلکہ بات کرنے کے علاوہ کام بھی کہہ ڈالا کام کا خیال آتے ہی میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور بھاگ کر اسکول کے سامنے والے اکلوتے بک ڈپو سے نوٹ بک لے آیا، جب اس کے پاس پہنچا تو وہ سر جھکائے بیگ میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی میں نے نوٹ بک اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تو وہ آنکھوں میں حیرت سجا کے مجھے دیکھنے لگی۔

ارے واہ اتنی جلدی لے آئے؟ تم تو بہت اچھے ہو۔

کلاس کے ہر لڑکے کو تمھاری طرح ہونا چاہیے۔ لیکن تم ان سب سے اچھے ہو، آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ایک خاص رنگ گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، کوئی وقت تھا کہ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں تو مر ہی جاتا، اتنے میں اس کی آواز گونجی ایسا کرو جو پیسے بقایا بچے ہیں وہ تم رکھ لو آج وہ جس قدر مہربان تھی جی کر رہا تھا کہ میں اظہار محبت کر دوں لیکن پھر سوچ آئی کہ یہ جو آج تعریفیں کر رہی ہے کل کو جوتے برسائے گی اور حسن میاں بات کرنے اور دیکھنے سے بھی جاؤ گے۔ یہ سوچ کے میں چپ چاپ گھر آ گیا، کھانا بھی نہیں کھایا گیا کیونکہ آج کی خوشی حد سے سوا تھی۔ مجھ پر نعمتوں کی برسات کر دی گئی تھی اتنی خوشیاں سہار نہ سکا اور بیمار پڑ گیا۔ اسکول سے واپس آ کے شدید بخار نے آ لیا اور میں چار پائی پہ آ گیا۔ امی پریشان ہو گئیں زبردستی دوا کھلائی اور مجھے لٹا

دیا، ساتھ ہی مجھے غنودگی آنے لگی۔ مجھے نیند کے ہلکورے آنے لگے بہت خوبصورت پھولوں کے کنج میں میں کھیل رہا تھا، ہلکے ہلکے بادل بنے ہوئے تھے۔ گول پتھروں کو پینٹ کر کے خوب صورت سی پہاڑیاں بنی تھیں ان میں سے آبشار گر رہی تھی سرسبز میدان تھا اور اس میں سفید سنگی بینچ دھرے تھے ایک طرف جھولے لگے ہوئے تھے اور میں ان ہی جھولوں پہ جھول رہا تھا کبھی ایک جھولے پہ کبھی دوسرے جھولے پہ جاتا، ایک پینگ پہ میں نے اونچی اُڑان بھری مانو آسمان کو چھونے لگا۔ اگلی اُڑان اس سے بھی اونچی اور پھر اس سے بھی اونچی، شائد مجھے ستاروں پہ کمنڈ ڈالنا تھی اور اونچا جانے کے لئے جب میں نے حتمی اڑان بھری تو اسی اثنا میں آسمان پہ چھائے کالے سیاہ بادلوں میں سے ایک بہت بڑا اور بالوں بھرا ہاتھ نمودار ہوا جس کے اوپر موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی تھیں ساتھ ہی اس عفریت نے مجھے دبوچ لیا اور آن کی آن میں مجھے اچک کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ میرا دل گویا سمندر جیسی گہرائی میں ڈوب گیا اور گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو میرا سر امی جی کی گود میں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کتنا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، اس کے ساتھ ہی مجھے پھر جھرجھری سی آئی اور میں اور زیادہ امی کی گود میں سمٹ گیا۔

......☆☆......

مجھے اکثر ایسے ہی خواب آتے جن کا آغاز تو بہت حسین ہوتا لیکن انجام ایسا کہ دل دہل جائے۔ نادان عمر تھی اس وجہ سے میں نے کبھی اس طرح کے خوابوں کو ایک آدھ دن سے زیادہ یاد نہیں رکھا۔ حالانکہ ہمارے بزرگوں سے میں نے سنا تھا کہ ایک طرح کے خواب مسلسل آئیں تو وہ صرف خواب نہیں ہوتے بلکہ پیغام ہوتا ہے لیکن میری صرف اتنی تمنا تھی کہ کاش میرے خواب کے حسین حصے میں وہ بھی تو ہو، ہم دونوں ان وادیوں میں گھوما کریں، لیکن خواہش تو خواہش ہے اور خواب بھی خواب ہی ہوتے ہیں۔ کچھ دن بعد پھر ایسا ہی خواب آیا، میں اب باقاعدہ ڈرنے لگا کہ کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ شاید آنے والے وقت میں کچھ ہونے والا ہے مجھے نانی جان کے یاد کرائے ہوئے ورد وظیفے یاد تھے میں نے کسی سے بات شیئر کرنے کی بجائے انہی قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا، جس سے مجھے کچھ سکون آنے لگا، نانی اماں اللہ والی تھیں اور مجھے تو ان سے لگاؤ تھا ہی لیکن ان کو بھی مجھ سے حد سے زیادہ پیار تھا، اللہ پاک کی ان پر نظر کرم تھی جواب مجھ پر بھی عطا تھی سو مجھے ان مشکل حالات میں کسی دوسرے تیسرے سے مدد نہیں لینی پڑی اور میں نے یہ خوابیدہ سلسلے اپنی باطنی طاقت سے روک سے دیئے، لیکن ایک نقصان ہو گیا وہ یہ کہ فرزانہ کے لئے میری اندر ہی اندر پلنے والی چاہت کی خبر میرے دوستوں کو ہو گئی، ابھی میں نے اظہار وفا بھی نہ کیا تھا کہ چرچا ہو گیا۔ خیر سارے یار دوست خوش تھے کہ میں بھی انہی کے میدان کا کھلاڑی بننے چلا ہوں۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ لڑکیوں کی باتیں کر کر کے ان لوگوں نے ہی میرے دل میں خواہش پیدا کی تھی کہ میں بھی کسی کو چاہوں اور کوئی مجھے۔ لیکن میرے دل میں ایک اور خواہش بھی تھی کہ میں صرف دوستی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کے ساتھ عمر بھر رہنا چاہتا تھا۔ شائد اسی سچائی کی خبر انکو ہو گئی اور لگے مجھے چھیڑنے، میں شرمایا بھی کروں اور مجھے اچھا بھی لگا کرے، کبھی کبھی ڈینگیں بھی مارتا تھا کیونکہ اس عمر میں محبت کم اور ڈینگیں زیادہ ماری جاتی ہیں، اس چنڈال چوکڑی میں بیٹھ کر ہمایوں سعید اور شاہ رخ خان کے ڈائیلاگز سے متاثر ہو کر میں بھی کبھی کبھار جھوٹ موٹ کوئی وارداتِ دل سنا دیا کرتا اور من پر چا لیتا اس سارے ڈرامے میں ہوا یہ کہ میں جو بہت اچھا سٹوڈنٹ نہیں تو برا بھی نہ تھا، میرے اچھے گریڈز ڈاؤن ہو گئے اور میں فرسٹ سمسٹر میں فیل ہو گیا، گھر والے شاکڈ ہو گئے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ میری بھی جو محبت کی فینٹسی چل رہی تھی دھڑام سے گر پڑی، ٹیچرز بھی پریشان تھیں کہ علی حسن کو کیا ہوا ہے جو اس کے گریڈ کم ہو گئے، لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا دوست بھی کہنے لگے یار ہم تو کمرۂ امتحان میں تمہارے آسرے پر ہی جاتے تھے، لیکن تم نے تو ہمیں مایوس کر ڈالا۔ کہیں اس کے پیچھے باجی فرزانہ، کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ حماد نے مذاقاً پوچھا تو میں نظریں چرا گیا۔ کلاس میں بھی میری روٹین عجیب ہو گئی، میرا اسے چوری چوری دیکھنا، ساری کلاس کی لڑکیاں چھوڑ کے صرف اسی کی بات پر دھیان کرنا، بھاگ بھاگ کر کام کرنا، اب تو پوری کلاس نے نوٹ کر لیا تھا، شائد اسے بھی خبر ہو لیکن پتہ نہیں چلتا تھا۔ نہ کبھی میں نے اظہار وفا کیا اور

نہ کبھی وہ مجھے اپنی منتظر نظر آئی تھی۔ایک دن میں کلاس میں بیٹھا اس جانِ محبوبی کے خیالوں میں گم تھا کہ احمد نے آ کے کہا۔

حسن تمہیں میڈم رفعت کمرہ میں بلا رہی ہیں، میں نے حیرانی سے پوچھا۔

مجھے کیوں بلا رہی ہیں؟ وہ کندھے اچکا کر چلا گیا میں میڈم رفعت کی عزت ماں کی طرح کرتا ہوں اس لئے ان کے بلانے کو اگنور نہ کر سکا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں کمرہ کی طرف بڑھ گیا۔

......☆☆......

علی حسن بیٹا آج کل آپ پریشان ہیں؟

نہیں میڈم بس ایسے ہی نہیں کوئی وجہ تو ہے جو آپ کا رویہ بدلا ہوا ہے۔

میڈم نے اصرار کیا۔

نو میڈم آپ کا وہم ہے۔ میں نے کمزور آواز میں کہا۔تو کچھ دیر کے توقف کے بعد میڈم نے بات شروع کی۔

حسن بیٹا جانتے ہو آج میں نے آپ کو یہاں کیوں بلایا ہے۔ میں نے ان کے بدلے ہوئے لہجے پر غور کیا اور متوجہ ہو گیا۔ آج فرزانہ تمھاری کلاس فیلو نے مجھے تمھارے ساتھ بات کرنے پر مجبور کیا ہے۔میں چیئر سے دو فٹ اچھلا اور آنکھوں میں الجھن لیے خاموشی سے میڈم کی طرف دیکھنے لگا،دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح تیز تر۔

دیکھو علی حسن اسے پوری طرح پتہ ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور اسی پسند کے چکر میں فیل ہوئے ہو،لیکن جانتے ہو وہ تمہیں فیل یا ناکام انسان نہیں دیکھنا چاہتی۔وہ ایک کامیاب اور اچھے گریڈ والے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور اب اس نے پیغام دیا ہے کہ تم اس کے لیے بہترین گریڈ لے کر آؤ گے اور اگلے سمسٹر میں فرسٹ آ کر دکھاؤ گے تا کہ اسے تم پہ فخر ہو اور پھر وہ تم سے بات بھی کرے گی ، میں جو تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ میڈم کی بات سن رہا تھا ایک دم پرسکون ہو کر کرسی پر ڈھے سا گیا۔انہوں نے نے درمیان میں رکھی ٹیبل پر آگے کو جھک کر سوال کیا۔تم پسند کرتے ہو ناں اسے؟ میں ان کی بات پر اونچے کراؤن والی کرسی کی بغل میں منہ چھپانے لگا وہ میری حالت دیکھ کر مسکرا پڑیں،بیٹا میں جانتی ہوں اس لڑکی کے چکر میں تم اس بار فیل ہوئے ہو لیکن اب وہ ہی چاہتی ہے کہ تم پڑھ کر ایک کامیاب انسان بنو تو کیا تم اس کی خواہش پوری نہ کرو گے ؟ میڈم رفعت نے حتمی سوال کیا۔

جج جی جی میڈم۔

میں ہکلا کر اتنا ہی کہہ سکا اور پھر انھوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی

......☆☆......

محبت میں محبوب کو دیکھنا، چھونا، بات کرنا اور اس جیسی اور بہت سی چوریاں ہوتی ہیں جن میں سے میں نے ایک بھی نہیں کی تھی، نہ ہی ادراک تھا اور نہ ہی خواہش، میں اپنی پسند کی لڑکی سے دائمی ملن کی دعا تو کرتا تھا لیکن اس سے قربت کا خیال میرے لئے گناہِ عظیم تھا،اور اب تو میرا ٹریک ہی دوسرا تھا مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مجھے عام لڑکوں جیسا نہیں بلکہ بہت خاص اور کامیاب دیکھنا چاہتی تھی ۔اب ایک یہ ہی بات میرا مقصدِ حیات تھی میں نے سر کتابوں میں ڈالا اور تن دہی سے پڑھائی شروع کر دی۔

......☆☆......

جب ایک انسان اپنی مضبوط قوت ارادی سے ایک نیک مقصد میں لگ جائے تو دنیا کی تمام مثبت قوتیں اس کی مدد کرنے کے لئے سرگرم ہو جاتی ہیں یہ ہی میرا ماننا تھا اور اس پر مجھے تب یقین آیا جب میں نے آٹھویں جماعت کے رزلٹ میں فرسٹ،سیکنڈ اور تھرڈ آنے والے طالبعلموں کو پچھاڑتے ہوئے سیکنڈ سمسٹر میں فرسٹ پوزیشن لے کر ثابت کر دیا کہ محبت ہی کامیابی ہے۔سکول والے ،کلاس والے ،دوست ،کزن، بھائی حتیٰ کہ ماں باپ اور اساتذہ کو بھی خوشگوار حیرت تھی کہ میں نے یہ کیسے کر دیا۔ میں مبارکباد وصول کرتے کرتے اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب مجھے مبارکباد دے گی۔پھر اچانک خیال آیا یار ہر بار یا تو وہ پہلی پوزیشن پر ہوتی یا پھر نعمان ۔یہ دونوں ہی تو لائق فائق تھے۔میرے دوست بہت خوش تھے مگر اویس کو یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ یہ پہلی بار ایسا ہوا۔بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جو لڑکا پچھلے تقریباً پانچ سالوں کوئی پوزیشن نہیں لے سکا وہ اچانک فرسٹ کیسے

آ گیا۔

......☆☆......

میں روز مرہ کی طرح سکول جا رہا تھا جیسے ہی داخلی دروازے کے سامنے پہنچا میرے اسکول سے ایک سجی سجائی بس نکلی میں خوشگوار حیرت سے دیکھنے لگا عجیب بات تھی کہ اُس میں میری پوری کلاس سوار تھی لگتا ہے کسی کی شادی ہے اور پورا اسکول باراتی بنا ہوا ہے۔ پر مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں میں خود کلامی کر رہا تھا بس جیسے ہی میرے آگے سے گزری تو کھڑکی سے میرے دوست شور مچا کر مجھے بلانے لگے۔

علی علی جلدی آؤ دیکھو فری باجی کی شادی ہوگئی ہے۔ہم اِس کے سسرال جا رہے ہیں کھانا ملے گا آ جاؤ۔ میرے ہاتھوں سے بستہ گر گیا اور میں بس کے پیچھے بھاگنے لگا ۔تب میں دوڑ کر بس سے ذرا آگے نکل گیا ۔ ہمارے اسکول والی سڑک پر ہی تھوڑا آگے ایک اور اسکول ہے، بس تھوڑی دیر کے لیے وہاں رکی اتنے میں میں پھر بس سے آگے جا پہنچا۔تب میں نے دیکھا فرنٹ سیٹ پر فرزانہ دلہن بنی بیٹھی ہے اور ساتھ دولہا اویس بنا ہوتا ہے جو مجھے دیکھ کر طنزیہ ہنستا ہے اور بس آگے گزر جاتی ہے۔ میں چیخ کر کہتا ہوں فرزانہ یہ کیا کر رہی ہو تم ؟ اویس کے ساتھ دلہن بن کر کہاں جا رہی ہو تم ،دیکھو یہ اچھا لڑکا نہیں ہے تمھیں تو میں اچھا لگتا تھا ناں؟ فرزانہ۔فرزانہ ۔اے فری ۔ میں آوازیں دیتا رہ گیا اور وہ متکبر چہرے والے اویس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔میں جاتی ہوئی بس کے پیچھے کھڑا بڑبڑانے لگا۔ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تو پھر کیوں.....کیوں.....کیوں ں ں ں ں، ایک گرجدار کیوں کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں دل اس بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی نکل کے باہر گر پڑے گا اور دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا یہ محض خواب نہیں۔چھت پر نماز ادا کر کے جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ایک خیال من میں آیا علی تم نے کبھی یہ سوچا کہ اگر تم اُسے پا نہ سکے تو؟ میں اس خیال سے خوفزدہ ہو کر اپنے خیال کی نفی کرتا ہوا جاء نماز سے اٹھ کھڑا ہوا۔ڈرتا ڈرتا سکول پہنچا۔شدت سے فرزانہ کا انتظار کرنے لگا۔اُس محلے سے آنے والے بچوں سے پوچھا سب خیریت تھی۔میرا بیوقوف دل یہ سمجھ رہا تھا شاید کل

عید کارڈ تمہارا

ہر عید کے دن
میں سراپا محوِ انتظار رہی
کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا عید کارڈ تمہارا
میری اور بھی چلا آئے گا
تم محبت کے قلم کو خلوص کی سیاہی میں
ڈبو کر لکھ دو گے
جاناں عید مبارک
دُعاؤں میں لپٹی کوئی اچھی سی خواہش
خوب صورت سازِ دِل کے تاروں کو چھوتا شعر
کوئی ذو معنی سا فقرہ جو میری دھڑکنوں کو بڑھا دیتا
خوش فہمی کے ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھما دیتا
ادھ کھلی اپنی قسمت پہ نازاں گلاب کی کلی
میری پسند کو رکھتے دھیان میں
اور کارڈ کے اندر رکھ دیتے ڈھیر سارے موتیے کے پھول
میری اور آنے تک تری محبت میں لپٹے
پھول اگر اپنی تازگی کھو بھی دیتے تب بھی
خشک پھولوں کی باس مجھے ایک عرصے تک
مہکائے رکھتی
ترے لمس کی خوشبو کا احساس جگائے رکھتی
کچھ لمحوں کو فراموش کر بیٹھی میں حقیقت کو
بھلا تم کیوں مجھے عید کارڈ لکھنے لگے
ترا مجھ سے واسطہ ہی کیا
یک طرفہ رابطہ ہی کیا
جو میرے نہ کرنے سے یوں ٹوٹ گیا
جیسے پلکوں کی چلمن اُٹھاتے ہی
ٹوٹ جاتا ہے
خواب

(خالدہ علی......پوران)

رات اُس کی شادی ہو چکی ہوگی مگر ایسا کیسے ہو سکتا ابھی اُس کی عمر ہی کیا اور کچھ ہی دیر میں وہ سامنے سکول بیگ اُٹھائے آرہی تھی۔ اب دل کو حوصلہ ہوا۔ یہ خواب کیا تھا کیا یہ محض خوف ہے میرا؟ یہ میں نہیں جان پایا۔ پھر کافی عرصے بعد مجھے کہیں تعبیر پڑھنے کا اتفاق ہوا کہ اگر خواب میں شادی آپ کی ہو تو رخصتی کا مطلب آپ کو کوئی خوشی ،کامیابی ملے گی اگر رخصتی محبوب کی ہو تو موت یا رنج پائے۔ یوں مجھ کو بعد میں یہ سمجھ آیا کہ میرے حصے کی خوشی کسی اور کو مل گئی شاید۔

......☆☆......

اسکول سے آنے کے بعد تھکن سے برا حال تھا میڈم رفعت کی باتوں نے چکرایا ہوا تھا، شاید پرائیویٹ ادارے ایسے ٹیچرز کی وجہ سے ہی کہانیوں میں رہتے ہیں، بہر حال جو مجھ پہ ہو گزرا ہے میں یہاں صرف اپنے موضوع کے متعلق ہی بات کروں گا، میڈم رفعت نے مجھے کہا کہ تم نے فرزانہ سے اظہار محبت کر دیا ہے؟ میں نے چونک کر انکی طرف دیکھا، تو گویا میرے اندر کی ہلچل کا میڈم کو بھی اوراک تھا شرمندگی سے میں بس خاموش ہی رہا۔

دیکھو علی، وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے، تم اسے بتاؤ اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری طرح رہ جائے ہاں میں نے بھی پسند کسی اور کو کیا اور شادی کہیں اور ہو گئی، خیر چھوڑو، وہ بھی تمہیں چاہتی ہے اور ہم سب کی خواہش بھی ہے کہ تم ایک لائق فائق طالب علم بنو، اسے تم پسند ہو۔ فرزانہ ایک لڑکی ہے اور لڑکی کبھی زندگی میں دوسری بار پیار نہیں کرتی۔

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوئیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگیں میڈم رفعت کی باتوں سے مجھے مہمیز ملی جوشیلے انداز سے میں نے کہا۔

میڈم جی میں لازمی اُس سے شادی کروں گا اور اپنے امی ابو کو بتاؤں گا۔

امی ابو کی بات پر میڈم تھوڑا گھبرائیں مگر جلد ہی خود کو قابو پا کے بولیں۔

شاباش مجھ یقین ہے تم پیپرز کی طرح یہاں بھی سب کو حیران کر دو گے۔

کافی وقت سرک گیا میں پڑھائی میں جتا ہوا تھا کہ یہ اس کی خواہش تھی ایک دن بہت عجیب ہوا یہ سردیوں کا موسم تھا جب سب کلاسیں صحن میں دھوپ کے لئے بیٹھی تھی ،کلاس روم خالی پڑے تھے صرف بیگز اور چیئرز ہی پڑے تھے۔ میڈم نے کسی کام سے فرزانہ کو اندر بھیجا اور اُس کے فوراً بعد مجھے کمرے میں بھیجا مجھے ڈسٹر لینے بھیجا تھا اور اسے شاید کوئی کتاب، ہم دونوں مطلوبہ چیزیں لئے باہر صحن میں آ گئے۔ میڈم نے بریک ٹائم پوچھا کہ تم نے فرزانہ سے کوئی بات کی، میں نے کہا! نہیں میڈم بولی تم کو محبت کا اظہار کر دینا چاہیے تھا، میں نے کہا! کیا مطلب کیا وہ نہیں جانتی کہ مجھے اُس سے پیار ہے تب میڈم نے شرمندہ ہو کر کہا۔

علی میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ تم سے پیار کرتی ہے۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ تم ایک لائق فائق لڑکے بن جاؤ کیونکہ تم میں پڑھنے کی صلاحیت موجود ہے اس لئے میں نے کہانی گھڑی۔ میں شرمندہ ہوں اِس بات کے لیے مگر اب بھی بات تو بن سکتی ہے۔ تم کوشش کرو اظہار کی مجھے یقین ہے وہ ضرور مان جائے گی۔

مجھے اِس بات پر بہت غصہ آیا وہ جو اچھے ٹیچر کا خاکہ تھا میرے ذہن سے اترنے لگا میں خاموش رہا اور لٹا پٹا سا گھر آ گیا۔ خواب اچانک چکنا چور ہو گئے تھے ہم اب بھی ایک دوسرے سے اجنبی ہی تھے۔ 8th کلاس میں شاعری کا شوق تھا مگر کبھی کوشش نہیں کی۔ اُس دن ایک شعر بے اختیار تخلیق ہوا اور زبان پہ بھی آ گیا۔

جب دل پے چوٹ لگتی ہے تو منہ سے نکلے ہائے
بے درد زمانہ کیا جانے کوئی آئے تو کوئی جائے

میں بہت اداس تھا گھر آیا، کھانا تو کیا کھانا تھا، بس چپ چاپ آ کے کمرے میں لیٹ گیا، میڈم کی باتیں یاد آتیں اور میں کروٹیں بدلتا، لائٹ آف کر کے لیٹا سونا تو کیا تھا بس کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا تھا۔ بہن بھائیوں سے الگ دوستوں سے چھپ کے میں گزرے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ جس میں میری نانی اماں تھیں۔ وہ ایک روحانی شخصیت تھیں، ان کا فیض بھی چلتا تھا لیکن بچپن عمر میں تو بس ان کے پیار اور شفقت کی یادیں ہی تھیں جنھیں ہر مشکل وقت میں میں مس کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کھیلنا ان سے پیسے لینا ان کے بستر میں چھپ کے چیزیں کھانا۔ سب یاد

آتا رہا اور نہ جانے کب میں سو گیا،

......☆☆☆......

اس دن کی گفتگو کے بعد میڈم مجھ سے کم ہی بات کرتیں اور میں فرزانہ کو گھورتا رہتا۔ ایک دن ہم لڑکے بریک کے دوران کلاس سے ڈیسک اٹھا لائے اور سکول کے صحن میں رکھ کر بیٹھے رہے بریک بند ہونے پر پرنسپل صاحب نے ہماری کلاس میں آکر پوچھا کہ باہر ڈیسک کس نے رکھا ہے۔ مجھے یاد آیا میں ہی اختر کے کہنے پر ڈیسک باہر لایا تھا اور سر نے منع کر رکھا تھا کیونکہ بچے ڈیسک باہر رکھ کر چھلانگیں لگاتے تھے اور کتنے ہی ڈیسک توڑ چکے تھے۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی مجھے یقین تھا کہ میرے دوست میرا نام نہیں لیں گے۔ مگر جب سر نے دھمکی دی کہ ساری کلاس کو سکول سے نکال دیا جائے گا۔ تو وہ ہوا جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا جھٹ سے فرزانہ بولی سر، علی نے میرے سامنے ڈیسک باہر رکھا تھا۔ سر میری طرف آئے اور پوچھا کیا یہ صحیح کہہ رہی ہے؟ کوئی اور کہتا تو میں مکر ہی جاتا لیکن اس دشمن جاں نے سب کے سامنے کہا تو شدید صدمے سے میری آنکھیں دھندلانے لگیں یا شائد بھیگ گئی تھیں مجھے اُس کی توقع نہ تھی کیونکہ میرے جذبات اُس کے لیے کچھ اور تھے۔ میں نے غصے سے شدید جذباتی ہو کے ٹیچر سے کہا۔

جی سر میں نے ہی ڈیسک باہر رکھا تھا۔ انھوں نے کھینچ کے تھپڑ رسید کیا میرا چہرہ تھپڑ کی شدت سے گھوم گیا ساتھ ہی سر نے دوسرا تھپڑ مارا اس بار میں ڈیسک پر جا گرا مگر میری آنکھوں میں آنسوؤں جگہ انتقام تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ میرے منہ سے خون نکلنے لگا شائد ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس کے بعد سر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ تم نے سچ بولا اس لیے چھوڑ رہا ہوں ورنہ ابھی سکول سے نکال دیتا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے گہری نفرت سے فرزانہ کو دیکھا اور کہا۔

تم یہی چاہتی تھی ناں؟ لو خوش ہو جاؤ۔ مجھے غصہ میں دیکھ کر میڈم نے کہا جاؤ منہ دھو کر آؤ میں خاموشی سے کلاس روم سے باہر آ گیا۔ ساتھ ہی واش بیسن تھا۔ میں منہ پہ تازہ پانی کے چھپاکے مارنے لگا کہ ٹیچر کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم خاموش ہو رہتی۔ فرزانہ میڈم مجھے ڈر تھا کہیں سر اُٹھو رہم سب کو سچ مچ اسکول سے نہ نکال دیں۔ میڈم خاموش ہو گئیں، مجھے اور غصہ آنے لگا۔

اسکول ٹائم آف ہونے پر میں خاموشی سے گھر چلا آیا

......☆☆......

کچھ دنوں تک یوں ہی ناراضگی چلتی رہی۔ مجھے کلاس میں فرزانہ کا بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا سبھی میری ناراضگی کی وجہ سمجھتے تھے۔ یہ بات فرزانہ کو بھی محسوس ہونے لگی تھی کہ علی کا رویہ پہلے سے بدلا ہوا ہے۔ میں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پڑھائی کو وقت دینا شروع کر دیا جس دن سر نے مجھے مارا تھا اس دن چھٹی کے بعد روک کے دفتر بلا لیا اور بہت شفقت محبت کے ساتھ پڑھائی کے بارے میں بات کرتے رہے اور باقاعدہ وعدہ لیا کہ میں پوزیشن لوں۔ میرا اعتماد بحال ہوا سو میں چند ہی دنوں میں کلاس کا لائق فائق لڑکا تھا بورڈ کے سالانہ امتحان قریب تھے۔ کلاس کے سبھی بچے دل لگا کر پڑھ رہے تھے میں ہمیشہ سے ہی حساب میں بہت تیز تھا، ساری کلاس حساب، الجبرا وغیرہ سے بہت گھبراتی۔ لیکن اِسی میں میں بہت تیز تھا۔ اب ہوا کچھ یوں کہ ایک دن فرزانہ کو ایک سوال کی سمجھ نہیں آ رہی تھی میڈم نے کہا حساب کی ٹیچر اب صبح آئے گی تم علی سے سوال سمجھ لو۔ وہ ہچکچاتے ہوئے میرے پاس آئی اور سوال سمجھانے کی درخواست کی۔ میں نے روکھے لہجے کے ساتھ سوال سمجھانا شروع کر دیا۔ جب اُس کو احساس ہوا کہ میں اُس کی سمجھا کم اور تحقیر زیادہ کر رہا ہوں تو بولی رہنے دو اگر اس طرح سمجھانا ہے تو، میں نے فوراً کہا۔

اچھا تم کو یہ بات چبھتی ہے مگر جو تم نے کیا اُس کا کیا؟ وہ معصومیت سے بولی! علی ابھی تک وہ بات تم نے دل میں رکھی ہوئی ہے۔ مجھے لگا وہ دل میں میری چاہت رکھتی ہے لیکن زبان سے بس کہہ نہیں رہی یہ بات شاید اُس کے لیے عام تھی لیکن جب اس نے مجھ سے اتنی اپنائیت سے بات کی تو میں بھی اس کی ادا سمجھ کے سب بھول گیا اور اس بات کو ہی اس کا معافی نامہ سمجھ بیٹھا۔

تبھی اپنا یہ شعر زبان پہ آ گیا
دل بھی عجیب منصف ہے عالم

کہ خود اپنے ہی فیصلوں پہ اختیار نہیں

......☆☆......

بہاریں پھر سے لوٹ آئیں۔ میڈم سچ ہی تو کہتی تھیں کہ بات بن سکتی ہے تم کوشش تو کرو (میں خود کلامی کرتے ہوئے گھر آ گیا)۔ بورڈ کے سالانہ امتحان کو تھوڑے دن رہ گئے، میں مسلسل اس بات سے پریشان تھا کہ سکول آف ہونے کے بعد کیا کروں گا اور ہمارا اسکول لڑکوں کے لیے 8th کلاس تک ہی تھا۔ نویں اور دسویں جماعت صرف لڑکیوں کیلئے تھی۔ جہاں اس کی طرف سے دل صاف ہوا اور محبت دوبارہ جاگزیں ہوئی تھی ساتھ ہی گزرتا ہوا وقت تیز، باریک اور دہکتے ہوئے پل صراط کی مانند بنتا جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کے دماغ پلپلا ہو رہا تھا پڑھائی بھی ٹھیک سے نہ ہو پا رہی تھی کیونکہ اسے دیکھ لینا ہی میری محبت کی معراج تھی اور مجھ سے کچھ عرصے میں یہ نعمت چھننے والی تھی بہت سوچنے سمجھنے کے بعد آخر میں نے اپنے خالہ زاد بھائی سے بات کرنے کا سوچا وہ اس وقت میٹرک کر رہا تھا اور ہم اچھے دوست بھی تھے کچھ یہ کہ عشق کے میدان کا وہ پرانا کھلاڑی بھی تھا مدد نہ کر سکا تو کوئی اچھا مشورہ تو دے گا وہ میرے بھائی یا امی کو بتائے گا اور اس طرح میری شادی فرزانہ سے ہو جائے گی۔ ہاں یہ آئیڈیا ٹھیک رہے گا۔ ایک دن ہم لوگ چھت پہ بیٹھے ہوئے تھے اتفاق سے میں اور ارسلان ہی تھے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی میں نے بات کی۔

ارسلان بھائی میں...... میں اپنی کلاس کی لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کروں گا اس لئے تم میرے گھر والوں کو بتاؤ اور وہ رشتہ ڈالیں، مُندی آنکھوں کے ساتھ میں نے ایک سانس میں اپنی بات مکمل کی اور ڈر کے مارے اس وقت آنکھیں دوبارہ کھولیں جب اس کے ہولناک قہقہے میری سماعتوں سے ٹکرائے۔ میں منہ بسورتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے کیا تم مرزوں کی نادیہ کو پسند نہیں کرتے؟ اس کے قہقہے کو میری بات سننے کے بعد بریک لگ گئی، وہ بالکل خاموش ہو گیا، میں نے سوچا کہ اس کی بات کر کے میں نے اسے لاجواب کر دیا ہے اب تو ضرور ہی مدد کرے گا تب ایکدم اس نے مجھے گالیاں اور صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔

پہلے اپنی عمر تو دیکھو، چلا ہے عاشق بننے، کیوں تم نے بھی عاشقی کب سے کرنی شروع کر دی تھی، اب مجھے وہ پسند ہے تو کیا کروں، تم مدد نہیں کرو گے؟ میں نے بھی ترنت جواب دیا، کچھ دیر یوں ہی بحث چلتی رہی بلاآخر مجھے غصے اور پریشانی میں دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

اچھا یار کچھ کرتا ہوں لیکن تیرے ابا سے بہت ڈر لگتا ہے، خیر اب جب اس کشتی کے مسافر بن ہی گئے ہو تو ڈرنے سے کام نہیں چلے گا، چل تو بے غم ہو کے امتحان کی تیاری کر، اتنے میں کوئی شرلی پٹاکا چھوڑتے ہیں اس نے یاروں کی طرح کھلی بات کی تو میرا جگرا بھی بڑھ گیا میں خوش ہو گیا اور پڑھائی میں جُت گیا۔

......☆☆......

فرزانہ کی طرف سے میرا دل صاف ہوا ہی تھا کہ اُس کا رویہ بھی اچانک ہی بدل سا گیا وہ پہلے سے اور زیادہ مجھے اپنے قریب لگنے لگی۔ ہنس کے بات کرنا، خاص طور پر مجھے کام کہنا بلکہ ساری کلاس میں سے مجھے زیادہ اہمیت دینا، وہ باتیں کر رہی ہوتی تو اچانک میرے آ جانے سے خاموش ہو جاتی آنکھوں کا رنگ بدل جاتا اور میں بھی ایک گہری نظر ڈال کے ادھر ادھر ہو جاتا، اتنی کم عمری میں پاکیزہ محبت سچائی کی علامت تھی کیونکہ دیکھنے سے زیادہ کی چاہت ہی نہ تھی مجھے، اسکول یونیفارم میں وہ مجھے آسمان سے اتری حور محسوس ہوتی مجھے ذہنی طور پر ایک خوف تھا کہ کہیں یہ اولیس یا کلاس کے کسی اور لڑکے کو پسند نہ کر لے کیونکہ مجھے میرے خوابوں کی حقیقت سے ڈر لگتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ جب انسان محبت کر رہا ہو تو محبوب کے کھو جانے کا یا بدل جانے کا احتمال بھی پوری شدت سے ہوتا ہے لیکن اس کا رویہ، ادائیں اور مجھ سے نظریں چرانا اس بات کا غماز تھا کہ آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے، یوں بھی محبت کو اظہار کی ضرورت تب ہوتی ہے جب جذبوں میں خالص پن نہ ہو اور ادھر تو دن بدن مجھے اُس بات کا یقین دلایا جا رہا تھا کہ وہ صرف مجھ سے ہی پیار کرتی ہے۔ اس ساری صورت حال کو دیکھ کے میں نے ارسلان کو اوکے کی رپورٹ دی تو اس نے بھی بتایا کہ میں نے خالہ رخسانہ سے تمھاری بات کی ہے، یہ خالہ اب فوت ہو چکی ہیں لیکن ہم سب کی

دوست خالہ تھیں، بعد میں جب میں ان کے گھر گیا تو خالہ رخسانہ مجھے دیکھ کے مسکرائیں۔ منڈا جوان ہو گیا ہے کرتے ہیں اس کی شادی پہلے کما تو لے، اور میں ان کی بات پہ دھیرے دھیرے مسکراتا رہتا۔ بہر حال اب مجھے امید واثق تھی کہ میں اپنی منزل کو پالوں گا لیکن شاید قدرت مجھے کچھ اور دکھانا چاہتی تھی یا محبت کے نام پر دنیا سچے چاہنے والوں کا کیا حال کرتی ہے اللہ کی پاک ذات اس سب سے پردہ اٹھانا چاہتی تھی، آنے والے وقت میں جو کچھ مجھے پیش آیا میں اپنے قارئین کے حوالے ایمانداری سے ساری حقیقت کروں گا، کیونکہ یہ ساری کہانی میرے رائٹر کی ذہنی اختراع نہیں بلکہ مجھے پیش آنے والے واقعات ہیں، جن پر پتہ نہیں آپ سب کو یقین آئے یا نہ آئے، لیکن یہ آپ ہی کی امانت ہے۔

......☆☆......

خواب تھا یا حقیقت کہ دل بہت مسرور تھا کیونکہ آج مجھے اس نے اپنے گھر بلایا تھا۔ میرے ننھیال کے گھر لینڈ لائن پر فرزانہ کا فون آیا۔ اُس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ انگ انگ جھوم رہا تھا میں نے آج وہ پینٹ شرٹ پہنی جو ابو جی نے اچھے نمبروں سے پاس ہونے پر مجھے باہر سے گفٹ بھیجی تھی، ماموں نے باہر سے پرفیوم بھیجا تھا وہ چھڑکا، اچھے سے بال کاڑھ کر آئینے میں حتمی جائزہ لیا اور 'تیری میری ایسی دوستی' گنگناتے ہوئے باہر نکلا۔

گلی میں آتے ہی میں نے یار کے کوچے کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان کے دروازے پر پہنچا، بیل دی اور جان مسلسل انتظار کرنے لگا کوئی بھی برآمد نہ ہوا، میں نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے دوبارہ بیل پر ہاتھ رکھا، اتنے میں دروازہ کھلا اور وہ جانِ بہار سامنے تھی میں اسے ایک دم غیر متوقع طور پر دیکھ کر پریشان سا ہو گیا اور اس نے باریک ہونٹوں میں دبی ایک دلکش مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے میرے لئے رستہ چھوڑ دیا، اس مہربانی کے بعد میں قدرے پُر اعتماد ہو کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ بیرونی دروازہ عبور کرتے ہی مجھ پہ جھجک سی طاری ہو گئی کیونکہ جو بھی تھا آخر گھر تو پرایا تھا۔ ڈیوڑھی سے آگے آئے تو گھر پر سناٹا سا طاری تھا، میں نے دلفریبی سے اپنی محبوبہ سے پوچھا۔

تمہارے گھر والے نظر نہیں آ رہے؟ میری بات سن کر وہ شرمائی اور ظالمانہ ادا سے بولی۔

ارے ہاں آپکو بتانا یاد نہیں رہا آج تو ان سب کو کسی شادی میں جانا تھا، اس لیے وہ تو ادھر چلے گئے، اس کی بات سن کر میرا رومانٹک موڈ ایکدم سے ختم ہو گیا اور اس کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی، میں نے واپسی کا ارادہ باندھا اور اسے یاد کرایا۔

فرزانہ میں تو تمھارے ابا سے ملنے آیا تھا۔ چلو پھر کسی دن آ جاؤں گا۔ یہ سنتے ہی اس نے مجھے بازو سے کھینچا۔

ارے کیا کرتے ہو علی حسن اب آ چکے ہو تو کچھ دیر بیٹھ ہی جاؤ چائے پی کر جانا، میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا تا کہ منع کروں کہ مجھے نہ روکے، لیکن جیسے ہی میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں کی مستی میں اللہ جانے کیسی کشش تھی کہ علی حسن انکار نہ کر سکا اور یوں بھی تو اتنی پیار بھری یہ اس کی پہلی جسارت تھی۔ میں اتنے التفات کا تو نہ جانے کب سے منتظر تھا، سو بغیر کسی حیل حجت کے میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا، وہ میرے آگے مستانی چال کے ساتھ چلتی جا رہی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہ چھوٹا سا سفر کبھی ختم نہ ہو ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ صحن عبور کر کے دائیں سائیڈ پہ بنے ایک کمرے میں داخل ہو گئی میں نے بھی اس کی تقلید کی، اس کمرے میں سامان نہ ہونے کے برابر تھا، مجھے قدرے حیرت ہوئی لیکن ان باتوں پہ غور کرنے کا ہوش کسے تھا، اندر ایک دیوار کے ساتھ اکلوتا صوفہ پڑا تھا، اتنے میں میری نظر اپنے پیچھے پڑی کہنہ سی کرسی پر پڑی، میں اس پہ بیٹھنے لگا تو فرزانہ بہت تیزی سے پلٹی اور مجھے چند سیکنڈ میں بازو سے پکڑ کے سرعت کے ساتھ اپنی طرف کھینچا، میں اس کی اس حرکت پر کچھ دیر تو حیرت کے ساتھ اسے دیکھتا رہا لیکن تھوڑی دیر بعد مجھ پہ شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

آؤ ناں جان۔ یہاں صوفے پر بیٹھتے ہیں، کرسی پر نہ بیٹھو، اس کے خواب آگیں لہجے نے مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا۔ بلا چوں چراں مخمور ہو کر میں صوفے کی جانب بڑھنے لگا، میں بیٹھنے لگا تو وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی، میں نے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا، تو اس نے مسکرا کر کہا۔

علی حسن تم بیٹھو میں چائے لیکر ابھی آئی۔ میں مطمئن ہو گیا، اتنے میں پھر اس کی آواز آئی۔

اور ہاں پلیز صوفے پر ہی بیٹھنا، وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی کہ میں اسے باور کرانے کو صوفے پر بیٹھ گیا، ساتھ اس کے مجھے کچھ عجب سا محسوس ہوا، میں نے ایک بار پھر پریشان سا ہو کر فرزانہ کی طرف دیکھا، اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک آخری سین جو دیکھا وہ یہ تھا کہ میری محبوبہ، میری زندگی، میر ی فرزانہ کمرے کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی بلند بانگ قہقہے لگا رہی تھی اور اس کے بعد میں لڑکھنیاں کھاتا ہوا گہری کھائیوں میں گرتا چلا گیا، میں نے آنکھیں مل مل کے دیکھا کہ شاید کچھ سمجھ آئے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی تنگ سے کنویں میں گرتا جا رہا ہوں۔ گھپ اندھیرا اور چمگادڑیں مجھے نوچ رہی تھیں کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کتنی صدیوں سے یہ کنواں یا سرنگ غیر آباد تھی، گھنے جالے میرے چہرے پہ چپک گئے تھے، جسم پہ زہریلے سے کیڑے لپکنے لگے اور چند ساعتوں کے بعد شائد میں کسی پنجرے میں جا گرا، سنبھل بھی نہ پایا کہ ایک دلدوز قہقہہ کانوں سے ٹکرایا، میری آنکھیں ماحول سے نا آشنا تھیں لیکن اس قہقہے کو سن کر میں اچھل ہی تو پڑا، چاروں طرف احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا لیکن ہنسنے والا نظر نہ آیا، کچھ دیر بعد کسی حد تک آنکھیں ماحول سے آشنا ہوئیں تو اس اندھیری جگہ کو میں نے کافی وسیع پایا، ہر طرف گند ہی گند اور اور بائیں سائیڈ پہ انتہائی کونے میں ایک کالا بجنگ بھتنا سا بیٹھا ہوا تھا یا شاید کھڑا تھا، اس کے خوفناک چہرے پہ سب سے ڈراؤنی اس کی آنکھیں تھیں، چھوٹی چھوٹی لیکن لال سرخ، چہرے کی بناوٹ جنگلی مینڈھے جیسی، حتیٰ کہ سر پر سینگ بھی مڑے مڑے اگے ہوئے تھے، میں اس سے حقیقت میں ڈر گیا، لمبوترا چہرہ، تنگ سا بکری جیسا دہانہ، چھوٹے چھوٹے دانت اور عجیب کراہت آمیز داڑھی، نچلا دھڑ انسانوں جیسا اور موٹے سے گندے بازو ہاتھوں کے ناخن اس طرح نوکیلے جیسے خود رو گھاس کے بے تحاشا بڑھے ہوئے سرے، میں ابھی اس کے حلیے پہ غور کر رہا تھا کہ وہ پھر سے قہقہے لگانے لگا، ساتھ ہی ایک بھیانک آواز گونجی، کوٹھے کی رنڈی اور عشق کے حسین خوابوں کی رانی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا جان اینتھس۔ تم پہ جو جال پھینکا گیا تم خوب اس جال میں قابو آئے ہو تم انسانوں کو یہ محبت کا گھن نہ لگے تو ہم تمہارا شکار کیسے کریں، تمھاری محبوبہ نے اپنی وفاداری ہمیں بیچ کر تم جیسا انمول ہیرا میری گود میں ڈالنے میں ہماری خوب مدد کی اور اس سب کے بدلے میں اسے کیا ملا؟

یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔ اس کے جان اینتھس پکارنے پہ مجھے یاد آیا کہ جب نانی اماں کے ساتھ میں روحانی پرواز میں ہوتا اور کچھ انگریز انکلو کے ہاں ہم حاضری دیتے تو وہاں مجھے جان اینتھس کہہ کے بلایا جاتا تھا۔ یہ عجیب الخلقت سانڈ فرزانہ کو میرے خلاف کھڑا کر سکتا ہے؟

یہ ہمارے بارے میں سب جانتا ہے لیکن میرا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔

قارئین...... یہ بتاتا چلوں کہ یہ جو روحانی سلسلے ہوتے ہیں اس میں عمر کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، روح نہ بچہ ہوتی ہے اور نہ بوڑھا، یہ بس جوان ہوتی ہے اور اس شیطانی طاقت سے ڈر مجھے اس لئے نہیں لگ رہا تھا کہ جب ہم لوگ روح کے سفر پر ہوتے ہیں تو اس طرح کے بہت سے شیطان راستہ کاٹتے ہیں جن کو اللہ کی مدد سے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے اور مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے مجھے بھی اللہ کے کرم سے مدد ہو گی، کچھ توقف کے بعد وہ بولا تو اس کی آواز کی دھمک سے میرا پنجر الرزنے لگا، تبھی میری نظر اپنے دائیں طرف اٹھی، ایک پنجرا اور اس میں ڈھانچہ، کہیں کہیں کھال بھی پنجرے سے باہر لٹک رہی تھی، میں نے کراہت سے منہ دوسری طرف کیا تو ادھر بھی ایسا ہی منظر میرا منتظر تھا، طائرانہ نظر ڈالی تو میری ڈر سے گھگھی بندھ گئی، اس اندھیر نگری میں ہر طرف پنجرے ہی پنجرے تھے اور کسی میں تازہ لاش بھی کسی میں آدھا ڈھانچہ اور آدھا جسم باقی تھا کسی میں صرف ڈھانچے تھے۔ میری کیفیت کو محسوس کر کے اس کے ہیبت ناک چہرے پہ بہت مشکل سے بشاشت بکھری، اس نے بات کا سلسلہ جوڑا، تم اگر مجھ سے تعاون کرو تو اس بدبودار قید خانے سے تمہاری جلدی جان چھوٹ سکتی ہے، کیسے؟ میں نے اس کی آفر پر سرعت سے کہا۔

تمہارے پاس جو شکتی ہے وہ مجھے چاہیے، اس نے نپے

تیکھے انداز سے کہا، مجھے حیرت ہوئی کہ میرے پاس بھلا کونسی شکتی ہے، وہ سوال ابھی میرے ذہن میں تھا کہ وہ بول پڑا ۔ہاں تم کیسے جان سکتے ہو اس شکتی کو، آؤ میں بتاؤں، ساتھ ہی اس نے میری آنکھوں میں نظر گاڑ کر دیکھا، اپنی حالت کا تو پتہ نہیں لیکن اس کی آنکھیں کبوتر کے خون ایسی لال بوٹی ہو رہی تھیں، مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے اس کی طرف دیکھا، ساتھ ہی آئی ٹو آئی کنٹیکٹ ہوا تو شائد اس کا رابطہ اس پاور سے ہو گیا، ایک دم سے مجھے بہت گرمی لگنے لگی یوں لگے جیسے جسم میں کچھ غبار ہے جو نکلنے کی کوشش کر رہا ہے، میں نے اندھا دھند زور لگانا شروع کر دیا، جیسے بخار کی کیفیت ہوتی ہے مجھے ایسا ہی لگنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ بیان سے باہر ہے یہ ہو کیا رہا ہے میں اپنے ہی ہاتھوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ید بیضا کی طرح کوئی معجزہ رونما ہو رہا ہو اچانک میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان سے لیزر لائٹ جیسی کوئی چیز نکلی، تین لائٹس دائیں ہاتھ سے اور تین لائٹس بائیں ہاتھ سے نکل رہی تھیں، میں یہ سب دیکھ کے دم بخود رہ گیا، اب مجھے یاد آ رہا کچھ کچھ، یہ ساری قوت مجھے خاص طور پر عطا کی گئی تھی مگر کب؟ کچھ دھندلی دھندلی سی یادیں تھیں کچھ چہرے تھے، یاد نہیں آ رہا یہ سب کون ہیں اسی کشمکش میں بس آخری الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے Claw of Dragon اور وہ شعاعی پنجے میرے ہاتھوں میں نمودار ہو چکے تھے۔ پنجرے سے باہر وہ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔

ہاں مجھے یہ والی طاقت چاہیے، لاؤ شاباش یہ مجھے دے دو اس کے بعد تم جہاں جانا چاہو گے میں تمہیں چھوڑ دوں گا اس نے پنجرے کے اندر ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا، میں ڈبکا سا پنجرے کے اندر کر کے کھڑا تھا، اس کے ہاتھ مجھ سے تین چار بالشت دور ہی تھے میرے ذہن میں ایک خیال آیا، اگر یہ طاقت جو میرے ہاتھوں میں ہے وہ اتنی ہی خطرناک ہے کہ یہ اتنا بڑا جادوگر اس شکتی کا مجھ سے تقاضا کر رہا ہے تو پھر بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور دل ہی دل میں اللہ کو یاد کر کے میں نے ایک گر آزمانے کا فیصلہ کیا، لگ گیا تو لگ گیا نہ لگا تو جو اللہ کو منظور، اب میں بغیر ڈر اور خوف کے اس کے کریہہ ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اچانک میں نے ایک پنجابی بھڑک ماری اور ہاتھ اٹھا کے اپنے ہاتھوں کی روشنی اس کی طرف پھینکی ارے یہ کیا؟ اس کے لمحہ بہ لمحہ میری طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو میں نے اپنے Claw of Dragon کی مدد سے کہنی تک کاٹ پھینکا تھا، ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی جس سے میں کانپ کر رہ گیا لیکن اپنی حفاظت کرنا میرا حق تھا، اگر میں حملہ نہ کرتا تو اب اس کی جگہ ادھر میں زمین بوس ہوتا۔ میں نے اسے مخاطب کیا اگر یہ طاقت تمہارے لئے قیمتی ہے تو پھر اس پہ پہلا اور آخری حق صرف میرا ہے، میری بات اس نے شاید سنی ہو یا نہ سنی ہو، وہ ساقط ہو چکا تھا۔ بے ہوش تھا یا مر چکا تھا یہ سوچنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا میں نے وقت ضائع کرنے کی بجائے Claw of Dragon کی مدد سے پنجرے کی موٹی سلاخیں کاٹیں میں ادھر ادھر بھاگنے کا رستہ تلاش کر رہا تھا، دل ہی دل میں اپنی فتح کا جشن مناتا ہوا اندھا دھند بھاگنے لگا بڑی کھردری اور ناہموار جگہ تھی تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی، میرا حوصلہ جوان ہوا اور اپنی ہمت یکجا کر کے میں اس روشنی کی طرف بھاگنے لگا کچھ دیر کے بعد وہ روشنی کا نقطہ بڑھنے لگا مجھے کسی شے کا ہوش نہ تھا گرتا پڑتا میں اس نقطے کی طرف بڑھتا گیا اور آخیر بھاگتے بھاگتے غار کے دہانے پہ جا پہنچا میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ باہر نکلا تو ایک ویرانہ میرا منتظر تھا مجھے بہرحال اس بات کی خوشی تھی کہ اس بلا سے تو جان چھوٹی، پیچھے مڑ کے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی بہت بلند پہاڑ ہے جس کے اندر ایک غار میں مجھے بلکہ میرے جیسے اور بہت سے انسانوں کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے قید رکھا جاتا ہے۔ اوہ میرے خدا یہ کیسی اندھیر نگری ہے؟ میں نے اپنے ہاتھوں سے نکلنے والی روشنیوں کو دیکھا اور پر خطر گھاٹیوں سے نیچے اترنے لگا، سامنے گہرائیوں میں ایک میدانی سلسلہ تھا، میں نے سوچا کہ ادھر پہنچوں تو شاید گھر جانے کی کوئی سبیل نکلے، میں جھاڑیاں پھلانگتا اور چٹانیں عبور کرتا ہوا اپنی مطلوبہ جگہ جا پہنچا، یہ ایک چٹیل میدان تھا کہیں کوئی آبادی نہ تھی اور نہ ہی جگہ جانی پہچانی تھی، بہت پریشان تھا میں، کہاں اس محبت نے مجھے پھنسا دیا تھا، نہ میں فرزانہ نامی چڑیل سے پیار کرتا اور

نہ وہ شیطانی روح مجھے یہاں اٹھا لاتی۔اللہ میری مدد فرما،یہ دعا مانگ کر میں نے بے دلی سے آگے بڑھنا شروع کیا،اس جزیرے پر اک ہو کا عالم تھا،ہر چیز پراسرار تھی ،اچانک آسمان سے بہت سی کالی چڑیلوں کا غول نمودار ہوا اور مجھ پر جھپٹ ہی تو پڑا،انھوں نے مجھے نوچنا شروع کر دیا مجھے زخم ہونے لگے میں نے درد سے چلانا شروع کر دیا۔کئی جگہ سے میری کھال ادھڑ چکی تھی،میں بلبلا رہا تھا،اچانک مجھے آواز سنائی دی۔

علی حسن تمہارے پاس ایک طاقت ہے اسے استعمال کیوں نہیں کرتے؟

آں......ہاں......ہاں ہاں۔کون ہو تم؟

جو بھی ہوں تم انکو مار بھگاؤ یہ کالی چڑیاں نہیں بلکہ چڑیلیں ہیں،میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور ان چڑیوں کی طرف جو پہلے تو بہت کم تھیں لیکن اب بڑھتی جا رہی تھیں میں نے اپنے خدا کو یاد کیا اور ہاتھ فضا میں بلند کر کے چاروں طرف تیزی سے گھمانے شروع کر دیئے،ارے واہ میرے ہاتھوں کی تلواریں کیا چلیں ان چڑیوں جیسی چڑیلوں کی تو چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں کچھ دیر کے بعد ہی میدان صاف ہو گیا،آدھی سے زیادہ مر گئیں اور باقی بھاگ نکلیں،میں بھی نڈھال ہو گیا،کچھ دیر بعد میں نے پکارا تم کون ہو؟اے مجھے سن رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا مایوس ہو کر میں نے آگے کی طرف رخت سفر باندھا،کیونکہ ہو سکتا ہے وہ بھی دشمن کی کوئی چال ہو،یوں ہی چلتا رہا رستے میں بہت سی غیر انسانی مخلوقات سے سامنا ہوا،اپنے سے دوگنی طاقت سے ٹکرانا بہت بہت مشکل ہے بتانا تو بہت ہی آسان ہے لیکن اس طرح کی حقیقتوں کا سامنا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ،بالخصوص ایسے معرکے جن میں جان کی ضمانت بھی نہ ہو،نا جانے کتنا عرصہ میں یوں ہی چلتا رہا اور لڑائی لڑتا رہا بہت دفعہ رستے میں سمندر آئے،پانیوں پر براجمان مخلوق سے سامنا ہوا خونریز انکاؤنٹر ہوئے،ہزاروں کی تعداد میں جتھوں کی صورت میں دشمن کو تہہ تیغ کیا لیکن اتنا وقت گزرنے کے باوجود مجھے اس خونی جگہ سے نکلنے کا رستہ نہیں مل رہا تھا،میں بہت تنگ آ گیا تھا،بے وجہ سفر اور اپنوں سے دوری مجھے مارے جا رہی تھی،میں پریشان تھا کہ گھر والے کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔یہ سچ ہے کہ میں بذات خود کچھ بھی نہ تھا،اگر میرے پاس اپنے ہاتھوں سے نکلنے والی روشنی کی پراسرار قوت نہ ہوتی تو آج میری ایک بوٹی بھی کہیں نہ مل پاتی میرا وجود دنیا سے مٹ چکا ہوتا،لیکن یہ میرے خدا کا مجھ پہ عظیم احسان ہے،یہ سب سوچتے ہوئے ایک دن ڈھیلا ڈھالا سا جا رہا تھا،نہ جانے کہاں کا کہاں پہنچ گیا تھا اب تو اس خونی جگہ پہ ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔چلتے چلتے میں نے اچھل کر ایک درخت کی شاخ پکڑنی چاہی تو آسمان پہ ایک بندر اڑتا ہوا نظر آیا،شاخ تو ہاتھ نہ آئی لیکن وہ بندر میری طرف آنے لگا۔

آن واحد میں وہ میرے سامنے تھا،اتنا ڈراؤنا بندر؟ میں نے خود کلامی کی۔اس کے سانس کی پھنکار مجھے بےزار کر رہی تھی۔اے انسان تم یہاں کیا کر رہے ہو۔اس نے سوال کیا لیکن میں اس کے حلیے پہ غور کر رہا تھا ہاتھوں پہ جس جگہ انگلیاں ہوتی ہیں بالکل اسی جگہ اس کے پانچ نوکیلی ہڈیاں نکلی تھیں اور منہ کی جگہ کھوپڑی تھی جو ہو بہو بندر کی طرح تھی،پورے جسم پہ چمپینزی کی طرح بال تھے،اے بولتے کیوں نہیں؟میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی دھاڑ سے کانپ اٹھا،جواب تو تھا نہیں،اس لئے خاموشی سے ایک سمت چل پڑا،اس نے میری گستاخی کو شائد دل پہ لیا اور میری انگلیوں سے نکلنے والی سرخ لائٹوں کو نوٹس نہ کرتے ہوئے پیچھے سے مجھ پر جھپٹا مارا میں چونکہ ذہنی طور پہ تیار تھا اسلئے اس کے جھپٹا مارتے ہی میں واپس مڑا اور اس کی بندر جیسی کھوپڑی پہ پل پڑا۔ابھی ایک دو گھونسے ہی مارے تھے کہ وہ نیچے گر پڑا میں نے اسے ٹھڈا یارا لیکن وہ ٹیلے جیسا ہیبت ناک جسم یوں ہی پڑا رہا،اس کی تسلی کر کے میں ہاتھ جھاڑتا آگے بڑھ گیا،اچانک ایک نیلی سی روشنی نمودار ہوئی میں بے خوف دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا،اب یہ کیا بلا ہے؟میں نے خود کلامی کی،اتنے میں اس سے آواز نکلی،علی حسن تم جس جگہ آن پھنسے ہو اسے موت کی وادی کہتے ہیں،موت کی وادی،یہاں جتنا بھی سر ٹکراؤ گے نکلنے کا رستہ نہیں ملے گا،اس آواز نے کہا،کیوں رستہ نہیں ملے گا میں تمہاری یہ موت کی وادی خود تمہارے لئے اجتماعی قبر بنا دوں گا،اتنا دم ہے تو سامنے آ کر بات کرو ،میں نے غصے میں جواب دیا تو اس کا جواب ایک مترنم ہنسی

میں دیا گیا، تم غلط سمجھے، بالکل غلط۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ مانا کہ مجھے بھی تم سے غرض ہے لیکن میں کون سی طاقت ہوں اور مجھے تم سے کیا غرض ہے یہ بتانے کا ابھی صحیح سمے نہیں آیا، اور تم بس یہ ذہن میں رکھو کہ تمھیں اس وقت صحیح ہدایت صرف مجھ سے ملے گی۔ میں ہونقوں کی طرح اس آواز کی تائید میں سر ہلانے لگا، کیونکہ میں ہر حال میں چھٹکارہ چاہتا تھا، سنو یہاں کچھ لوگ اچھے بھی ہیں جو تمھاری ذرا سی محنت سے زبان کھول سکتے ہیں، اب جس سے بھی لڑائی ہو تو اس کو پوچھنا زندگی کا دروازہ کہاں ہے؟ وہ بتائے تو بس زندگی کے دروازے کو پار کرنا پھر اپنے وطن میں ہو گے۔

آواز یکلخت بند ہوئی تو میں بے چین ہو گیا سنو سنو یہ زندگی کا دروازہ کہاں۔ گھمبیر سناٹے کی وجہ سے میں سمجھ گیا کہ لائن کٹ چکی ہے، میری زندگی کا حالیہ وقت عمرو عیار کی طرح جنوں بھوتوں سے جنگ کی نظر ہو رہا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ وہ سب محض کہانی تھی اور میرے ساتھ سچ مچ ہو رہا تھا میں زندہ رہنا چاہتا تھا اس لئے میں نے کسی بھوت پریت کو بے چینی سے تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن کوئی آ ہی نہیں رہا تھا، اچانک ذہن میں ایک گولڈن آئیڈیا آیا میں بھاگتا ہوا چند قدم واپس پلٹا جہاں بندر نما بھوت کو مار کے بے ہوش کیا تھا، وہ ادھر ہی پڑا ہوا تھا، اس کے پاس پہنچ کے میں اس کے ماس کے بغیر چہرے کو پیار سے تھپتھپا کے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا کچھ دیر کی کوشش کے بعد وہ ہلنے جلنے لگا میں تھوڑا دور کھڑا ہو کے اس کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا، کچھ دیر بعد اس کے حلق سے ڈکرانے کی آواز آنے لگی شاید مجھ سے لڑتے ہوئے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، بہر حال مجھے صبر کرنا تھا سو میں چند منٹ اور کھڑا رہا اور فائنلی اس کی درد بھری انگڑائیاں ٹوٹیں تو اس کی نظر مجھ پہ پڑی، وہ دھم سے اٹھا اور میری مخالف سمت بھاگنے لگا میں نے اب کے یاد رکھا تھا کہ میرے پاس ایک قیمتی طاقت ہے سو اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ان خداداد روشنیوں کی مدد سے بندر کو لپیٹ کے اپنی جانب کھینچا، وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں لپٹتا میری طرف آ گیا۔

ہاں تو دوست۔ دوستی کرو گے؟ میں نے آفر کی تو کھوپڑی کے اندر سے اس کی مُردہ آنکھیں بھی سوال کر اٹھیں۔

''کیوں؟''

''اس لئے کہ تم سے ایک کام ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر جانچتی نظروں سے اسے دیکھا تو آنکھوں میں الجھن تھی۔

مجھ سے کام؟ اس نے بھدی آواز میں سوال کیا۔

تت...... تمھیں مجھ سے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔ تمھارے تو اپنے پاس ایک بڑی شکتی ہے، اس نے معصومیت سے میرے ہاتھوں سے نکلتی روشنی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا، میں نے سنجیدگی سے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا کہ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں ؛ڈور آف لائف ؛ کس جگہ ہے؟ وہ بٹر بٹر میری طرف دیکھ رہا تھا، میں نے اپنی بات دوبارہ اس پر واضح کی۔

یار زندگی کا دروازہ کہاں کھلتا ہے میں نے اپنے گھر جانا ہے۔ میری بات سنتے ہی اس نے قلابازی کھائی اور آسمان کی طرف قلانچ بھری میں نے بھی وقت ضائع کئے بغیر اپنے بازو کھولے اور لائٹ آف مائی ہینڈ اس کے پیچھے بھگا دی چند فٹ اوپر ہی میں نے اسے جا لیا جب میرے ہاتھوں کی طاقت سے وہ بے بس ہوا تو اس نے اپنا آپ حالات کے سپرد کر دیا، میری شکتی نے چند لمحوں میں پھر اسے میرے سامنے لا پھینکا۔

کہاں بھاگتے ہو؟ ہم تم سے مدد مانگتے ہیں اور تم جان چھڑاتے ہو؟

نہیں نہیں میں زندگی کے دروازے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مجھے جانے دو۔

اس کی موٹی آواز میں التماس تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔

سنو میں تمھیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا تم آرام سے مجھے معلومات دے دو میں تمھیں جانے دوں گا ورنہ تمھیں اندازہ تو ہو چکا ہے کہ میں تمھارا کیا حشر کر سکتا ہوں؟ جلدی بولو میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔

آخری جملہ میں نے بلند اور غصیلی آواز میں ادا کیا وہ میرے لہجے سے تھرایا اور یوں گویا ہوا۔

سنو میں تمھارے کہنے پر تمھیں بتا تو رہا ہوں لیکن اس کا تمھیں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ زندگی کے دروازے پر جس کا

پہرا ہے وہ سچ مچ تمھیں جان سے مار ڈالے گا، اس کی طاقت کا چرچا اس پوری موت کی وادی میں روز کیا جاتا ہے اس کے آگے تمھارے یہ ہاتھوں کی روشنی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

جتنا کہا ہے تم صرف وہ بتاؤ باقی میں دیکھ لوں گا، میں نے اس کی تمہید قطع کرتے ہوئے کہا، وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کے پھر بتانے لگا، ہم اس وقت موت کی وادی کے شمال کی طرف ہیں جبکہ اگر تم زندگی کے دروازے کی طرف جانا چاہتے ہو تو پھر تمھیں مغربی رُخ پہ سفر کرنا ہوگا انتہائی رخ پہ پہنچ کے ایک سمندر آئے گا وہ تم نے پار کرنا ہے اور جیسے ہی تم پار کر لو گے وہ بلا تمھارے سامنے ہوگی جس کے ساتھ مقابلہ کر کے جیتنے کی صورت میں تم زندگی کا دروازہ پار کر جاؤ گے۔

میں اس کی معلومات کے تناظر میں ذہن میں ایک پلان ترتیب دے چکا تھا، دوست میری بات سنو یہاں سے جتنا مغربی حصے کا فاصلہ تم بتا رہے ہو وہ تو طے کرتے کرتے میری آدھی عمر گزر جائے گی، یوں کرو تم مجھے اپنے اوپر سوار کرو اور وہاں تک لے جاؤ، یقین کرو میرا اتنا وزن نہیں ہے امید ہے تم نہیں تھکو گے آخری بات کر کے میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی زبردستی مسکرانے لگا، سچ تو یہ ہے کہ میں اب مار دھاڑ سے بری طرح تھک چکا تھا اور اس پر ظلم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، ہو سکتا ہے وہ بھی ایسا ہی سوچ رہا ہو، اسی لئے میری بات پر اس نے سرنڈر کیا اور بلا تعطل مجھے اپنے اوپر سوار کر لیا، ساتھ اس کے ایک جھٹکا لگا اور میرا بھدا جہاز فضا میں محوِ پرواز ہو گیا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی، میں اس کے بال پکڑے تختے جیسی کمر پہ چپکا ہوا تھا، حیرت انگیز طور پہ اس نے تھوڑی دیر بعد ہی مجھے مطلوبہ جگہ اتار دیا۔

بس دوست ہمارا ساتھ یہیں تک تھا اس سے آگے میں نہیں جا سکتا، اور ہاں آگے بہت پر خطر سمندر ہے جسے خونی سمندر کہا جاتا ہے، وہاں تمھیں بہت احتیاط کرنا ہو گی، اس نے میرے کندھے سے اپنا ہڈیوں والا بھاری ہاتھ اٹھایا تو میں نے اسے ہاتھوں میں لے لیا۔

سنو اس موت کی وادی میں پہلے دوست ملے ہو تم، اس لئے میں تمھیں کبھی نہیں بھولوں گا، اپنا خیال رکھنا اور ہو سکے تو مجھے معاف کرنا میں نے اس کی کھال کے بغیر انگلیوں کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا وہ مردہ چہرے پہ دھری جاندار آنکھوں سے مسکرا دیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ جلد ہی وہاں سے نکل گیا شاید اس کے دل میں کوئی خدشہ تھا بہر حال میں نے اپنی منزل کی طرف نگاہ کی۔ سامنے سمندر تھا، میں بلا تعطل بڑھتا گیا، بیدار ذہن کے ساتھ میں نے کنارے پہنچ کے ایک انگڑائی لی اور وارم اپ ہونے کے لئے تھوڑی ایکسرسائز کی ہاتھوں کے چھرے استعمال کرنے آ گئے تھے اس لئے وہ فی الحال میرے پنجوں کے اندر تھے، ان شعاعوں کو ان کی کاٹ کی نسبت سے چھرے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اب تک میرے چھروں نے بڑی سے بڑی شیطانی طاقتوں کو پچھاڑا تھا، ورنہ میں نہتا اس خونی وادی میں گمنام مارا ہی تو جاتا، پچھلی پرفارمنس کی وجہ سے مجھے اب بھی اپنے زورِ بازو پر پورا بھروسہ تھا، پتہ نہیں یہ claws of dragen میرے اندر کیسے آ گئے، اور اس شیطان کو اس سب کی خبر کس نے کر دی، اور اس فرزانہ کو مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ شکر ہے کہ میں نے سب کو شکست دی، اور بری جگہوں پہ بھی کچھ اچھے لوگ ہوتے ہیں میرا بھدا دوست جو کچھ دیر پہلے مجھے یہاں اتار کر گیا ہے اس نے میرا کتنا ساتھ دیا اور آگے اب جو بھی آئے گا وہ بھی انشا اللہ منہ کی کھائے گا، میں اپنے اوپر گزرے حالات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سمندر میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی میں چوکنا ہو گیا ایک دم پانی کی اونچی لہر اٹھی اور مجھے اپنے دامن میں لے کر کے بری طرح بھگو گئی، میں اپنا منہ صاف کر ہی رہا تھا کہ ایک دیوہیکل جن نما انسان میرے سامنے آن کھڑا ہوا، اس کا منہ بھی پہلوں کی طرح سخت خوفناک تھا، مجھے ڈر تو کیا لگنا تھا الٹا کراہت محسوس ہوئی، وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، دو تین فٹ کے فاصلے سے ہی ہاتھ لمبا کر کے میرے بال پکڑنے لگا، میں نے اتنے لمبے بازو سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اپنے آپ کو ان ایکشن الرٹ کیا اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں سے قوت کے پنجے برآمد ہوئے اور میں نے ان کا رُخ اس بدہیئت کی طرف کر دیا، بازو کٹنے ہی لگا تھا کہ میں نے پل بھر میں ارادہ بدلا اور کلاز کا رخ اس کے بے ڈھنگے جسم کی طرف کر دیا تھوڑا جھٹکا دیا اور اسے لپیٹ کے اپنے قریب

کرلیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا میں نے خود ہی بات شروع کردی، زندگی کا دروازہ کہاں ہے؟ بولو جواب دو جلدی، ورنہ مار ڈالوں گا زندگی کا دروازہ کدھر ہے؟

وہ مجھے یک ٹک دیکھنے لگا۔

اسے بتاتے ہو یا ٹکڑے کرکے سمندر میں ڈالوں؟

کون ہو تم؟ اور کس نے تجھ پہ آشکار کیا زندگی کے دروازے کا راز؟ یہ تو ہمارے علاقے کا خفیہ مقام ہے۔ وہ کچھ دیر بعد بولا تو آواز بہت بھرائی ہوئی تھی، میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنے ہاتھوں کو پیچھے کھینچا تو میرے کلاز کے شکنجے میں ہونے کے باعث اس کا کھردرا کالا جسم بھی کھنچنے لگا اس نے ناک سکوڑی تو میں نے پھر یہ ہی حرکت کی اسلئے کہ مجھے معلوم ہوگیا یہ ہی اس کی کمزوری ہے کلاز کی گرفت کافی سخت تھی، اتنی کہ میرے ہاتھوں کی شعاعوں کی وجہ سے اس کے جسم کی کھال تڑخنے لگی اور نیچے سے کالا سیال مادہ بہنے لگا۔ بتاتا ہوں بتاتا ہوں، مجھے چھوڑ دو، میں جل رہا ہوں، یہ آگ کی رسیاں میرے جسم سے اتاردو، وہ گڑگڑایا تو مجھے منزل قریب لگنے لگی، اس کے منہ سے یہ سن کر میں نے ذرا سی گرفت ڈھیلی کی، پوری اس لئے نہیں تاکہ موقع پاتے ہی وہ فرار کی راہ نہ لے، تبھی وہ ڈرتے ہوئے کہنے لگا میں تمھیں سب کچھ بتاؤں گا لیکن یہ بتاؤ کہ تم۔تم کون ہو؟ اس کے سوال نے مجھے سیخ پا کر دیا، اک بار کہا تو ہے کہ جو میں نے پوچھا ہے اسکا جلدی جواب دو اور تم الٹا میرے ساتھ سوال جواب کر رہے ہو؟ میں نے چیخ کر کہا اور ساتھ ہی اپنے کلاز آف ڈریگن سے اسے الیکٹرونک شاک دیا، وہ تڑپ کر چیخنے لگا۔

سس۔سمندر کے پار ایک دیو ہے وہ جس جگہ پہرا دیتا ہے اسی جگہ زندگی کا دروازہ ہے جو ظاہر نہیں ہے، جب تک وہاں وہ دیو موجود ہے تب تک اس دروازے تک پہنچنا ناممکن ہے، ہاں اگر اس دیو کو مار دیا جائے تو پھر اپنے آپ وہ دروازہ سامنے آجائے گا لیکن اس دیو کو مارنا کسی کے بس کی بات نہیں، اور اکیلا آدمی تو اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔'' وہ اب رٹو طوطے کی طرح پٹر پٹر بول رہا تھا۔

شکریہ بھائی جان، اس کے چپ ہونے پہ میں نے خوش ہوکے کہا۔

اور ہاں تمھیں میں ساتھ لے کر وہاں جاؤں گا، ساحل کی ریت پہ بیٹھتے ہوئے میں نے اطمینان سے کہا۔

کیا؟ تم میری ساری بات سن کر بھی وہاں جاؤ گے؟ دیکھو وہ ایک بھیانک جگہ ہے اور وہاں جاتے ہی تم مارے جاؤ گے، اس دیو سے مقابلہ کرنا تمھارے بس کی بات نہیں، وہ گڑگڑایا تو میں غصے سے پاگل ہوگیا، ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور ریت سے جمپ کرکے میں اٹھ کھڑا ہوا، چونکہ وہ ابھی تک میرے ہاتھوں کی شعاعوں کے مضبوط حصار میں تھا اس لئے سنبھل نہ سکا اور گیند کی طرح اچھل کر سمندر کے پانی میں جا گرا، اس کے گرنے سے سمندر میں پل بھر کے لئے ایک گڑھا بنا اور ساحل پر پانی دور تک پھیلتا چلا گیا ساتھ ہی بے تحاشا چیخنے کی آواز آئی میں نے مسکرا کر اپنے claws of dragen کی طرف دیکھا اور ایک ایسی مخلوق کے طاقتور جن کو پانی سے پل بھر میں نکال باہر کیا جو مخلوق ہم انسانوں پر حاوی ہوکر پریشان بھی کرتی ہے اور نقصان بھی دیتی ہے، اب وہ بھیگی بلی بنا میرے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔

میں سمندر پار والے دیو کے ہاتھوں مارا جاؤں یا نہیں لیکن تجھے ضرور مار ڈالوں گا بیوقوف جن کے بچے۔ میں نے اونچی آواز سے کہا تو وہ خاموشی سے سہما کھڑا رہا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ میری بات سے اختلاف نہیں کرے گا، کچھ دیر میں نے اس کا جائزہ لیا پھر آہستہ آہستہ برقی پنجے ڈھیلے کئے وہ یوں ہی کھڑا رہا، مجھے کچھ اطمینان ہوا۔

اب چلیں؟ میں نے اس کے نزدیک جاکے پوچھا۔

ہاں ہاں چلو، اس کی تیزی پہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ وہ نیچے ہوا تو میں چھوٹا سا بھاگ کے اس کی گردن پہ یوں جا بیٹھا جیسے کوئی خونخوار پرندہ بیٹھا ہو وہ اس لئے کہ جسمانی لحاظ سے میں اس دیو ہیکل کے سامنے پرندہ ہی تھا لیکن خونخوار اسلئے کہ گردن پہ بیٹھتے ہی میں نے اپنے ہاتھوں کی شعاعیں چھوٹی کرکے اس کی گردن پہ سخت کرلیں تاکہ وہ مجھے دھوکا نہ دے سکے، اور بیچ سمندر مجھے پھینک کے بھاگ نہ لے۔ زوووں کی آواز آئی اور میرے ساتھی نے اڑان بھری، مجھے خوف سا محسوس ہوا لیکن میں نے سوچا کہ کوئی بات نہیں جب جہاز میں بیٹھتے ہیں تب بھی تو ایسا ہی فیل ہوتا ہے، اس کے بعد میں نے خود کو ریلیکس کیا اور ادھر ادھر

دیکھنے لگا اچانک ہمارے سامنے ایک بہت بڑی چمگادڑ آ گئی، اسے میں تو نظر نہ آیا لیکن وہ میرے ساتھی کے اوپر حملہ آور ہوئی، میرے دوست نے ایک طرف ہوکر اس کا وار خالی جانے دیا اور اس کے بعد مجھے کہا۔

مضبوط ہوکر بیٹھ جاؤ۔ کیوں تم لینڈ کرنے لگے ہو؟

اتنے میں اس نے اپنا ڈراؤنا بازو نکالا اور اپنے اوپر چھائے ہوئے چمگادڑ کے پر کے اوپر جھپٹا مارا وہ بھی بہت تیز تھی لیکن پر زخمی ہونے پہ اس نے طوفان برپا کردیا، کیوں آئے ہو میرے علاقے میں؟ واپس چلے جاؤ ورنہ اس سمندر کی تہہ میں دفن کردوں گی، اس کی دو دو تین تین بار آتی ہوئی آواز پہ میں نے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی، کیوں استاد میں وار کروں؟ اگر کہتے ہو تو؟ ہاں، باس نے مختصر جواب دیا اور ساتھ ہی میں نے بائیں ہاتھ کے پنجے کھول دیئے، چمگادڑ کی چمکتی نظروں کا زاویہ میری طرف ہوا تو مانو بھونچال آ گیا۔ آدم بو، آدم بو کہتی ہوئی میری طرف آئی اتنے میں اس کی گردن قابو کرچکا تھا وہ پر پھڑ پھڑانے لگی تو میرے دوست نے اپنے ہاتھ استعمال کرتے ہوئے اس کے پَر کامیابی سے نوچ کر سمندر میں اڑا دیئے ساتھ ہی میں نے آن واحد میں گردن مروڑی اور اس کا قلع قمع کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔

یار یہ علاقے کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی، ہم تو اُڑ رہے ہیں، جہاں مرضی جائیں؟ مرحومہ کو کیا مسئلہ تھا میں نے اس کی گردن پہ ہاتھ جما کر لیٹتے ہوئے کہا تو اس نے بتایا کہ ہماری دنیا میں ہر کسی کا مخصوص علاقہ ہوتا ہے، کوئی کسی کے علاقے میں داخل ہوکر حدود کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ہاں اگر زور ہو تو مقابلے کے بعد قبضہ ہو بھی جاتا ہے، تم انسانوں کی طرح ہمارے بھی اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔

لیکن آج تو خلاف ورزی ہوگئی ہے میں نے لقمہ دیا۔

تو وہ ماری بھی تو گئی ہے ناں، اس نے بے ساختہ کہا تو میں مسکرائے بنا رہ نہ سکا، اب وہ قدرے فرینک ہوچکا تھا، مجھے یاد آیا کہ جو میرا پہلا مخلص دوست تھا وہ بھی مجھے ایک لائن پہ چھوڑ کر گیا تھا جس کے آگے آتا تو خونخوار لڑائی ہوتی اور شاید اس کی اتنی طاقت بھی نہیں تھی ورنہ طاقتور کے لئے موت سے لڑنا بہت مزے کا کھیل ہوتا ہے۔ وہ اونچی

اڑان میں تھا، میں کسی بچے کی طرح اس کی گردن سے چپکا ہوا تھا سمندر کا وسط تھا اس لئے گھبراہٹ گہرا تھا، میں نے فضول سوچوں کو جھٹک کر اپنی سوچ کو آنے والے وقت کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا کیونکہ میری پہلے سے کی گئی پلاننگ ہی میرے کام آنی تھی۔ میرے دوست نے محسوس کیا کہ میں خاموش ہوں تو اس نے بھی بولنا مناسب نہ سمجھا، اسی لئے میرے دل میں اس مخلوق کے واسطے آج بھی تکریم ہے کیونکہ یہ ہم انسانوں کی طرح بے جا اور بے وقت کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتے، میں ست سا ہو کے اس پہ لیٹا ہوا تھا کہ ایک دم مجھے بہت گرمی کا احساس ہوا، سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، میں اٹھا، اتنی ہی جلدی اس نے ڈراؤنی سرگوشی کی، لگتا ہے اس دیو کو بھنک پڑ گئی ہے کہ کوئی اس کی حدود میں داخل ہو چکا ہے، تم لیٹے رہو، کیا اسکا علاقہ شروع ہو گیا؟ میں نے جوش سے پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا یقیناً وہ پریشان تھا۔ میں نے اس کی ہمت بندھائی، اور بالوں سے بھری کمر پہ ہاتھ پھیر کر کہا یار تم پریشان مت ہو، میں نے کچھ سوچ رکھا ہے، اور مجھ پہ اعتبار رکھو، سب بہتر ہوگا، وہ جواب میں چپ ہی رہا۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ گڑگڑاہٹ ہوئی یوں جیسے ریل پٹڑی سے اتر رہی ہو یا خدانخواستہ چلتی ریل کے پہیے نکل گئے ہوں، میں نے لیٹے لیٹے آسمان پہ گہرا کالا دھواں پھیلتے دیکھا، میرا دوست گھبرا رہا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ ڈولنے لگا، اے اے سنبھل کے بھائی، کچھ نہیں ہوتا، اب تو مزہ آئے گا، تم خود کو قابو میں رکھو۔ میری بات سن کے وہ متوازن ہو گیا لیکن زبان سے خاموش تھا، جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی بہت ٹینس ہے، سنو میں جیسے کہوں تم ویسے ہی کرنا اور زیادہ لمبا کام نہیں کرنا ہم نے، بہت جلدی یہ ٹوپی ڈرامہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا، اس نے ناراض بچوں کی طرح صرف سر ہلا دیا، ابھی ہماری پلاننگ چل رہی تھی کہ آسمان سے بجلیاں گرنا شروع ہو گئیں، تم جانتے ہو دوست وہ کس سمت میں ہوگا، بس جلدی سے ادھر کی طرف اڑو، میں نے اس کے جسم کے بالوں میں چھپتے ہوئے تیزی سے کہا، وہ مشرق کی طرف پرواز کرنے لگا، بجلیوں کی بوچھاڑ جاری تھی آسمان سے سیدھی سمندر میں جا رہی تھی، چند لمحوں بعد ایسا لگا کہ ہم آتشِ نمرود میں گھر گئے ہیں، میں اب اپنے دوست کی کوئی بات نہیں مان سکتا تھا، نیچے ہو جاؤ، اس نے پھنسی ہوئی آواز میں تنبیہ کی، لیکن میں نے خود کو اوپر کیا اور اپنے بازو فضا میں پھیلا دیئے، میرے بازوؤں کی بجلیاں اس آگ میں پھیلیں تو میرا دوست چیخنے لگا، یہ کیا کر رہے ہو، وہ ہم دونوں کو جلا کے بھسم کر دے گا۔

میرے علاقے میں آنے والا کون گستاخ ہے، یہ ننھی شعاعیں میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں، میں نے ڈرے بغیر آواز کا تعین کیا اور سرگوشی کی، جہاں زیادہ سرخ آگ ہے وہاں آنکھیں بند کر کے گھس جاؤ۔

نہیں، ہرگز نہیں، وہ مجھے اور تمہیں مار ڈالے گا، چلو واپس چلیں، جیسے ہی میرے دوست نے بغاوت کی اور واپسی کے لئے مڑا، میں نے بائیں ہاتھ کے پنجے اس کی کمر میں چبھوئے۔

جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو نہیں تو اس سے پہلے تمہیں میں مار ڈالوں گا، وہ کچھ دیر یوں ہی فضا میں کھڑا رہا، اور شاید اپنی موت کو قبول کر کے اس نے بمشکل گردن موڑ کر میری طرف دیکھا میں نے آنکھوں میں محبت بھر کے اسے چلنے کا اشارہ کیا اس نے موٹی گردن سیدھی کی۔ اور پھر میرا توازن کے ساتھ اس کے اوپر بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا، کیونکہ وہ آندھی سے بھی زیادہ رفتار میں اس آگ کے بگولے کی طرف بڑھا، یہ سب کچھ چند ساعتوں میں ہو رہا تھا، میں نے اب صرف اپنے سامنے نظر رکھی اور جب ہم سمندر کے اوپر تیرتے اس بگولے کے اندر جانے ہی والے تھے کہ اچانک وہ آگ ہماری طرف لپکی، میں نے پاؤں جما کے دوست کی کمر پر رکھے اور اپنے بازو اس بگولے کی طرف بڑھا کر ایک جھٹکا مارا، سمندر میں مانو زلزلہ آ گیا۔ ادھر سے بھی جوابی وار کیا گیا، ہم دونوں پر سمندر کا پانی یوں گرا جیسے تیز اب ہو، میری کراہ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا آگ سے بنا ہوا دوست تڑپ کر میری طرف دیکھنے لگا، میں نے حوصلہ دیا، کچھ نہیں ہوا یار لیکن میری بات منہ میں ہی رہ گئی وہ بگولہ آسمان پہ بلند ہو کے ہم پہ چڑھائی کرنے والا تھا، وہ لحہ بہ لحہ اوپر جا رہا تھا، میں نے بازو پھر ایک بار کھولے اور وہ لیزر لائٹ جو اس عجیب و غریب سفر میں مجھے قدرت کا تحفہ عطا ہوئی تھی اس اوپر اٹھتی آگ کے اندر گھسا دی، الامان والحفیظ اس قدر ڈراؤنی اور اونچی کرخت چیخیں

تھیں کہ جی چاہا واپس بھاگ لوں لیکن منزل پہ پہنچ کے اندھیروں کی طرف پلٹنا گویا موت کو گلے لگانا تھا، میں نے بازو اس آگ میں گھسا کے تلوار کی طرح چلانے شروع کر دیئے، اب تو اس بدروح کے بین ناقابل برداشت تھے ، ہم پہ عجیب گدھ نما چیزیں اڑ رہی تھیں، ان کے حملے کو میرا دوست ناکام بنا رہا تھا، اس قدر شور سے جی گھبرا رہا تھا کہ دل کر رہا تھا کانوں میں انگلیاں گھسیڑ لوں، اگر یہ بیوقوفی کرتا تو شائد خودکشی کے مترادف ہوتا، کیونکہ میرے ہاتھوں میں تو الیکٹرک چھرے لگے ہوئے تھے، اپنی سوچ سے میرے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی جس کی وجہ سے مجھے عجیب احساس ہوا، وہ بھی دوران جنگ کہ میں نہ جانے کتنے وقت سے مسکرایا نہیں تھا جس کی وجہ سے میرے چہرے کے عضلات کافی سخت ہو گئے تھے، اپنے اندر کے تانے بانے میں محو ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ سامنے کھڑی آگ سے جو بوریت ہو رہی تھی وہ دور ہو گئی اور اتنا وقت بیتا کہ میرے ہاتھوں کی گرفت نے اس آگ کے جن کو پانی میں ڈبکیاں دینی شروع کیں تو وہ آگ کم ہو گئی بلکہ اس میں سے دھواں خارج ہونے لگا، میں نے اپنے غیر بشری دوست کی طرف فتح مندی سے دیکھا تو اس نے سمندر کی طرف اشارہ کیا، میں سمجھا کوئی اور بلا آ گئی ہے لیکن ادھر گدھوں کی لاشوں سے سمندر کالا پڑ رہا تھا، یعنی ہم فتح کے بالکل قریب تھے، یہ سوچ آتے ہی میرے تو خوشی سے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں نے اس آگ کی طرف یکسوئی کی اور ہم دونوں جلدی سے اس کے اور قریب چلے گئے، ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے، اندازے سے کبھی میں اس کی گردن مروڑتا اور کبھی اس کی ٹانگیں کھینچتا، اس کے ڈکرانے کی آواز اب بھی بہت دلدوز تھی، لیکن میں نے اب اسے منطقی انجام تک پہنچا کے ہی دم لینا تھا، ایک آخری وار کرنے سے پہلے میں نے دوست جن سے آہستہ آواز میں کہا کیا خیال ہے؟ اس نے اپنا بڑے پتھر جیسا سر اثبات میں ہلا دیا اور میں نے پھر اپنے دائیں ہاتھ کو یوں چلانا شروع کیا جیسے میں کسی دشمن پہ تلوار کے وار کر رہا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھوں کے ساتھ کچھ ٹکراتا ہے اور پاش پاش ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل ابھی تک مجھ پہ واضح نہیں ہو پائی تھی، ویسے بھی اس مخلوق کی شکلیں توبہ استغفار اس قدر بھیانک ہیں کہ میں نے دیکھ کے کرنا بھی کیا تھا، میں ابھی ٹامک ٹوئیاں مار ہی رہا تھا کہ وہ آگ پہلے تو مکمل کالے سیاہ دھوئیں میں تبدیل ہوئی اور آہستہ آہستہ وہ دھواں فضا میں میں تحلیل ہونے لگا، میں اس منظر کو حیرانی سے دیکھنے لگا میرا دوست بھی اپنی جگہ پہ مجھے پیٹھ پہ سوار کئے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، کالا دھواں چھٹا تو ساتھ ہی اس کے عقب میں ایک روئی کا بادل نمودار ہوا، میری دلچسپی بڑھ گئی، میرے ہاتھوں کی شعاعیں ابھی تک اس جگہ تھیں جہاں آگ کی لپٹیں تھیں، سچ پوچھیں تو میں اب بات بات پہ ڈرنے لگا تھا کہ کہیں کوئی اور دشمن نہ آن دھمکے، اس لئے اپنے ہاتھوں کو اسی جگہ رکھا جس کے عقب سے وہ سفید بادل سا نمودار ہوا تھا، اس کی سفیدی اتنی زیادہ تھی کہ جیسے کوئی بھڑکتی سفید روشنی کا ٹکڑا ہو، وہ روشنی نما بادل ذرا بلند ہوا اور ایک آواز آئی، مبارک ہو علی حسن تم نے ایک عظیم کامیابی حاصل کر لی ہے، اس دنیا میں بس یہ تمہاری آخری آزمائش تھی، میرے جانے کے بعد ایک دروازہ نمودار ہوگا تم بے دھڑک اس میں داخل ہو کر اپنی دنیا میں جا سکو گے، سنیں آپ کون ہیں، کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتا ہوں۔ میں نے اپنی خوشی سے لرزتی آواز پہ قابو پایا اور جواب کا انتظار کرنے لگا ، بتائیں گے۔ بتائیں گے برخودار، لیکن مناسب وقت آنے پہ، ساتھ ہی خاموشی چھا گئی، وہ دلنشیں آواز آنا بند ہوئی تو میں بھی اس کے سحر سے نکل آیا، یہ آواز مشکل میں کتنی ہی بار میری مدد کر چکی تھی، میرا اس شخصیت سے آواز کا رشتہ تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہستی ہے جو اس قدر میری سرپرست ہے کہ مجھے کسی بھی مشکل میں رہنے نہیں دیتی، میں ایک حیرت میں گم تھا کہ میری آنکھوں نے حیرت کا ایک اور منظر دیکھا، ششدر سا کھڑا میں منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ میرے اللہ نے جس کو میرا محافظ بنا کے بھیجا تھا اس نے بالکل سچ کہا تھا، اس کے جاتے ہی میرے سامنے سفید رنگ کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں سے میرے گھر کی چھت نظر آ رہی تھی، میں نے خوشی میں اپنے واحد دوست کو جپھی ڈال لی، اور اسے چوم کر میں نے اسکا شکریہ ادا کیا، جس کی بدولت میں اس معرکے کو سر کر پایا تھا، میں نے اسے الوداعی جپھی ڈالی اور وہ مجھے لئے ہوئے اس دروازے کے بالکل پاس آ گیا، میں نے

خوشی سے چھلانگ لگائی اور اس چھوٹے سے دروازے سے جھک کر دوسری دنیا میں جانے لگا، میرا قدم ادھر رکھا ہی جانے والا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سسکنے کی آواز آئی، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رو رہا تھا جسکو جن بھوت کہا جاتا ہے، میں بھاگ کر اس سے لپٹ گیا، دوست تم بہت یاد آؤ گے، اس نے مجھے لپٹتے ہوئے کہا، تم بھی۔ مجھ سے اس سے زیادہ نہیں کہا گیا۔ کچھ دیر ہم یوں ہی بغلگیر رہے، میں اسے تھپک رہا تھا، تم نے میری قوم پہ بڑا احسان کیا ہے جو اس ظالم کے نا صرف تسلط سے ہمیں آزاد کرایا بلکہ اسے مار بھی ڈالا، دوست تم نے ایک بہت بڑی آفت سے میری قوم کو نجات دلائی ہے، اگر تم مانو تو ایک بات کہوں؟ میں نے اس سے الگ ہو کے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا، آج ہمارے مہمان بن جاؤ۔ میرا سارا قبیلہ بہت خوش ہو گا، ہم سب تمھاری بات مانیں گے، جہاں بلاؤ گے ہم حاضر ہوں گے، تم بہت بڑی طاقت ہو، ہمیں اپنی خدمت کا موقع دو، اس کی آنکھوں میں وہ آرزو تھی جو میں کبھی بھی پوری نہیں کر سکتا کیونکہ جتنی دیر اس نے بات کی تھی میں نے بیسیوں بار اس دروازے کے پار دیکھا تھا جہاں سے میرے گھر کی چھت نظر آ رہی تھی، میں نے اس کے ہاتھ کو سہلایا، دوست میں تمھیں ضرور بلاؤں گا اور ضرور ملوں گا لیکن آج نہیں، وہ دیکھو میرا گھر، وہ مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے اشارے سے اسے دکھایا، اور وہ بھی شاید سمجھ گیا تبھی اس نے کوئی بات نہ کی میں نے بلا تعطل زقند بھری اور اس سفید براق دروازے کی چوکھٹ پہ پہنچ گیا، مڑ کر دیکھا وہ مجھے اداسی سے دیکھ رہا تھا، میں نے ہاتھ ہلایا۔ وہ بھی ہاتھ ہلانے لگا۔ جیسے ہی میرا دوسرا پاؤں دروازے کے پار ہوا، مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں لڑھکنی کھا کے اس چارپائی پہ جا گرا، جو عموماً ہمارے گھر کی چھت پہ بچھی رہتی ہے، میں نے حیران ہو کے اپنے پیچھے دیکھا کہ میرے گرنے کا سین میرے جن دوست نے تو نہیں دیکھا، لیکن وہاں کوئی دروازہ نہ تھا، میں خلاء میں گھور کر رہ گیا، میں نے سوچا میرے گھر والے تو بہت پریشان ہوئے ہوں گے میری گمشدگی سے، یہ سوچتے ہی اپنے خاندان کی محبت عود کر آئی اور میں جھٹ سے چارپائی سے اٹھا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے ایک سایہ سا دیکھا جو کالے دھوئیں کی مانند تھا یوں کہہ لیں کہ دھوئیں کا بنا ہوا ایک جسم تھا جو نیچے صحن میں بھی گیا اور کمروں میں بھی، یہ دیکھ کر میں نے فٹ سے سوچا کہ ضرور یہ بھی کوئی بلا ہے جو میری تو دشمن ہو گی لیکن اگر اس نے میرے گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچایا تو۔؟ یہ سوچ آتے ہی میری پریشانی دوگنی ہو گئی اتنے میں وہ نیچے گیا تو میں نے اوپر سے جھانک کے دیکھا وہ سارے کمروں میں چکر لگا رہا تھا میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے کلاز آف ڈریگن کھولے تو ساتھ ہی وہ کسی کونے میں چھپ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا، میں پوزیشن لے کے کھڑا رہا کہ جیسے ہی وہ نظر آئے میں اسے کاٹ کر جلا دوں، بغور دیکھا تو وہ اس کمرے کے باہر نظر آ گیا جس میں ہم سارے بھائی سوتے تھے، میں نے بازو کھولے تو دیکھا وہ سایا اوپر کی طرف دیکھ کے کچھ پڑھنے لگا، جیسے جیسے اس کے ہونٹ ہل رہے تھے میں نے دیکھا کہ میرے برقی پنجے ختم ہو رہے تھے، میرے دیکھتے دیکھتے ہی میرے طاقتور پنجے تحلیل ہو گئے اور میں بالکل خالی ہاتھ ہو گیا، میں اسی پریشانی میں تھا کہ خیال آیا کہ میں اوپر ہوں اور نیچے یہ دشمن سایا کہیں میری ماں اور اور بہن بھائیوں کو نقصان نہ پہنچا دے، کوندے کی طرح یہ سوچ میرے ذہن میں آئی اور میں امی کو آوازیں دیتا سیڑھیوں سے نیچے چلا گیا، امی امی، کہاں ہیں آپ؟ سب لوگ کمروں میں جائیں اور دروازے بند کر لیں میرے بھائی اپنے کمرے میں کھیل رہے تھے لیکن امی کہیں بھی نظر نہ آئیں اور میں جب صحن میں گیا تو وہ سایا بھاگتا ہوا میری طرف آیا اور میرے جسم میں گھستا چلا گیا، میں ہوا میں تھوڑا سا بلند ہوا جیسے کسی نے دھکیلا ہو اور پاؤں ڈگمگانے سے میں گرا ساتھ اس کے بے ہوش ہو گیا۔

کسمسا کر آنکھیں کھولیں تو میں اپنے گھر کی چھت پہ تھا، چارپائی پہ بستر بچھا ہوا تھا اور میں اس بستر میں استراحت پر تھا، لیکن آنکھیں کھل کیوں نہیں رہیں تھیں۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں اندھا ہو گیا ہوں، پر کیوں؟ یہ معلوم نہ تھا، بس آنسو ہی آنسو تھے۔ میں پریشان ہو کر امی کو پکارنے لگا۔ مجھے نظر نہیں آ رہا امی کہاں ہیں آپ، امی امی۔ کبھی اللہ سے دعا کرتا۔ اے اللہ میری مدد کر، میں کیا کروں، اتنے

میں یاد آیا کہ امی کہا کرتی تھیں کہ جب کوئی مشکل پیش آئے تو اللہ کے ولیوں اور پیغمبروں کو پکارتے ہیں پھر اللہ انھیں مدد کے لیے بھیجتا ہے، مجھے مزار والے بابا گھمستان کا ہی پتہ تھا میں نے انکو پکارنا شروع کر دیا، ساتھ میں زار و قطار روتا جاتا تھا، تھوڑی دیر بعد مجھے گھر کے صحن سے بہن بھائیوں کی کلکاریاں سنائی دیں، میرا دل شدت غم سے پھٹنے کو تھا، یار ایسا بھی کیا کہ میں اتنے عرصے بعد بہن بھائیوں سے ملوں اور وہ بھی بینائی سے محروم، انھیں کتنا دکھ ہوگا، اللہ جی میری مدد کر، مجھے اس اندھیرے سے نکال، میں آہ وبکا کر رہا تھا کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا میں پارے کی طرح اچھلا کہ یہ کون ہوسکتا ہے۔ گھبراؤ نہیں بیٹا۔ میں تمھارا بابا گھمستان ہوں، میں شدید حیرت میں تھا، چیخ کر بولا، کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہاں بیٹا، جو تم نے سنا، میں بابا گھمستان ہی ہوں تمھاری مخالف قوتیں ہی تمھاری دشمن ہیں اور ان ہی نے تمھاری نظر بند کی ہے، بابا جی آپ یہاں کیسے، آپ۔ آپ کے مزار پہ تو ہم سب دعا کے لئے جاتے ہیں، آپ درگاہ سے یہاں کیسے آ گئے؟ آپ مجھے جانتے ہیں؟ میری باتوں کا جواب دینے کی بجائے انھوں نے میری آنکھوں پہ اپنا بابرکت ہاتھ پھیرا اور کچھ پڑھا، مجھے ایسا لگا کہ میری آنکھوں سے کالا سا کچھ نکل کر انکے ہاتھوں میں ہی جذب ہو رہا ہے، شاید وہ ہی دھواں جو میرے جسم میں گھس گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں میری نظر روشن ہوگئی پہلا منظر یہ ہی تھا کہ ایک باریش سبز چولے میں ملبوس بزرگ میرے سامنے بیٹھے مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے، میں اپنی آنکھیں ملنے لگا، میں دیکھ سکتا ہوں، مجھے نظر آ رہا ہے، میں تو باؤلا سا ہو رہا تھا، ان کے آنے سے پہلے ہر طرف کالا اندھیرا تھا لیکن ان کی برکت سے ماحول میں سفیدی سی گھل گئی، یوں جیسے کسی پہاڑی علاقے میں دھند کا راج ہوتا ہے اور ایک حد نگاہ سے آگے دیکھا نہیں جاتا ہاں بیٹا تم دیکھ سکتے ہو، کسی سے ذکر مت کرنا کہ میں تمھیں ملا تھا، اگر دوبارہ بھی ملنا ہے تو کسی کو بتانا نہیں ہے، میں نے اثبات میں سر ہلایا، اور تمھارا گریہ اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوگیا ہے، اسی لئے بحکم خدا میں تمھیں تمھاری بینائی لوٹانے آیا ہوں، لیکن۔ یہ ضرور یاد رکھنا کہ تمھیں بینائی تو مل گئی لیکن ایک آزمائش باقی ہے، بابا جی وہ

کیا؟ پہلے کم آزمائشیں آئی ہیں مجھ پہ؟ بس بیٹا آزمائش تو پھر ہے، تمھاری ضد اور گریہ سے تمھیں آنکھیں تو مل گئی ہیں لیکن زندگی بہت کٹھن گزرنے والی ہے، بس یہ ہی تقدیر میں آزمائش ہے کہ یا تو اپنی آنکھیں دو یا پھر آدھی سے زیادہ زندگی دکھوں اور پریشانیوں میں گزارو، گزار پاؤ گے؟ میں چپ رہا، اپنے اندر سے الجھتا رہا لیکن بہت جلدی فیصلے پہ پہنچ گیا، آنکھیں ہی چاہئیں بابا جی، میں آزمائش کے لئے تیار ہوں۔ تو ٹھیک ہے بیٹا جہاں بھی حق کے لئے تمھیں ہماری ضرورت پڑی ہم بحکم خدا تمھاری نصرت کے لئے ضرور پہنچیں گے، باتوں کے دوران انھوں نے مجھے بستر پر پیچھے کی طرف لٹا دیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب نیند سے بیدار ہوا اور خود کو صحیح معنوں میں اس جیتی جاگتی دنیا میں پایا تو دیکھا بابا جی جا چکے تھے، میں نے بستر پہ پڑے پڑے اپنی ساری کہانی پہ غور کیا جو کم از کم ایک سال کے برابر عرصے میں مکمل ہوئی تھی، میں نے چھت پہ بنے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کیلنڈر وہ ہی تاریخ بتا رہا تھا جس تاریخ کو میں سکول سے آکے دوپہر کا کھانا کھا کے نیچے کمرے میں ہوم ورک کرنے کے بعد سو گیا تھا، تو کیا میں نیچے سویا تھا؟ میں نے خود کلامی کی، پھر میں چھت پہ کیسے آیا اور وہ ساری کہانی۔؟ میں نے نائف آف گاڈ سے اتنے دشمن جن چڑیلیں ماری تھیں کیا وہ سب خواب تھا ۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا میں بھاگتا سیڑھیوں سے نیچے گیا زید بھائی کچن میں گھسا کچھ کھا رہا تھا، میں نے جا کر اس کے کندھے جھنجھوڑے زید یار ایک بات بتانی ہے، اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور کہا بک جلدی، دیکھتا نہیں چپس کھا رہا ہوں، میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے ساری بات بتائی اور وہ جواب میں مجھے گھورنے لگا، او خوابوں میں ہیرو بننے والے، زرا دن کے وقت کم سویا کر ، اتنا کہہ کے میرا مذاق بناتا ہوا وہ پاس سے اٹھ کے چلا گیا ، اس کے مذاق کا مجھ پہ اثر نہ ہوا اور میں اپنی پریشانی لے کر امی کے پاس چلا گیا، بیٹا اوپر چھت پہ اکیلے نہ سویا کرو ، کیونکہ اوپر پیپل کا سایہ پڑتا ہے اس پہ بزرگ رہتے ہیں، میری بات کے جواب میں ان کے پاس نصیحتوں کا پنڈورا باکس تھا جو کھل چکا تھا، لیکن امی میں تو نیچے سویا تھا اوپر کیسے پہنچ گیا؟ اپنی طرف سے میں نے ایک دھماکے دار بات کی تھی، چل پتر میں صبح ہوتے ہی تیرا صدقہ دیتی ہوں بڑے عجیب خواب دیکھتا ہے تو۔ انکے اس جواب نے میرا پاؤ خون جلا دیا۔ میں ڈرائنگ روم میں بھائی احد کے پاس چلا گیا، وہ کچھ سیانے تھے اور مسئلے کو جلدی سمجھ جاتے تھے ۔ میں نے حرف بہ حرف ساری کہانی انھیں کہہ سنائی اور بتایا کہ مجھے ایک ایک چیز اسی طرح یاد ہے جیسے کسی کو تھوڑی دیر پہلے ہونے والا کوئی واقعہ یاد ہو اور وہ دوسرے کو سنا رہا ہو ، میرے حواس خمسہ بھی بیدار تھے بھائی، پھر مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اگر نیچے سویا تھا جیسے کہ مجھے یاد ہے تو پھر اوپر سے کیسے جاگا ہوں، یہ سب حقیقت ہے میں انھیں وضاحت دے دے کر بتا رہا تھا کہ جیسے ان کے پاس ہی تو میرے مسئلے کا حل تھا، وہ پہلے سوچتے رہے پھر گویا ہوئے، علی بعض لوگوں کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے، ہو سکتا ہے تم بھی رات کو نیند میں چلتے ہو، اور ہم پر اب تمھاری بیماری آشکار ہوئی ہو، خیر اب ابو جی سے کہہ کے تمھارا علاج بھی شروع کراؤں گا اور آج تم ذہنی طور پہ بہت تھک چکے تھے، یا آرام کر لو نہیں تو میرے ساتھ چلو گیمز کھیلنے، میں کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ پتہ نہیں مجھ پہ یہ لوگ یقین کیوں نہیں کر رہے ؟ میں اندر ہی اندر اپنی سوچ میں گم تھا، میری خاموشی کی وجہ سے بھائی نے مجھے زبردستی اٹھایا اور باہر لے گئے، جب ہم گیمز کلب میں داخل ہوئے تو مجھے یاد آیا کہ میں تو گیمز کھیلنے کا بہت شوقین ہوں، میرا شوق عود کر آیا اور احد بھائی نے مجھے گیمز کے سامنے جا کھڑا کیا، نہ چاہتے ہوئے بھی میں تھوڑا بہت کھیلنے لگا، آخر دلچسپی بڑھی اور میں خوب جم کر کھیلنے لگا، کھیلتے ہوئے وقت کا احساس نہ رہا جب میں نے سر اٹھا کے کلاک دیکھا تو رات پوری طرح بھیگ چکی تھی، کلب بھی تقریباً خالی ہو گیا اور جب میں نے خود سے گھر جانے کا کہا تب بھائی احد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں باہر نکلے تو وہ مجھے گھر سے قریب ایک چائے خانہ میں لے آئے۔ جب چائے ہمارے سامنے آئی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے، علی۔ ہاں جی بھائی، میں نے گرم جوشی سے جواب دیا، آج گھر پہ تم نے جو کچھ بھی مجھے بتایا، وہ سب سوتے ہوئے دیکھا تھا ناں؟ میں مخمصے میں تھا، ہاں لیکن مجھے صرف یہ الجھن ہے کہ میں نیچے کمرے میں سویا

تھا تو پھر چھت پہ کیسے چلا گیا اگر یہ سب خواب تھا تو میرا سوتے میں چھت پہ پہنچ جانا کیا تھا، آپکو یاد ہے ناں کہ میں کمرے میں سویا تھا؟ میں نے بات کرتے کرتے بھائی سے سوال کیا۔ ہم۔ وہ پُر سوچ انداز میں محض ہنکارہ بھر کر رہ گئے، تھوڑی دیر ہم دونوں میں خاموشی چھائی رہی جو کہ مجھ پہ بہت گراں گزر رہی تھی، میں اپنی بات کو سچا ثابت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے مجھے نہیں پتہ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ علی میرے بھائی میں نے اچھی طرح سوچ بچار کی ہے تمھارے مسئلے پہ لیکن۔ کیا لیکن؟ انھوں نے ذرا سا توقف کیا تو میں بے صبری سے بول پڑا، مجھے تو یہ ہی لگتا ہے کہ یہ سب ایک خواب تھا اور شائد تمھیں آجکل نیند میں چلنے کی عادت ہے اس لئے تم چھت پہ جا سوئے، مجھ پہ اعتماد ہے تو مان جاؤ کہ وہ سب خواب تھا، سکول میں کسی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہو شاید اسلئے تمھیں اس قسم کے خواب آ رہے ہیں، خیر آخری بات یہ ہی ہے کہ تم پڑھائی میں بہت اچھے ہو اور ابو امی کو زید کی نسبت تم سے امیدیں زیادہ ہیں اس لئے ان فضولیات کو ذہن میں جگہ دینے کی بجائے پڑھائی پہ توجہ دو اور جو بھی پریشانی آئی اسے بھول جاؤ، اس کے بعد انھوں نے بات کرنے کی بجائے خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینی شروع کر دیں، اور میں واقعتاً اس نہج پہ سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے وہ سب وہم ہی ہو

......☆☆......

آہستہ آہستہ میں اس واقعہ کو بھلانے لگا، دوستوں اور گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا، ویڈیو گیمز پہ جاتا۔ کزنوں کے ساتھ مل کے عجیب عجیب شرارتیں کرتا اور اتنے رنگ برنگ جیون میں اس طرح کے واقعہ عموماً بھول جاتے ہیں یا پھر زندگی کی بھول بھلیوں میں کہیں دب ضرور جاتے ہیں۔ میرا ذہن احد بھائی نے چونکہ پکا کر دیا تھا اس لئے میں نے بھی مکمل خواب سمجھ کے بھلا دیا۔ آپ سب سوچ رہے ہوں گے کہ میری اصل زندگی میں فرزانہ کا کیا ہوا، تو ہوا یوں کہ اس سارے واقعہ کے بعد اگلے دن میں سکول گیا تو وہ بھی آئی ہوئی تھی، اس کا آنا عجب نہیں تھا بلکہ یہ عجیب تھا کہ مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہ ہوئی، بلکہ اجنبیت کا احساس جاگا اور ایسا جاگا کہ میں نے اسے نظر اٹھا کے دیکھنا پسند نہ کیا۔ سکول تو ویسے ہی چھوڑ دینا تھا ۔اس لئے میں نے اس میں اپنی بسی ہوئی دنیا خود تباہ کی اور نئی منزل کی تلاش میں نکل پڑا۔

......☆☆......

بہت برس بیتے۔ اس واقعہ کو میں بھول گیا، زندگی کی اور بہت سی مصروفیت تھی جس میں بچپن کی یہ سو کالڈ سی یاد کہاں ذہن میں رہتی، میں بھرپور جوان مرد بن گیا۔ پڑھائی مکمل کر کے ابھی فارغ ہی تھا اور فارغ ذہن کہتے ہیں شیطان کا گھر ہوتا ہے شاید اسی لئے مجھے پراسرار علوم سیکھنے کا شوق چُرایا۔ میں اور زید کئی عجیب و غریب کتابیں لا کر پڑھتے اور چلے تک کاٹتے، ہم شمع شبستان رضا کے کافی وظیفوں سے فیضیاب ہو چکے تھے، زید کا تو پتہ نہیں لیکن مجھے اپنے بارے میں ایسا لگتا کہ میں جو بھی سیکھتا تھا مجھے ڈبل انرجی سے سب حاصل ہوتا ہے۔

کئی بار مجھے اپنی پڑھائی کے دوران مئوکل تک ملے اور کئی بار ایسا ہوا کہ میری پڑھائی ختم کرانے کو کئی ڈراؤنے جن چڑیلیں مجھے ہراساں کرنے آتیں، میں اب ان چیزوں کا عادی ہو چلا تھا، لیکن خاصے کی چیز یہ ہے کہ میں جو کچھ بچپن میں بھول چکا تھا، اب شباب عمر میں اچانک سب کچھ یاد آ گیا، ایک دن بیٹھے بٹھائے میرے ذہن سے نہ جانے کیوں پردہ ہٹا اور مجھ پہ آہستہ آہستہ قلعی کھلنے لگی، میرے ساتھ کیا ہوا تھا مجھے کہاں لے جایا گیا میرے کلاز آف ڈریگن ہوتے تھے جن کی مدد سے میں نے بہت سے جنات کو بآسانی فی النار کیا تھا، میں چھت پہ کہاں پایا گیا مجھے کون سے بزرگ ملے میری آنکھیں ٹھیک ہوئیں اور میرا عقدہ جوں کا توں رہا۔ مجھے آج یہ سب کیوں یاد آ رہا ہے؟ میرے اللہ میرے ساتھ کیا یہ سب حقیقت میں وقوع پزیر ہوا تھا؟ اور اب تو بتا دے کہ میں کمرے میں سویا تھا تو چھت پہ مجھے کون لے گیا تھا، کیا کوئی جن، چڑیل یا کسی کا بھیجا ہوا مئوکل؟

ان ساری باتوں کے جواب مجھے وقت آنے پہ یقین تھا کہ حاصل ہو جائیں گے، لیکن آپ کی عقل کیا کہتی ہے۔ اسکا مجھے انتظار رہے گا۔

پچھتاوا

محمد شعیب

ان لمحوں کی روداد، جب پچھتاوے زندگی بھر کا روگ بن کر رہ جاتے ہیں‘ ہمارے اپنے معاشرے میں جنم لینے والی ایک کہانی کی روداد۔

کتنے سے ہے باقی، سانسیں اکھڑنے میں

آسمان پر بادل تھے یا پھر چمکتا ہوا سورج؟ روتا ہوا آسمان تھا یا پھر دہکتی ہوئی زمین؟ بیاباں جنگل تھا یا پھر تپتا ہوا صحرا؟ فلک بوس پہاڑ تھے یا پھر شاداب وادیاں؟ جنت کے پھول تھے یا پھر جہنم کے راستے؟ ان سب سے وہ بے نیاز تھا۔ پاؤں میں جوتے بھی تھے یا نہیں، گریبان کے بٹن بند تھے یا کھلے؟ آنکھیں بند تھیں یا کھلیں؟ وہ جاگ بھی رہا تھا یا نہیں؟ اس وقت اس کے لئے کچھ بھی اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ آنکھوں میں تیرتی نمی، خون کے آنسو روتا دل، مفلوج ہوتا ذہن، سماعت سے ٹکراتی آواز کا محور فقط ایک ذات تھی۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا جا رہا تھا۔ کبھی فٹ پاتھ پر تو کبھی سڑک کے عین وسط میں۔ ایک دو بار کار کے نیچے آنے سے بچا، لیکن اسے ہوش کہاں تھا؟ کار ڈرائیور نے اسے گالیاں دیں مگر اس کی سماعت تو کسی کے بھی الفاظ سننے سے قاصر تھی۔ بلکتے ہوئے ہونٹ، بہتی ہوئی آنکھیں جلد سے جلد اس وجود کے پاس جانا چاہتی تھیں جس کے بارے میں اسے علم اپنی آخری کلاس میں ہوا تھا۔ اُس وقت میتھ کا پیریڈ چل رہا تھا جب سر انور کلاس میں آئے اور حمزہ کی طرف بڑھے۔ وہ بغور میتھ کا لیکچر نوٹ کر رہا تھا۔

''حمزہ، اسپتال سے فون آیا ہے، تمہاری والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔'' یہ سننے کی دیر تھی کہ اس نے نہ کاپی کی پروا کی اور نہ ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ کی۔ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کر اسپتال کا رخ کیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ جانے اس کی امی جان کی طبیعت کیسی ہوگی؟ کس حالت میں ہونگی؟ پیچھے سے اس کے دوست نے اسے آواز بھی دی مگر وہ سننے سے قاصر رہا۔ جھٹکے سے کلاس کا دروازہ کھولا اور آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ سر انور کو احساس ہوا کہ انہیں یہ خبر ایسے حمزہ کو نہیں دینی چاہیے تھی مگر وہ بھی مجبور تھے۔ حمزہ کی والدہ کی طبیعت بہت ہی زیادہ خراب تھی اور ایسے میں اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو شاید۔

وہ اسپتال کے صدر دروازے پر تھا۔ جب اس نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ بالوں سے گرتی پسینے کی بوندیں کسی کھلے ہوئے نل کی مشابہہ تھیں۔ آنکھوں کے آنسو بھی ان میں ضم ہو کر رہ گئے۔ وہ یہاں دو سیکنڈ کے لئے رکا تھا کیونکہ اس کی منزل یہ نہیں تھی۔ اسے تو اندر جانا تھا۔ اپنی امی کے پاس۔۔۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے اندر بھاگا۔ کسی نے یوں بھاگنے کا جواز نہ پوچھا، پوچھ کر بھی کوئی کیا کرتا؟ یہ جگہ ہی ایسی تھی جہاں دیوانہ وار بھاگنے کا سبب تقریباً سبھی کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ سیدھا ڈاکٹر سجاد کے کیبن کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی وہ کئی لوگوں سے ٹکرایا تھا لیکن اس میں بھلا اس کا کیا قصور تھا؟ جب حواس انسان کے بس سے باہر ہوں تو جسم تو یوں رُلتا پھرتا ہے۔ جب وہ ذات جس سے آپ کو اپنی جان سے زیادہ محبت ہو، زندگی اور موت کی کشمکش میں اپنی آخری سانسیں لے رہی ہو، پھر بھلا حواس کو اپنے قابو میں رکھنا شاید ناممکن ہے۔ اس نے ایک جھٹکے سے ڈاکٹر سجاد کے کیبن کا دروازہ کھولا تھا۔

''انکل۔۔۔امی کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر سجاد نے ایک نظر اس کی طرف دوڑائی اور پھر اپنے سامنے بیٹھے مریض کو ایک پرچی تھمائی۔

''یہ انجکشن میڈیکل اسٹور سے لے آئیں۔۔'' ڈاکٹر



سجاد کے کہنے پر وہ شخص اٹھا اور کیبن کے دروازے کی مڑا۔ اُس نے قابل رحم نگاہ حمزہ کے وجود پر ڈالی اور پھر کیبن سے باہر چل دیا۔ ڈاکٹر سجاد نے ناک پر عینک کو سیدھا کیا اور پھر ہاتھ بڑھا کر حمزہ کو بیٹھنے کو کہا۔

''آؤ۔۔ یہاں بیٹھو۔۔۔'' وہ اس کے یوں دفعتہً کیبن کا دروازہ کھولنے پر اگرچہ ایک لمحے کے لئے غصہ ہوئے تھے مگر زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ شاید بچہ سمجھ کر ٹال گئے تھے۔

''نہیں انکل۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے بتائیں امی کہاں ہیں؟ اور کیسی ہیں؟'' وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور بیٹھنے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹر سجاد نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور رولنگ چیئر کو گھماتے ہوئے کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی رکھے جگ سے پانی کانچ کے گلاس میں انڈیلا اور گلاس کو داہنے ہاتھ میں پکڑ کر حمزہ کے پاس گئے۔

''تمہاری امی کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔۔۔ چلو اب بیٹھ کر یہاں آرام سے پانی پیو۔۔۔'' انہوں نے زبردستی اس کو بازو سے پکڑا اور کرسی پر بٹھا کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ پانی پینا نہیں چاہتا تھا مگر ڈاکٹر سجاد نے زبردستی اسے دو گھونٹ پینے پر مجبور کیا تھا۔

''مجھے امی کے پاس لے چلیں؟ کس وارڈ میں ہیں وہ؟'' اس نے گلاس کو ٹیبل پر رکھا اور گلوگیر لہجے میں کہا

''حمزہ۔۔۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی طبیعت اب سنبھل چکی ہے، میں نے ان کو نیند کا انجکشن دیا ہے، اب وہ آرام کر رہی ہیں۔۔۔'' یہ سننے کے بعد حمزہ کی جان میں جیسے جان آئی تھی۔ اس نے ڈھیلے وجود کو کرسی کی ٹیک سے لگایا تو ایک مزید آنسو پلکوں سے رخسار پر لڑھک گیا۔ ڈاکٹر سجاد نے ایک لمحے تک تو اس کی حالت کو سنبھلنے کا موقع دیا اور پھر اس کے ساتھ والی کرسی کو کھسکا کر آگے کیا اور پیار سے کہا

''دیکھو حمزہ۔۔۔ تم اپنی امی کی بیماری کے بارے میں بخوبی جانتے ہو۔ ایسی حالت میں ان کا اکیلے رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ تو بھلا ہو تمہارے پڑوسی کا جو بروقت انہیں

اسپتال لے آئے۔" ڈاکٹر سجاد کے الفاظ اس کی روح میں اترنے لگے تھے۔ اس کا دل پہلے کی طرح بے قرار ہونے لگا۔

"انکل۔۔۔ آپ ہی سمجھائیں پھر امی کو۔۔۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ وہ یہاں ایڈمٹ ہوکر اپنا علاج کروائیں مگر۔۔۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ اس کے لفظ اس کے درد کے ترجمان تھے۔

"بات یہ نہیں ہے حمزہ کہ وہ یہاں ایڈمٹ ہوں۔۔۔ اور پھر کینسر تو ان کے پورے منہ میں پھیل چکا ہے۔ ایسے میں زندگی کی کتنی امید ہے؟ تم جانتے ہو" انہوں نے اپنی آنکھیں چرالیں۔ جس نے حمزہ کے بجھے ہوئے دل پر انگاروں کا کام کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو جدائی کی آگ میں جلتا ہوا محسوس کرسکتا تھا۔ آنکھوں نے ایک لمحہ بھی نہ لگایا، بھر آنے میں۔۔۔

"دیکھو۔۔۔ تمہیں گھر میں ہروقت ان کے پاس رہنا ہوگا۔ ان کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی پڑھائی چھوڑ کر اپنی والدہ کی تیمارداری کرتے رہو لیکن تمہارے بھائی بھابھی تو ہیں ناں۔۔۔ ان سے کہو کہ ان کا خیال رکھیں۔ انہیں ہروقت توجہ کی ضرورت ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں۔۔۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ان کو سہل بنانے کی کوشش کرو تم۔۔۔ آگے جو تمہیں ٹھیک لگے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور واپس اپنی رولنگ چیئر پر جا بیٹھے۔ حمزہ ایک لمحے تک ان کے الفاظ میں ہی کھویا رہا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی اس قدر بھرمار ہوگئی کہ سب کچھ دھندلا سا گیا تھا۔ کچھ بھی نظر آنے سے قاصر تھا۔

"امی۔۔۔" دکھے دل نے فقط ایک رشتہ ہی پکارا تھا۔

☆☆☆

"امی آرام سے۔۔۔" وہ بڑے ہی مہربان ہاتھوں سے امی جان کو لٹا رہا تھا۔ امی جان کی حالت اس وقت بھی بہت نازک تھی۔ درد سے سر پھٹا جارہا تھا۔ کراہتے ہوئے انہوں نے اپنا سر سرہانے رکھا اور داہنے ہاتھ کو ماتھے کی طرف بڑھایا تھا۔ حمزہ نے پنڈلیوں سے کھیس اٹھایا اور انہیں اڑادیا

"دکھایئے۔۔۔ میں دبا دیتا ہوں۔۔" اس نے امی جان کے ہاتھوں کو دھیرے سے پیچھے کیا اور خود ان کا سر دبانے لگا۔

"ذرا زور سے۔۔۔" ان کا سر اس قدر بوجھل ہوچکا تھا کہ ہلکے ہاتھوں سے درد کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب سے کینسر اپنی تمام حدیں پار کرچکا تھا تب سے وہ اپنے سر کو دباتی رہتیں۔ جب بھی حمزہ ان کو اپنے سر پر ہاتھ رکھے دیکھتا تو اپنے کام کاج چھوڑ کر ان کے سر کو دبانے لگتا۔ گھر میں وہ فقط اکیلا ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کا بھائی ساجد اور بھابھی ریحانہ بھی اسی گھر میں رہتے تھے مگر انہیں بھلا امی جان کی کہاں فکر تھی۔ یوں تو شادی سے پہلے بھی ساجد گھر سے غافل رہتا تھا اور پھر بیوی بھی سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ جس دن سے گھر میں قدم رکھا مجال ہے، امی جان کے کسی کام کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ مکان کے نیچے والا حصہ امی جان اور حمزہ کا تھا۔ جبکہ بالائی حصہ میں ساجد رہتا تھا۔ ایک گھر میں دو چولہے جلتے تھے مگر امی جان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاید ایک ماں کے نزدیک بس اپنے بچے کی خوشی ہی عزیز ہوتی ہے مگر حمزہ۔۔۔ اس کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ وہ امی جان کو بیماری کی حالت میں یوں گھر کا کام کرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں جو گھر کے کام کاج میں امی جان کا ہاتھ بٹاتی۔ یوں بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے گھر کی باگ دوڑ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ حمزہ کی تمام تر ذمہ داریاں وہ آج بھی ایسے ہی نبھارہی تھیں جیسے کہ ہمیشہ نبھاتی تھیں۔

"اچھا ساجد۔۔۔ کل پھر ہم ادھر ہی شاپنگ کرنے چلیں گے۔۔" دروازے کے قریب سے ہی ریحانہ کی آواز آئی تھی۔ حمزہ نے امی جان کا سر دباتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو ان دونوں کو ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوتا دیکھا۔ پہلے تو وہ خاموش رہا کہ شاید وہ ان کے پاس آجائے لیکن جب وہ حمزہ اور امی جان کی موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو حمزہ گویا ہوا

"ساجد بھائی۔۔۔" حمزہ کی آواز پر دونوں رک گئے۔ امی جان نے حمزہ کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا تھا۔ شاید وہ جانتی تھیں کہ وہ کیا کہنے جارہا تھا لیکن اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور چارپائی سے اٹھ کر ان کے قریب ہولیا۔ وہ دونوں بھی امی جان کی چارپائی کے قریب آچکے تھے۔

مکان زیادہ بڑا تو تھا نہیں جو قریب آنے میں وقت لگتا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی چار قدم کی راہداری تھی اور پھر ایک بڑا سا ہال، جسے چاہے تو کمرہ کہہ لیا جائے یا پھر ٹی وی لاؤنج۔ دائیں جانب ایک چھوٹا سا ڈربہ نما کمرہ تھا۔ جس میں حمزہ کا کچھ سامان تھا۔ ایسا ہی حال بالائی منزل کا تھا۔

''کیا ہوا؟ کچھ کہنا تھا؟'' ساجد نے پوچھا تھا۔

''اگر پیسے چاہئیں تو معاف کرنا حمزہ۔۔ ہم ابھی ابھی شاپنگ کر کے آئے ہیں۔ پیسے تو سارے ختم ہو گئے۔۔'' ریحانہ نے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''بے فکر رہیں بھابھی۔۔ میں آپ سے پیسے نہیں مانگ رہا۔۔۔ اور بھائی آپ۔۔۔ کیا آپ کو امی جان کی ذرا بھی فکر نہیں ہے؟ آپ ان کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟ آپ کو معلوم بھی ہے؟ آپ لوگوں کے جانے کے بعد ان کی طبیعت کس قدر بگڑ چکی تھی؟ اسپتال لے کر گئے تھے انہیں انکل۔۔۔ مجھے بھی ایمرجنسی میں کالج سے آنا پڑا۔۔۔'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا لیکن اُن کے چہروں سے بیزاریت واضح تھی۔

''تو پھر۔۔۔'' ساجد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو حمزہ کا جیسے بھرم ٹوٹ گیا۔ امی جان درد سے کراہتے ہوئے حمزہ کو خاموش رہنے کا کہہ رہی تھیں مگر وہ شاید ان کی دھیمی آواز سن ہی نہ سکا تھا۔

''تو پھر سے کیا مطلب ہے آپ کا ساجد بھائی؟ ماں ہے آپ کی یہ؟ کیا ان کا خیال رکھنا آپ کا فرض نہیں بنتا؟'' اس نے ضرب لگانے کی کوشش کی تھی مگر جس کا دل جذبات سے عاری ہو وہاں ایک ضرب بھلا کہاں اثر کرتی ہے۔ ایسے دل جب تک پہاڑ سے گر کر کرچی کرچی نہ ہو جائیں جذبات کی شدت کو محسوس نہیں کر سکتے۔۔

''حمزہ۔۔ پلیز۔۔ اب پھر سے شروع مت ہو جانا۔۔ اب ہم سارا دن ان کے پاس تو بیٹھنے سے رہے۔۔ ہماری بھی زندگی ہے۔ ہماری بھی ضروریات ہیں۔ اگر ہم ان کی تیمارداری کرتے رہے تو گزر گئی ہماری زندگی۔۔'' انتہائی سفاکیت کے ساتھ ریحانہ نے کہا تھا۔

''بھابھی۔۔!!'' ہمیشہ کی طرح ریحانہ نے اس کے جذبات کو کرچی کرچی کر دیا۔ وہ یک ٹک ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں ذرا بھی شرمندگی کے آثار نہ تھے۔

''صحیح تو کہا ہے تمہاری بھابھی نے۔۔۔ اب ساری عمر انسان ایک جیسا تو رہتا نہیں۔۔ عمر کے اس حصے میں بیماریاں تو حملہ کرتی ہیں۔۔'' ساجد کے اس جملے نے جہاں حمزہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی وہیں امی جان کے دکھے دل میں بھی ایک بھونچال برپا کر دیا۔ دکھ و درد میں گندھے ہوئے آنسو یکے بعد دیگرے بہتے چلے گئے۔ امی جان نے پلکیں جھپک کر حالات سے منہ موڑنا چاہا تو حمزہ بھی بے یقینی کے ساتھ ساجد کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اسے تو جیسے کئی لمحے اس جملے پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔

''اور اگر تمہیں زیادہ ہی فکر ہے اپنی ماں کی تو تم خود کیوں نہیں دیکھ بھال کر لیتے ان کی۔۔۔ خود تو سارا سارا دن کالج اور ٹیوشن سنٹر میں گزارتے ہو اور پھر گھر لوٹتے ہی ہم پر برسنا شروع ہو جاتے ہو۔۔'' ریحانہ نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس پر حمزہ کا بکھرا وجود قدرے سنبھلا تھا۔

''اب یہی۔۔ کروں گا۔۔ میں۔۔'' اس نے آنسوؤں کا ایک غول اپنے حلق میں ہی پیا تھا۔

''مجھے اپنی ماں کے لئے کسی باہر والے کی دیکھ بھال کی بھی ضرورت نہیں ہے۔۔'' اس جملے پر ریحانہ کو جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے دہکتی ہوئی آنکھوں سے حمزہ کی طرف دیکھا مگر ان نظروں کی بھلا اسے کہاں پروا تھی؟ جو آنکھیں امی جان کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر ہوں ان نظروں کے لئے اس کے دل میں بھی کوئی جگہ نہ تھی۔

''چلو۔۔ ساجد یہاں سے۔۔۔'' اس نے مضبوطی کے ساتھ ساجد کا دائیاں بازو پکڑا اور گردن جھٹکتے ہوئے وہاں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ساجد نے بھی پلٹ کر نہ دیکھا اور کہنے کے باوجود امی جان کی خیریت دریافت کرنا بھی جیسے اپنی شان میں گستاخی تصور کیا تھا۔ وہ ڈھیلے جسم کے ساتھ امی جان کی چارپائی پر جیسے لڑھک سا گیا تھا۔

''بیٹا! یہ کیا کہا تُو نے ساجد سے۔۔۔'' درد میں کراہتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''ٹھیک کہا میں نے۔۔۔ مجھے اپنی پڑھائی سے زیادہ

آپ کی صحت عزیز ہے۔کل سے میں نے کالج نہیں جانا اور نہ ہی ٹیوشن سینٹر۔۔اگر اللہ ایک در بند کرتا ہے تو سو کھولتا بھی ہے۔۔دیکھنا پیسوں کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بن جائے گا۔۔" اپنی چمکتی پلکوں کو بائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔اسے کالج یا ٹیوشن سینٹر کے چھوڑنے کا غم نہیں تھا اگر کوئی بات اسے پریشان کئے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتے سے بند ہونے والے پیسے تھے۔ساجد تو مہینے بھر کے بعد پانچ ہزار ہاتھ میں ٹکا دیتا، باقی کے اخراجات امی جان خود پورا کرتی تھیں۔کہاں سے اور کیسے؟ کبھی بھنک تک ہی نہیں پڑنے دی۔شاید ماں کے ہاتھوں میں برکت تھی۔جو پانچ ہزار بھی کافی ہو جایا کرتے تھے لیکن پڑھائی کا خرچ کم نہ تھا اور وہ اس کا بوجھ بھی امی جان کے نازک کندھوں پر ڈالنے سے اجتناب کرتا رہا۔خود ٹیوشن سینٹر میں انور صاحب سے کہہ کر بات چلائی اور جب بات پکی ہوگئی تو اس قدر آمدن میں اضافہ ہوگیا کہ وہ نہ صرف اپنا خرچ خود اٹھالیا کرتا تھا بلکہ امی جان کے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ پیسے دے دیا کرتا تھا۔لیکن اب ایک بار پھر وہ مکمل طور پر ساجد بھائی کے رحم و کرم پر ہوگیا تھا۔

"لیکن بیٹا۔۔" امی جان حمزہ کے پڑھائی چھوڑنے کے قطعاً حق میں نہ تھیں۔تبھی اس حالت میں بھی احتجاج کرنا چاہا تھا

"امی۔۔۔آپ فکر نہ کریں۔۔۔میری پڑھائی کا نقصان نہیں ہوگا۔ویسے بھی سلیبس تو مکمل ہو ہی چکا ہے۔میں تو بس وقت سے پہلے ہی کالج سے فری ہو رہا ہوں۔۔"

اس نے امی جان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر نرمی سے کہا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ امی جان یہ محسوس کریں کہ وہ فقط ان کی خاطر کالج نہیں جا رہا لیکن ماں تو آخر ماں ہی ہوتی ہے۔سب سمجھتی تھی۔آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔شاید حمزہ بھی اس پانی کی حقیقت کو سمجھ چکا تھا۔تبھی گردن کو جھکا لیا۔امی جان نے ایک گہری نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی تھی۔دکھے دل سے بس دعا ہی نکل رہی تھی مگر لفظوں کے سانچے میں ڈھلنے سے عاری تھی۔ایک آنسو انجان راستے سے رخسار پر لڑھک گیا تو انہوں نے اپنی گردن دوسرے رخ پھیر لی۔

"امی۔۔ میں ابھی آپ کے لئے چاول ابالتا ہوں۔۔" حمزہ نے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔اٹھتے ہوئے اس کے قدموں میں لرزش تھی جسے امی جان اپنا چہرہ دوسرے رخ ہونے کے باوجود دیکھ سکتی تھیں مگر مجبور تھیں۔سوائے ہونٹوں کو دبا کر اپنے درد کو دل میں چھپانے کے اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟

☆☆☆

"ہاں امی۔۔۔بس کیا کروں۔۔۔جب سے اس گھر میں آئی ہوں۔۔ان کے ڈرامے ہی دیکھ رہی ہوں۔کبھی امی جان کو یہ ہوگیا تو کبھی امی جان کو وہ ہوگیا۔بھلا اب میرے کان یہی سننے کو رہ گئے ہیں؟" وہ موبائل پر بات کرتے ہوئے بے رخی سے اپنا دکھڑا رو رہی تھی۔

"تو میں نے بھی کتنی بار کہا ہے کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ و اور یہاں آکر ہمارے پاس رہنے لگ جاؤ۔۔" موبائل سے آواز آئی تھی

"چاہتی تو میں بھی یہی ہوں مگر آپ تو جانتی ہیں کہ ساجد اس بات کے لئے کبھی رضامند نہیں ہونگے۔۔وہ لاکھ میرے حمایتی سہی مگر ٹھہرے تو اس گھر کے بیٹے ہی۔۔" وہ گردن جھٹکتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھی تھی اور سامنے ڈریسنگ کے آئینے میں ایک جھلک خود کا عکس دیکھا

"ابھی تو تم نے کہا کہ وہ تمہاری ہر بات مانتا ہے تو ایسا کرو۔۔اس پر زور ڈالو۔۔اسے کہو کہ اگر اس نے اپنی زندگی سنوارنی ہے تو اپنی ماں اور اپنے بھائی کو چھوڑنا ہوگا ورنہ ساری عمر بلاوجہ کی کفالت اس کے سر پڑ جائے گی۔تمہارے بقول اب تو اس نے ٹیوشن سینٹر جانے سے بھی انکار کر دیا ہے،ایسے میں بھلا سارے خرچے آ پڑے ناں ساجد کے سر۔۔۔اب وہ اپنا گزارا کرے یا پھر ان پر لٹاتا پھرے؟" ریحانہ کی امی کی باتیں بھی اس کے دماغ میں پڑے فتور کا سبب تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔کرتی ہوں پھر میں ساجد سے بات۔۔۔" اس نے جیسے باتوں کا اثر لینا قبول کر لیا تھا

"بات کرنی ہی نہیں ہے بلکہ تم نے اس پر پریشر ڈالنا ہے۔۔اسے کسی بھی طرح ہمارے ساتھ رہنے پر راضی کرنا ہے۔" دوسری طرف سے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔

"جی امی۔۔ میں پوری کوشش کروں گی۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے کہا تھا اور پھر فون بند کر کے بیڈ پر آ بیٹھی۔ کچھ کمحے یونہی سوچوں کی دنیا میں گزارنے کے بعد اس نے دل میں کہا

"میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ ساجد کو یہ بات سمجھنا ہوگی۔۔"

☆☆☆

"ساجد آج امی کا فون آیا تھا۔۔" رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ساجد کے ساتھ پلنگ پر آ بیٹھی تھی۔ جو اس وقت نیوز چینل دیکھنے میں مصروف تھا۔

"آہاں۔۔۔ تو کیا کہا انہوں نے؟" اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا تھا۔ ریحانہ نے لحاف کو جھاڑ کر سیدھا کیا اور بات کو طول دیتے ہوئے اپنی منشا بتانا چاہی۔

"کچھ خاص تو نہیں کہا۔۔ بس ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، امی جان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا اور پھر۔۔۔" دانستہ اس نے بات کو ادھورا چھوڑا تو اس نے سرسری طور پر ریحانہ پر ایک نظر دوڑائی جو کسی کشمکش میں تھی۔ ریموٹ سے اس نے آواز میوٹ کی اور اپنے چہرے کا رخ ریحانہ کی طرف کرتے ہوئے کہا

"کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔۔ کوئی بات ہے۔۔؟"

"نہیں ساجد۔۔ کوئی خاص بات نہیں، بس امی کی بات یاد آ گئی۔۔" اس نے ایک جھٹکے سے چہرے کے سامنے آئے بالوں کو پیچھے دھکیلا اور کروٹ لے کر لیٹنا چاہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ساجد جواز جانے بغیر نہیں رہے گا۔ آخر اتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے ساجد کے ساتھ رہتے ہوئے۔ بیوی ہونے کے ناتے وہ اس کی ہر کمزوری سے آشنا تھی۔ اس کی ایک ایک خصلت ریحانہ کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔

"کیا بات۔۔ بتاؤ مجھے۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے ریحانہ کا ہاتھ تھاما تھا

"وہ امی کہہ رہی تھیں کہ ہم دونوں ان کے پاس آ کر رہیں۔۔۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ اس بات پر اگرچہ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر نمایاں ہوئے مگر وہ اپنے جذبات کو ضبط کر گیا

"ریحانہ۔۔۔ میں نے پہلے بھی کتنی بار تم سے کہا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اپنے سسرال جا کر رہوں۔۔۔ نہیں۔۔ کبھی نہیں۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں انکار کر دیا

"ساجد۔۔ ایک تو مجھے سمجھ نہیں آتی۔۔ کہ آپ کے ذہن میں ایسا خیال ہی کیوں آتا ہے؟ ایک طرف تو آپ میرے والدین کو اپنے ماں باپ کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے پاس رہنے سے بھی کتراتے ہیں۔۔" ریحانہ کے لہجے میں ذرا تلخی آ گئی۔

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو ریحانہ۔۔ میں تمہارے والدین کی عزت کرتا ہوں مگر ان کے پاس جا کر رہنا۔۔۔ یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے اپنی گردن دوسرے رخ پھیر لی

"کیوں ممکن نہیں ہے؟ سب کچھ ممکن ہے، بس انسان کا ارادہ ہونا چاہیے۔۔" یہ کہنے کے بعد کمرے میں ایک لمحے کے لئے گہری خاموشی چھائی رہی اور ریحانہ مبہوت ساجد کو گھورتی رہی جو اس بات سے انجان نہ تھا۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا دل نہیں چاہتا اپنی ماں اور بھائی کو چھوڑنے کو۔۔" اس نے طنز کیا تو ساجد کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

"اب ان سب میں امی اور حمزہ کہاں سے آ گئے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا تھا

"یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔۔ آخر کب تک ان دونوں کی خاطر آپ اس گھر میں گلتے سڑتے رہیں گے۔۔ یہ مت بھولیے اگر آپ وہاں امی ابو کے پاس جاتے ہیں تو ایک اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔۔ ورنہ کرتے رہیے دو ٹکے کی نوکری۔۔ ہنوں۔۔" وہ اپنا غصہ الفاظ کے روپ میں نکال کر دوسرے رخ کروٹ لے کر لیٹ گئی جبکہ وہ ابھی تک اس کی حالت کو دیکھتا رہا۔ کچھ ثانیے ریحانہ کے الفاظ اس کی سماعت کا حصہ بنتے رہے اور پھر وہ بھی دوسرے رخ کروٹ کر کے لیٹ گیا۔

☆☆☆

حمزہ امی کے سرہانے بیٹھا ان کا سر دبا رہا تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھوں میں غنودگی چھائی ہوئی تھی مگر وہ بار بار سر کو جھٹکتا اور امی جان کی تکلیف کو کم کرنے کی اپنے تئیں سعی کر

رہا تھا۔ سر دباتے ہوئے اس کی نگاہ بار بار باہر کے کھلے دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جو ساجد اور ریحانہ کے انتظار میں کھلا تھا۔ وہ دونوں سر شام ہی باہر نکل کھڑے ہوئے اور رات کے ہوجانے تک نہ لوٹے تھے۔

''بھائی۔۔ آپ اتنے سنگ دل کب سے ہوگئے؟ کیا آپ کو امی جان کی طبیعت کا ذرا بھی احساس نہیں ہے؟ ان کی تکلیف، ان کی بیماری آپ کو نظر نہیں آتی؟ میری نہ سہی کم سے کم امی کی ہی پروا کرلیں۔۔۔'' اس کا خفا دل گلے شکوے کر رہا تھا۔ چہرے کے تاثر میں انتہا کی بے چینی تھی۔ امی جان نے کروٹ بدلی تو وہ ذرا سیدھا ہوا مگر وہ ابھی تک آنکھیں موندے ہوئے تھیں۔

''ساجد اور ریحانہ آگئے؟'' حالت خوابیدگی میں ہی سوال کیا تھا

''جی امی۔۔۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی اور دوسری باہر کے دروازے پر۔ گھڑی نے رات کے نو بجانے کی نوید سنادی مگر اُن کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔

''اچھا ہوا، وہ آگئے۔۔ جا کر ذرا اُن سے پوچھ۔۔ کھانا تو کھالیا ناں۔۔ انہوں نے؟'' ماں حالت خواب میں بھی اپنے بچوں کے لئے فکر مند تھی

''جی امی۔۔ کھالیا انہوں نے کھانا۔۔ بس وہ اب اپنے کمرے میں سو رہے ہیں'' اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ دل بھر آیا تھا مگر لفظوں میں لرزش نہ آنے دی۔ ہاتھوں میں بھی اب دبانے کی سکت باقی نہ رہی۔ کھیس کو امی جان پر اوڑھایا اور پھر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

کالج سے منہ کیا موڑا، اسے کتاب کھولنا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ دن بھر امی جان کی خدمت کرتا اور پھر شام کو بمشکل وقت نکال کر ٹیوشن پڑھاتا تاکہ گھر کا سرکٹ آسانی سے چل سکے مگر دو سے تین گھنٹوں میں وہ کتنا کما سکتا تھا؟ دوسری طرف ساجد نے بھی ریحانہ کے کہنے پر اپنے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ امی جان کی دوائی کا خرچہ بھی بلال اپنے دوستوں سے ادھار مانگ کر پورا کررہا تھا۔

''یہ پانچ سو...... اس سے تو صرف ایک ہفتے کی دوا آئے گی؟'' وہ دیوار کی طرف منہ کیے پیسے گن رہا تھا۔ چہرہ مایوسی کے جنگل میں مکمل طور پر کھو چکا تھا۔ پیشانی پر سلوٹیں ایسی کہ دیکھنے والا فی الفور اس کی پریشانی کا اندازہ لگالے مگر اپنے ہو کر اپنے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

''کیا ہم سے چھپا کر رکھ رہے ہو؟'' ریحانہ نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا تھا۔

''کک کچھ نہیں...... اس نے پیسوں کو اپنی جینز میں اڑسنا چاہا مگر جلد بازی میں وہ زمین پر جا گرے۔ ریحانہ کی نظر ان پیسوں پر گئی تو اسے جیسے بولنے کا موقع مل گیا۔ اتفاق سے وہاں پر ساجد بھی آچکا تھا۔

''واہ بھئی واہ...... اب تو ہم سے جھوٹ بھی بولے جانے لگے۔ دیکھ رہے ہو تم ساجد...... تمہارا بھائی! اب تم سے جھوٹ بھی بولنے لگ گیا۔ صبح کیا کہہ رہا تھا کہ پیسے دے دو۔ اس کے پاس پیسے ختم ہو چکے ہیں۔ اب دیکھو پانچ سو کا نیا نوٹ مجھ سے چھپا کر جیب میں رکھ رہا تھا۔'' کڑک لہجے میں وہ ایک کے بعد ایک الزام لگائے جا رہی تھی۔

''نن...... نہیں بھابھی۔'' اس نے نفی کرنا چاہی تھی مگر ریحانہ نے اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔ امی جان جو ابھی آرام کے لیے لیٹی تھیں۔ وہ بھی اٹھ بیٹھیں۔

''نہیں...... نہیں کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں امی جان کا بہانہ بنا کر اپنے عیش کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔'' ساجد کی بے یقین نگاہیں بھی اب حمزہ کا تعاقب کررہی تھیں۔

''نہیں...... بیٹا...... بات...... یہ...... نہیں...... ہے۔'' امی جان نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر درد کے سبب بولا نہ گیا۔

''بس...... بس امی! آپ کتنا اس کا ساتھ دیں گی؟ میرا شوہر حرام نہیں کماتا جو آپ پر لٹاتا پھرے۔'' وہ ہاتھ گھما گھما کر تلخ الفاظ سے حملہ کر رہی تھی۔

''بھابھی...... یہ پیسے میں نے دوست سے ادھار لیے ہیں۔'' اس نے بمشکل اپنے الفاظ گلوگیر لہجے میں مکمل کیے تھے۔

''جھوٹ کم بولو حمزہ...... مان لیا تم نے اپنے دوست سے ادھار لیے تھے تو تم مجھے دیکھ کر بوکھلا کیوں گئے؟ کیوں

مجھے دیکھ کر ان پیسوں کو چھپانا چاہا تھا؟'' اس کی گھورتی آنکھوں کے آگے وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا تھا۔ بھلا آج تک کسی بے بس انسان نے اپنی بے بسی کا رونا کسی سنگ دل کے آگے رویا ہے؟

''اب تو اپنی آنکھیں کھولو ساجد...... دیکھو اپنے بھائی کی حقیقت۔ اگر تم مزید یہاں رہے تو یہ بھائی تمہیں کنگلا کر دے گا۔ ایک ٹکا بھی تمہارے پاس نہیں رہنے دے گا۔ صبح تک اس کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور چند گھنٹوں میں آخر کس دوست نے اس پر اتنا بڑا احسان کر دیا جو پانچ سو روپے ایک منٹ میں دے دیے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کہیں اس نے ہمارے کمرے سے ہی چوری نہ کیے ہوں۔'' وہ ساجد کے پاس آ کر اپنی انگل کے بل بوتے پر من گھڑت کہانی بن رہی تھی۔

''بھابھی...... الزام لگانا بند کرو آپ۔'' وہ اب خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی اونچی آواز نے امی جان کی طبیعت کو متاثر کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر تیزی سے دبانے لگیں۔ حمزہ نے یہ حالت دیکھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور امی جان کو سہارا دیتے ہوئے انہیں لٹایا۔

''امی آپ آرام کریں۔ ٹینشن مت لیں آپ۔'' گلوگیر لہجے میں وہ انہیں حوصلہ دے رہا تھا۔

''الزام میں لگا رہی ہوں...... میں......؟ دیکھا آپ نے ساجد کیسے بدتمیزی کر رہا ہے یہ میرے ساتھ؟'' وہ مزید پھیل چکی تھی۔

''میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہا تھا بلکہ آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''اس کا مطلب میں جھوٹی ہوں...... اب آپ جو مرضی کہیں ساجد، میں اس گھر میں ایک گھڑی بھی نہیں رک سکتی۔ آپ کو رہنا ہے تو رہیں، میں جا رہی ہوں اپنی امی کے گھر۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چل دی تھی۔

''بھائی......!'' ریحانہ کے جانے کے بعد اس نے ایک امید بھری آواز میں ساجد کی طرف دیکھا تھا۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی حمزہ......!'' اس کی بے یقین آنکھوں نے جیسے سب بندھن توڑ دیے تھے۔

''ساجد......!'' امی جان نے پکارا تھا۔

''نہیں امی جان...... اب میں ریحانہ کو نہیں جھٹلا سکتا۔ آپ کی خاطر میں نے کتنی بار اس کی خوشیوں کا گلا گھونٹا مگر آپ کے اس بیٹے نے اس کی قربانیوں کا یہ صلہ دیا؟ اسے جھوٹا کہا...... اور اپنے ہی بھائی کے گھر چوری کی۔ میں یہ بات نہیں بھول سکتا۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ رہیں آپ اپنے اس چور بیٹے کے ساتھ۔'' وہ بھی گردن جھٹک کر وہاں سے چل دیا تھا۔

''ساجد......!'' امی جان چیخی تھیں۔ حمزہ بھی ہراساں کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ دماغ تو جیسے ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز نے امی جان کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ کروٹ لیتے ہوئے انہوں نے پلٹنے کی کوشش کی تو وہ پاؤں سے گرنے ہی والی تھیں کہ حمزہ نے انہیں تھام لیا۔

''امی جان......! سنبھال کر۔'' اس کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ چکا تھا۔

''ساجد کو روکو حمزہ...... روکو...... ساجد...... کو۔'' آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ماں کا دل بیٹے کو دور جاتا دیکھ کر ہی برزخ بنا ہوا تھا۔

''امی جان...... آپ زیادہ ٹینشن مت لیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' وہ اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا مگر خود اسے بھی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اتنی بڑی قیامت ٹوٹ چکی تھی۔

''حمزہ...... میرا بیٹا...... ساجد...... روکو۔'' امی جان کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کے دل کو جیسے مزید چور چور کر رہے تھے مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

دوڑتا ہوا ساجد کے کمرے میں گیا۔

''بھائی جان میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ کہو تو میں بھابھی سے بھی معافی مانگ لوں گا مگر پلیز گھر چھوڑ کر مت جائیں۔ امی جان ٹوٹ جائیں گی۔ انہیں مزید دکھ مت دیں۔'' وہ ساجد کے پاؤں میں آ گرا تھا۔

''یہ آنسو بہانا بند کرو اب...... چوری کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی جو اب دلیر بن کر معافی مانگنے چلے آئے۔'' ریحانہ نے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے کپڑے بیگ میں بھی ٹھونس رہی تھی۔

''بھابھی...... آپ اگر کہتی ہیں کہ میں چور ہوں...... تو ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں، میں نے چوری کی۔ آپ جو

سزا دینا چاہیں۔ مجھے دیں مگر امی جان کو اتنا بڑا دکھ مت دیں۔ میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں مگر امی جان کو تکلیف مت پہنچائیں۔ وہ آپ دونوں کی جدائی نہیں سہہ پائیں گی۔ پلیز بھابھی......!'' وہ ہاتھ جوڑے...... آنکھوں میں آنسو لیے...... اپنی اس غلطی کی معافی مانگ رہا تھا جو اس سے سرزد بھی نہ ہوئی تھی۔

''دیکھا ساجد...... کیسے مان گیا اپنی چوری۔ کیا سوچا تھا اس نے یہ چوری کرے گا اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اب ذرا سی چوٹ کیا لگی، لائن پر آگیا۔ کیا اب بھی آپ اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنا پسند کریں گے؟'' وہ ساجد کے غصے کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ وہ اب بالکل خاموش تھا۔ گردن جھکائے بس ساجد کے فیصلے کا منتظر تھا۔

''کبھی نہیں......!'' پاس آکر اس نے انتہائی سخت الفاظ میں کہا تھا اور بیگ اٹھا کر تیز قدموں سے نیچے آگیا۔ ریحانہ بھی اس کے ساتھ ہوگئی۔

''بھائی......!'' ان لفظوں نے جیسے اس پر قیامت ڈھائی تھی۔ دوڑتا ہوا، ساجد کے پیچھے پیچھے نیچے آیا۔

''پلیز بھائی...... میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔'' وہ دہلیز پار کر رہا تھا جب وہ اس کے قدموں میں آگرا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے پاؤں پکڑ کر وہ کسی بچے کی طرح اسے روک رہا تھا مگر وہ بھی ایک ظالم اور سنگ دل بنا ہوا تھا۔ ایک غرور کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو جھٹکتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

''ساجد......!'' امی جان نے اسے جاتا دیکھا تو آگے ہاتھ بڑھایا مگر آواز گلے میں ہی دب کر رہ گئی اور بے جان سا جسم زمین پر ڈھے گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت اسپتال کے کوریڈور میں کھڑا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ آنسو اور دل غم سے رنجیدہ تھا۔ ساجد اور ریحانہ کے جانے کا غم امی جان برداشت نہ کرسکیں اور ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی۔

''انکل امی جان ٹھیک تو ہوجائیں گی ناں؟'' ڈاکٹر سجاد کے باہر آتے ہی حمزہ نے گلوگیر لہجے میں پوچھا تھا مگر ان کی خاموش نگاہیں بھلا اس بچے کو کیا کہتیں؟ اس کے غم کو کیسے کم کرتیں؟

''دعا کرو حمزہ۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے چلے گئے جبکہ اس کے سر پر جیسے ایک بم پھوڑا گیا تھا۔ ضبط کا بندھن جیسے ٹوٹتا چلا گیا۔

''نن...... نہیں۔'' بلکتے ہونٹوں نے چیخنا چاہا تھا مگر مجبور وجود ایسا بھی نہ کرسکا تھا۔ اس کے ڈگمگاتے قدم اس وارڈ کی طرف بڑھے جہاں امی جان تھیں۔

''امی جان...... آپ جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔ دیکھیں نا...... میں کتنا اکیلا پڑ گیا ہوں۔ ساجد بھائی بھی مجھے چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ اب اگر آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں کیسے جیوں گا؟ امی جان پلیز...... آپ ٹھیک ہوجائیں۔ پلیز امی جان۔'' وہ ان کے پاس بیٹھا اپنی تنہائی کا شکوہ کر رہا تھا مگر بے جان وجود شاید ایک لفظ بھی سننے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

ریحانہ ساجد کو اپنے میکے تو لے آئی مگر اس کی قسمت جیسے وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اسے یہاں کاروبار چلتا چلایا تو مل گیا مگر زیادہ عرصے تک وہ اسے نہ سنبھال سکا۔ جب ایک ماں کا دل دکھتا ہے تو عرش ہل جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک ماں کا دل دکھا کر بھلا وہ کیسے چین کی زندگی گزار سکتے تھے؟ اگلے ہی ہفتے ریحانہ کی ماں جو اسے ساجد کو بدگمان کرنے کے مشورہ دیا کرتی تھی، کسی کام سے چھت پر گئی تھی۔ بارش نے سیڑھیوں کو پھسلن بنادیا تھا۔ وہ جیسے ہی نیچے اترنے لگی تو ایسا پاؤں پھسلا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور تمام سیڑھیاں لڑھکتی ہوئی زمین پر آگری۔

ریحانہ نے جب اپنی ماں کی چیخ سنی تو اس کی طرف لپکی تھی۔

''امی......!'' وہ چیخی مگر تب تک کافی دیر ہوچکی تھی۔ عین اسی وقت ساجد بھی گھر میں داخل ہوا تھا وہ انہیں فوراً اسپتال لے گئے۔ خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی یہ وہی اسپتال تھا جہاں اس کی خود کی ماں ایڈمٹ تھی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو سوری کہتے ہوئے گردن جھکا لی۔ راستے میں ہی اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔ ریحانہ پر یہ خبر قیامت بن کر نازل ہوئی تھی۔

''امی...... امی مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ ساجد امی سے

کہو نا کہ اٹھیں۔ مجھ سے بات کریں۔ان کی بیٹی ان کو پکار رہی ہے۔انہیں کہو کہ آنکھیں کھولیں۔'' وہ ساجد کا گریبان پکڑ کر چیختی چلاتی رہی مگر یہ چیخنا چلانا کسی کام نہیں آیا تھا۔خود اس کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔اس نے ایک حسرت کے ساتھ بیڈ پر رکھے بے جان وجود کو دیکھا تھا۔

لاشعوری طور پر نگاہیں پلٹیں تو دروازے کے اس پار حمزہ کو کھڑے پایا۔جس کی آنکھوں میں بھی وہی آنسو تھے، جو ریحانہ کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔جو ان کی موجودگی سے لاعلم تھا۔

''حمزہ یہاں......؟''اس کے لب بڑبڑائے تھے۔ریحانہ کے جسم میں بھی جنبش ہوئی تھی۔

''ساجد...... یہ سب امی جان کی آہ لگی ہے۔ہم نے ان کا دل دکھایا تھا نا......دیکھو امی کو ان کی آہ لگ گئی۔ہمیں امی جان سے معافی مانگنی چاہیے۔''اس نے بلکتے ہوئے لبوں کے ساتھ کہا تھا۔شاید اس کا دل بھی اب پگھل چکا تھا۔اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔تبھی اثبات میں سر ہلا دیا۔دونوں اٹھے اور بے جان قدموں کے ساتھ حمزہ کی طرف بڑھنے لگے۔

''حمزہ۔'' ساجد کی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی کہ اس کی نمی سے بھرپور آنکھوں سے سر اٹھایا تھا۔

''بھائی......!'' وہ اس کے گلے جا لگا تھا۔

''حمزہ...... کیا ہوا؟ امی جان کہاں ہیں؟'' وہ گلوگیر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔تبھی وہاں ڈاکٹر سجاد آئے تھے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا اس کے لب ہلے تھے۔

''تم نے آنے میں بہت دیر کر دی ساجد...... بہت دیر کر دی۔'' ان کے نرم لہجے میں کہے گئے ان لفظوں کی کاٹ اتنی گہری تھی کہ ساری عمر ان کا تدارک ممکن نہ تھا۔ریحانہ کے سر پر جیسے دوسرا بم پھوڑا گیا تھا۔

''نن......نہیں ڈاکٹر صاحب......آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ابھی تو امی جان نے مجھے معاف کرنا ہے، میں نے معافی مانگنی ہے ان سے۔وہ مجھے معاف کیے بغیر نہیں جا سکتیں۔'' اس کا ذہن سچائی تسلیم کرنے سے عاری تھا۔نفی میں سر ہلاتا ہوا وہ اسی وارڈ کی طرف بڑھا تھا۔

امی جان کا وجود بس اس دنیا کو الوداع کہنے کو تھا، جب اس نے وارڈ میں قدم رکھا تھا۔آنکھوں میں ندامت لیے وہ کئی لمحے تک یونہی ساکت کھڑا رہا تھا۔اپنے الفاظ واپس سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔

''امی جان۔''خاموش لہجے نے سرگوشی کی تھی۔یہ باریک سی آواز بھی ممتا کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔تبھی گردن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔یہ آخری حرکت تھی جو اس وجود نے کی۔آنکھیں بھر آئیں۔ہاتھ بڑھا کر اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگانا چاہا مگر سانسوں نے مہلت نہ دی تھی۔

''امی......!'' وہ چیخا تھا۔بھاگتا ہوا اس ہاتھ کو تھاما جو روح کے نکل جانے سے بیڈ پر آ گرا تھا۔

☆☆☆

اکھیاں دے وچ وسن والے لوکی لکھ ہزار
میں نے لبھنا پھرناواں، بس مائے تیرا پیار

وہ اسی گھر میں واپس لوٹے تھے جہاں ماں کے پیار کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے گئے تھے۔ایک ایک پل آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ایک ماں کا اپنے بیٹے کو روکنا......ایک بہو کا اپنے معصوم دیور پر چوری کا الزام لگانا......ایک بھائی کا اپنے بھائی کی بے گناہی پر یقین نہ کرنا......سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا۔دل اس بوجھ کے زیر اثر تھا۔آنکھیں اکتاہٹ محسوس کر رہی تھیں۔ایک خواہش تھی کہ کاش وہ سب ایک خواب ہو، قدم رکھا جائے اور ماں دوبارہ استقبال کرے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

سوالیہ نشان

سیما بنت عاصم

برہان وانی مقبوضہ کشمیر کی آزادی کا ہیرو، نوجوانوں کی امیدوں کا مرکز، جس کی قربانی نے قوم کو ایک نئی امید دی۔
ایک لکھاری کی روداد اسے کہانی کی تلاش تھی۔

اس کا نام ارسلان تھا۔ محمد ارسلان۔ وہ ایک لکھاری تھا اس کی نظروں میں کھوج، چہرے پر گزری عمر کی چھاپ تھی۔ نت نئی کہانیوں کی تلاش اسے نئی دنیاؤں کی سیر کراتی۔ وہ ہر چہرے کے عقب میں چھپی کہانی جانچتا اور پھر اسے کھوجنے کی جستجو اسے بے چین کر دیتی۔

ہر شام فیملی پارک میں چہل قدمی اس کا معمول تھی۔ اس شام وہ چہل قدمی کر کے تھک گیا تو ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں پاپ کارن کے کاغذ کی ایک کون تھی۔ اس نے پاپ کارن کے بچے کھچے دانے منہ میں ڈالے اور کون کھول لی۔ اگلے ہی لمحے اس کی نظریں اس صفحہ پر دوڑ رہی تھیں وہ کسی پرانی ڈائری کا ورق تھا۔ خطہ کشمیر۔ سرما کی لہو منجمد کر دینے والی سیاہ رات میں جھینگر کی ٹراہٹ تھی۔ وادی کشمیر کے کچے پکے پرانے سے گھر کی دیوار سے ایک سایہ دھم سے گھر کے اندر کودا تھا۔ اس کے شانے پر گن چہرے پر نقاب تھی۔ صحن میں کھڑی شاہدہ خوفزدہ ہوگئی۔

"کک کون کون ہو تم؟"

اجنبی نے بغور دیکھا۔ وہ ایک سولہ سترہ سالہ کشمیری دوشیزہ تھی اخبار...... نیٹ سے اس کی کیا شناسائی۔

"تم خبریں تو دیکھتی ہوگی میں مجاہد ہوں کشمیری مجاہد۔"

اس نے کہتے ہوئے چہرہ بے نقاب کیا۔ اس کے کلیجے کی ٹھنڈک اٹھائیس سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ جانے کس ماں کا لعل۔ اس کے کلیجے کی ٹھنڈک۔ شاہدہ سوچتی کبھی وہ بھی کسی بچے کو جنم دے گی وہ بھی ایسا ہی بانکا سجیلا ہوگا۔ مگر برہان پر ایک نظر پڑتے ہی شاہدہ گنگ رہ گئی۔

"برہان تم برہان ہو؟" شہر میں جگہ جگہ تمہاری تصویریں لگی ہیں۔"

"صرف سمجھ کا پھیر ہے حکومت جسے دہشت گردی کا نام دیتی ہے میرے لیے جہاد ہے اپنے وطن کی آزادی میرا مشن ہے اور شہادت میرا مقصد حیات۔ میں زندگی کی آخری سانس تک اس کے لیے لڑوں گا۔" شاہدہ کو اپنے وجود میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ مجھے صرف چند گھنٹے کی پناہ چاہیے۔ دشمن فوج کے ہرکارے میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

شاہدہ جانتی تھی یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس کا شوہر اسلم اک گھاگ آدمی تھا۔

"اس کے بدلے اگر تم چاہو میرے پاس کچھ رقم زیور ہے۔ جو کشمیری مجاہدین کو بخوشی عطیہ کر سکتی ہوں۔" شاہدہ سوچ میں پڑ گئی اسلم سے اس کی شادی محبت کا شاخسانہ تھی۔ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر اسلم کے ساتھ نکلی تھی۔ مگر اسلم نے اسے صرف خواب دیئے تھے اسے اپنے آج پر پچھتاوا تھا۔ مگر اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تمہیں پناہ مل سکتی ہے مگر میرا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے۔ بس تب تک جب تک وہ آ نہیں جاتا۔"

"وہ کب تک آتا ہے؟" برہان نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ رات بھیگ رہی تھی۔

"اب تک آ جاتا ہے شاید موسم نے راہ روک لی ہے۔"



''وہ میری بو تک نہیں پا سکے گا تم بے فکر رہو۔'' برہان نے شانے سے بیگ اتارا۔ کچھ کھانے کو ہے؟''

شاہدہ نے گردن نفی میں ہلائی۔ اس کا شوہر لکڑی کی ٹال پر کام کرتا تھا اس کی معمولی اجرت سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی۔

''صرف سیاہ چائے مل سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میرے پاس کچھ بسکٹ ہیں۔''

دروازہ بجا تھا اور شاہدہ کے چہرے پر ہراس اُمڈ آیا۔ وہ اسلم کو اس کی دستک سے پہچانتی تھی۔ برہان نے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموشی کا اشارہ دیا۔

''یہ وطن میری ماں ہے اور میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔''

دروازہ پھر بجا۔ برہان مکان کے اندرونی گوشہ میں چھپ گیا۔ شاہدہ نے بڑھ کر دروازہ وا کیا۔ اسلم اندر آ گیا۔

''آج دروازہ کھولنے میں اتنی دیر؟''

''میری آنکھ لگ گئی تھی۔''

''اسلم کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ پھر کچھ چوکنا نظر آنے لگا۔ فضا میں غیر معمولی پن اور ایک عجیب سی مہک تھی۔

''یہ مہک کیسی ہے؟''

''مہک......کیسی مہک مجھے تو کوئی مہک نہیں آ رہی۔''

شاہدہ کچی عمر کی نادان لڑکی تھی اپنے تاثرات پر دسترس نہیں رکھتی تھی اور یہ اسلم بھی جانتا تھا۔

''اچھا تو کہتی ہے تو مان لیتا ہوں۔'' اس نے کچھ اطمینان ظاہر کرتے ہوئے شاہدہ کا ہاتھ تھاما تو وہ جھجک گئی۔ آج ان دونوں کے درمیان کوئی اور بھی تھا۔

''چائے بناتی ہوں تمہارے لیے۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔ اسلم پلنگ پر دراز ہو گیا۔ کچھ لمحات یوں اس نے کروٹ بدلی تھی اور......اس کی نگاہیں ایک نکتے پر مرتکز ہو کے رہ گئیں۔ لکھاری بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے لگا اسے ایک کہانی مل سکتی ہے۔ پارک میں جا بجا کاغذ بکھرے تھے۔ پارک کے ایک گوشہ میں پاپ کارن کے اسٹال پر ایک رش لگا تھا دکاندار بنڈل سے کاغذ ادھیڑتا کون بناتا اور اس میں پاپ کارن بھر دیتا۔ اسی بنڈل میں اک کہانی سسک رہی تھی۔ لکھاری کا رخ اسٹال کی جانب تھا اور اسے اگلے چند صفحات وہیں ملے تھے۔ منظر بدل گیا۔ شاہدہ اسلم کے سامنے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اگر وہ اچانک میرے سامنے نہ آتا تو شاہدہ تم مجھے نہ بتاتیں۔

''میں میں جانتی ہوں میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔''

''تمہیں پتا ہے یہ کتنا خطرناک ہے ہم کسی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔

وہ جس وطن کے لیے لڑ رہا ہے ہم بھی تو اسی کے باشندے ہیں۔''

''مگر اس سے ہمیں کیا ملے گا؟''

''زندگی میں سب کچھ ملنے کے لیے ہی نہیں ہوتا۔

صرف چند گھنٹوں کی پناہ سے ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"آہستہ بولو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" شاہدہ کو مجبوراً برہان کی پیش کش اگلنی پڑی۔ اس نے برہان کی تصویر دیکھی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ برہان کے سر پر لاکھوں کا انعام ہے۔ جو برہان کی پیش کش سے کہیں زیادہ ہے۔ اسلم کے لیے اس انعام میں زیادہ کشش تھی۔

"مگر یہ پناہ صرف چند گھنٹے کی نہ رہی دشمن فوج کا محاصرہ سخت تھا اور برہان کا نکلنا ناممکن۔

"فوج کا محاصرہ سخت ہے ہمیں جو کرنا ہے جلد ہی کرنا ہوگا۔" اسلم نے سرگوشی کی۔

"اسے بچا کے رکھو وہ لاکھوں کی لاٹری ہے مگر یاد رکھو عورت اور سانپ پر کبھی بھروسا مت کرنا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو وہ نادان عورت کام بگاڑ سکتی ہے۔"

"اسے بتاؤ وطن سے وفاداری انسان کو کچھ نہیں دیتی کشمیر میں آگ لگتی ہے تو لگا کرے اس برہان کا انجام تو ویسے بھی موت ہے سیاہ سفاک موت۔"

فضا میں بھاری بوٹوں کی دھمک جاگی۔ وہ دونوں ادھر ادھر ہو گئے۔ لکھاری کو اپنے لہو کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے ہی پل وہ پارک میں جا بجا بکھرے صفحات سمیٹ رہا تھا بالآخر اسے کچھ صفحات اور مل گئے۔

برہان اندرونی کمرے میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔

"تم نے اچانک اس کے سامنے آ کر اچھا نہیں کیا۔"

"مجھے لگا کہ تم نہیں سنبھال پاؤ گی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو مگر مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگتے تمہیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

برہان کے لیے بھی اک اک پل قیامت تھا۔ دشمن فوج کو اس نے ننگی کا ناچ نچا رکھا تھا شہر میں جگہ جگہ اس کی تصویریں لگی تھیں۔

"تم اسے نہیں جانتے وہ ایک کمینہ آدمی ہے۔ مگر میرا اس کے سوا کوئی نہیں۔" برہان نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اسلم کے لہجے میں ٹھٹھرا دینے والی سردی کی کپکپاہٹ تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا عورت اور سانپ پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے میں نے اسے اپنے ارادے کی ہوا بھی نہیں دی مگر وہ جان گئی اور برہان کو ہوشیار کر دیا۔"

"کیا یہ تم کیا کہہ رہے ہو میں نے تو...... اوشٹ یہ عورتیں ہوتی ہی نادان ہیں۔"

"اس نے مجھے غافل کرنے کے لیے جو چائے دی تھی میں نے بدل دی۔ اب تک وہ گہری نیند میں ہے مگر برہان ہاتھوں سے نکل گیا وہ ایک منجھا ہوا مجاہد ہے اور میں عام آدمی۔ اگر عورت کی دغا بازی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور تم اسے نادان کہہ رہے ہو؟"

"میں شاہدہ کو اس کی غداری کی سزا دے کر رہوں گا اسلم نام ہے میرا اسلم۔"

"اس سے کون کہتا غدار شاہدہ نہیں وہ خود ہے جو اپنی ماں کا سودا کرنے چلا تھا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی منہ سے نکلی بات پرائی ہو جاتی ہے اسلم کی مخبری ہو گئی تھی برہان کی پشت پناہی کے جرم میں فوج اسے اٹھا کر لے گئی۔ شاہدہ نے سنا تو چکرا کر گر پڑی اور اس سے آگے صفحہ ختم تھا۔ تسلسل ٹوٹ گیا۔ لکھاری کو لگتا بقیہ کہانی بھی وہیں کہیں چھپی ہے جسے کھوجنا ہوگا۔ اس کا خیال تھا اب کہانی کا اینڈ ہوگا اب کہانی کا اینڈ ہو ہی جانا چاہیے مگر اینڈ کے بغیر کہانی ادھوری تھی۔ اختتام میں ساری کہانی کا نچوڑ تھا۔ ڈائری کے صفحات ڈھونڈ نے تسلسل کے ساتھ جوڑنے میں اس نے ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ کیونکہ اب جتنی دیر لگی اتنی ہی ناممکن بات تھی کہ اسے بقیہ صفحات مل پاتے۔ اس نے اسٹال والے سے ارزاں نرخ پر وہ ڈائری ہی خریدی مگر اس کے پاس صفحات سادہ تھے ڈائری پرانی ردی کا کوئی حصہ تھی اس پرانی ڈائری کا کاغذ بوسیدہ تھا مگر لفظ! ان لفظوں میں ایک کہانی پوشیدہ تھی جس کی قیمت کوئی لکھاری سے پوچھے۔ لکھاری نے بہت کھوجا مگر کہانی کا اگلا سرا ایک سوالیہ نشان بن کر رہ

گیا اگلے صفحات پارک کے کسی گوشے میں نچ مل سکے بہت سے سوال چیختے تڑپتے رہ گئے۔ اس کے ہر سوال کا جواب کہانی کے کلائمکس۔ اگلے صفحات میں تھا جو استعمال کر کے پھینک دیئے گئے تھے اور کہانی اٹک گئی تھی لکھاری کی کھوج بڑھ گئی۔ اگلے روز اس نے علی الصبح پارک کے خاکروب کی مدد سے ڈسٹ بن کھنگالا اور آخر کار کہانی کا اگلا سرا پالیا۔ مگر آخری صفحہ ادھورا تھا شاہد اس میں پاپ کارن باندھے گئے تھے اگلے صفحات پر سالوں بعد کی تاریخ درج تھی۔ میں برہان ہوں بس برہان۔ کیونکہ میرے باپ نے مجھے اپنا نام دیا نہ مجھے منظور کیا۔ مجھے اپنے کل پر فخر تھا مگر مجھے اپنے آج پر ندامت ہے ہاں ندامت۔

میں اس ماں کی اولاد ہوں جس نے خطہ کشمیر کی بقاء کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگادی۔ اس نے کشمیری مجاہد برہان کو پناہ دی تھی اور یہی پناہ اس کا جرم بن کر اس کے کردار کی چادر کو داغ دار کر گئی۔ برہان کی پناہ میرے باپ کے کھاتے میں جا پڑی۔ وہ ملک دشمن کے ہاتھ لگا مگر اسے برہان کا پتا ہوتا تو بتاتا۔ وہ دشمن فوج کے ٹارچر سے بچ نکلنے والا ایک خوش نصیب ٹھہرا۔ مگر اس نے مجھے منظور کیا۔ نہ مجھے اپنا نام دیا۔ میری ماں کو اس کی بے صبری نے چاٹ لیا۔ کشمیری مجاہد برہان آٹھ جولائی کو دشمن فوج کی سفاکی کی بھینٹ چڑھ گیا برہان کی گرفتاری اور پھر شہادت سارا کشمیر چیخ اٹھا۔ 8 جولائی برہان کی شہادت اور میری ولادت۔ میری کتاب زندگی کے یہی چار باب ہیں۔ میرے باپ کی قید اور پھر گمشدگی۔ میری ماں کا پاگل پن برہان کی شادت۔ اور میری زندگی۔ جو ایک سوالیہ نشان ہے۔ لکھاری صفحہ سنبھال کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے کہانی مکمل مل گئی تھی۔

⌘

انوکھا انجام

جاوید احمد صدیقی

جدیدیت کے نئے نئے رنگ ڈھنگ نے بہت سی چیزیں انسان سے دور کردیں۔

انسان پلان کچھ کرتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو ہونا کنفرم ہوتا ہے۔ نصف درجن کے قریب اس کے ملازمین نے ڈینیل کی میز کے گرد جمع ہو کر ہیپی برتھ ڈے کا گیت شروع کیا تو وہاں بہت سے گاہکوں نے تالیاں بجا کر اور تال کے ساتھ ساتھ فرش پر جوتے مارتے ہوئے ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔

ڈینیل نے سامنے بیٹھی بیوی کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہم میں اس بات پر اتفاق ہوا تھا اس طرح کی کوئی غلط بات نہ ہوگی بلکہ یہ لغویت ہرگز نہ ہوگی لیکن پھر گیت گانے والوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا جب اس کے مخلص خادم گیت ختم کر چکے تو اس نے بڑے نرم لہجے میں ان کا شکریہ ادا کیا۔

اسے ان ویٹرس کو دیکھ کر اپنی سیکرٹری کیلی یاد آ گئی گو اس کا پورا نام قدرے مردانہ تھا لیکن وہ ایک بھرپور اور مکمل عورت تھی۔ وہ نہایت غیر معمولی ساتھی ثابت ہوئی یہ بات ڈینیل نے اس کے کام پر آنے کے دو ماہ بعد دریافت کی تھی دو سال قبل ان کی پہلی ملاقات کے بعد سے ان کے درمیان ہفتے میں کم از کم ایک بار ملاقات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا وہ ایک غیر معمولی عورت ثابت ہوئی تھی اور اس کی بیوی کیرولین تو بھی اس کی پاسنگ بھی نہ رہی تھی۔ کیلی کی عمر صرف چوبیس برس تھی

آج ڈینیل بقول اپنے بہت سے دوستوں کے اپنی بگ فائیو او سالگرہ منا رہا تھا اس نے آج تک کبھی بڑے پیمانے پر اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی نہ کبھی سالگرہ پارٹی کا اہتمام کیا تھا اسی وجہ سے اس نے اس بار بھی کسی قسم کی تقریب منعقد نہیں کی تھی وہ یہ ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ کسی کو بھی اس بات کی یاد دہانی کرائی جائے کہ وہ نصف صدی سے زندہ ہے۔

ماضی میں کیرولین ہر دفعہ اس کے احتجاج کے باوجود بھی اس کی سالگرہ پر کوئی نہ کوئی خاص اہتمام کرنا چاہتی تھی لیکن اس بار جب کیرولین نے یہ شام انتہائی سادگی کے ساتھ منانے پر اتفاق کیا تو ڈینیل نہ صرف خوش ہوا بلکہ وہ قدرے حیران بھی ہوا۔ کیرولین ایک عمدہ ساڈنر اور پھر ایک فلم دیکھنے پر رضامند ہوگئی تھی۔ انہوں نے ایک اچھی اور عمدہ سی فلم کا انتخاب کیا تھا ڈینیل کو اس فلم کے دونوں ہیرو بے حد پسند تھے اور وہ سمجھتا تھا کہ فلم عمدہ ہی ہوگی۔

اور باتوں کے علاوہ اس لیے بھی خوش تھا کہ اس نے کیرولین سے چھٹکارا پانے کا ایک مضبوط و مربوط منصوبہ تیار کرلیا تھا جب ان دونوں کی شادی ہوئی تھی تو کیرولین کے باپ نے اس شادی سے قبل اس معاہدے پر اصرار کیا تھا کہ اگر ان کے درمیان طلاق ہوگئی تو اس صورت میں ڈینیل کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملے گی اور ڈینیل مالی طور پر تباہ ہوجائے گا۔

کیرولین کی فیملی مال دار تھی اور کیرولین کا باپ نہیں چاہتا تھا کہ ڈینیل اس کی بیٹی کے ساتھ کسی لالچ میں شادی کرے یا اس کی نیت کچھ اور ہو اس وقت یہ بات قرین قیاس محسوس ہوئی تھی گذشتہ سال اس نے پورے اس دور میں اپنے ذہن میں سیکڑوں خیالی واقعات ترتیب دیئے تھے لیکن اس بار جو منصوبہ اس نے ترتیب دیا تھا اس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ اس کی پریشانی کو ایک بار اور ہمیشہ ہمیشہ ختم کردے گا۔

آج رات کے بعد وہ تمام وقت کیلی کے ساتھ گزارنے کے لیے آزاد ہوگا اور جوں ہی کیرولین نے اس کی پچاسویں سالگرہ سادگی سے منانے پر اپنی آمادگی ظاہر کی تو اس نے دو دن قبل ہی سے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کردیا۔

آج دفتر سے واپسی پر وہ راستے میں ایک بڑے سے ڈسکاؤنٹ اسٹور پر رکا اور اپنے سائز سے تین سائز بڑے جوتوں کی ایک جوڑی خریدلی۔

اپنی سالگرہ کے دن ڈینیل دفتر سے جلدی اٹھ آیا اور اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ کیرولین اس وقت بیوٹی پارلر گئی ہوئی ہے اس نے کار اپنے گھر کے سائڈ پر پارک کی جو اونچی جھاڑیوں کی باڑ کی وجہ سے باہر سے نہیں دکھائی دیتا تھا ڈینیل نے وہ بڑے سائز کے جوتے پہن لیے اور پھولوں کی باڑ سے گزرتا ہوا بیسمنٹ کی کھڑکی تک پہنچ گیا اس نے یہ یقین کرلیا تھا کہ نرم مٹی پر اس کے جوتوں کے نقش واضح طور پر ثبت ہوجائیں...... اس نے بیسمنٹ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور دستانے پہن کر کھڑکی کا تالا کھولا اور یہ یقین کرلیا کہ کھڑکی

کھل چکی ہے۔

اس طرح پولیس یہ تعین کرلے گی کہ وہ چور کس طرح گھر میں داخل ہوا ہوگا۔ پھر وہ وہاں سے اپنی کار میں شہر کی دوسری جانب ایک اور بڑے سپر مارٹ میں چلا گیا اور اس نے اپنے جوتے بڑے سائز کے ایک کوڑے دان میں پھینک دیئے۔

اور پھر جب وہ رات کو گھر واپس لوٹیں گے تو ان کا آمنا سامنا اس نقب زن سے ہوجائے گا۔ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وہ نقب زن کیرولین کو خنجر گھونپ دے گا۔ یہ ایک سادہ سا منصوبہ تھا' اس طرح وہ نہ صرف کیرولین کی دولت کا حقدار بن جائے گا بلکہ اس کو اس کی زندگی کے بیمے کی رقم بھی مل جائے گی اور پھر وہ اور کیلی کسی دور دراز جزیرے پر اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوجائیں گے۔

حسب پروگرام وہ دونوں سالگرہ کے موقع کی مناسبت سے ریسٹورنٹ کی جانب سے پیش کیے گئے کیک اور آئس کریم سے لطف اندوز ہورہے تھے تو کیرولین نے اچانک اپنا چمچہ گرادیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دونوں ہاتھوں سے تھام لیں۔

''کیا ہوا؟'' ڈینیل نے پوچھا۔

کیرولین نے اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ ''اوہ ڈینیل مجھے سخت درد شقیقہ ہورہا ہے۔'' ڈینیل اس کی صورت کو تکنے لگا ساتھ ہی ساتھ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ یہ کیا ہوگیا؟ ابھی ہم تو گھر بھی نہیں پہنچے؟

''تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔'' ڈینیل نے اسے تسلی دی۔

''نہیں' آئی ایم سوری' میں تمہاری سالگرہ برباد نہیں کرنا چاہتی' لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے گھر لے چلو۔''

کار واپس گھر کی جانب چلاتے ہوئے ڈینیل نے ذہن میں اپنے منصوبے پر نظر ثانی شروع کردی۔

اسے اپنا شکاری خنجر ٹانگ سے بندھا ہوا محسوس ہورہا تھا جو غلاف میں بند تھا اس کی انگلیوں کے نشان اس خنجر پر موجود تھے لیکن یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی یہ خنجر اس کا ذاتی تھا اور وہ اسے کئی بار استعمال کرچکا تھا۔

اور یہ خنجر نقب زن نے چرالیا تھا۔

''میں پولیس کو یہ بتاؤں گا کہ کیرولین نے دروازہ کھولا' پھر گھوم کر مجھے ہیپی برتھ ڈے کہا مجھے کس کیا اور میری بانہوں میں ڈھیر ہوگئی' میں نے اندھیرے میں کسی کو اپنے پاس سے دوڑتے ہوئے دیکھا لیکن مجھے اس کے پیچھے دوڑنے سے زیادہ اپنی بیوی کی فکر تھی میں نے فوراً ہی 0911 پر فون کردیا۔

جب ان کی کار ریسٹورنٹ سے واپسی پر گھر کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی تو کیرولین بولی۔ ''پورچ کی لائٹ آن نہیں ہے؟''

''ہوں شاید میں آن کرنا بھول گیا ہوں گا۔''

داخلی دروازے پر پہنچ کر ڈینیل اپنی چابیاں ٹٹولنے لگا۔ پھر کیرولین سے بولنے لگا۔ ''تمہارے پاس گھر کی وہ چابیاں اب بھی موجود ہیں جس میں چھوٹی سی فلیش لائٹ بھی ہے؟''

کیرولین نے اپنے پرس میں سے اپنی چابیوں کا گچھا نکالا اور ڈینیل کے پاس سے گزرتے ہوئے داخلی دروازے تک پہنچ گئی جیسا کہ ڈینیل نے اندازہ لگایا ہوا تھا۔

ڈینیل نے یہ یقین کرنے کے لیے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ کہیں اس کا کوئی پڑوسی اپنے کتے کو ٹہلانے کے لیے تو نہیں نکلا ہوا ہے یا کوئی اور کام تو نہیں کررہا کہ وہ انہیں دیکھ لے لیکن اس وقت آس پاس کوئی بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

پھر جونہی کیرولین نے تالے میں چابی لگائی تو ڈینیل نے چپکے سے اپنی پنڈلی سے بندھے ہوئے غلاف میں سے اپنا خنجر کھینچ لیا اور ادھر دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ ڈینیل نے خنجر کیرولین کی پیٹھ میں گھونپ دیا' کیرولین کا جسم آگے کی سمت لڑھک گیا اور اس کے حلق سے عجیب قسم کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔

''اور عین اسی لمحے لیونگ روم اور گھر کی تمام لائٹس اچانک روشن ہوگئیں اور وہاں موجود ڈینیل کے 20,21 پڑوسی اور دوست اچھل کر تالیاں بجاتے ہوئے خوشی سے چلائے اور سرپرائز اینڈ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''

ڈینیل ایسے ہوگیا جیسے ابھی بے ہوش ہونے والا ہے......!!!

وہ تیس دن

عمارہ خان

قسط نمبر 2

یہ کہانی خودغرضی اورلالچ پر مبنی ہے کہ کیسے کچھ انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کا احساس کیے بنا ہی کچھ ایسے شرمناک کام انجام دے جاتے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے باعث شرم بن جاتے ہیں۔اپنے حال پر مطمئن رہنا بھی ایک شکر گزاری ہی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔اس کہانی کے کچھ کرداروں کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ وہ غلط تھے یا درست، حالات کے بے رحم سمندر میں بہتے ہوئے کمزور انسان اپنے آپ کو بچانے کی خاطر ، اکثر فطرت اور ضمیر کے خلاف بھی چلے جاتے ہیں جس کا خمیازہ اس کے ساتھ اولاد کو بھی بھگتنا ہوتا ہے۔ مجھے یعنی صاحب تحریر عمارہ خا ن کو جیسے بتایا گیاتھااسے جوں کا توں لکھ دیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کو پڑھ کے آپ اپنے گھر کی بنیاد کے بارے میں بھی مشکوک ہوجائیں، کیونکہ یہ کہانی ایک ایسے خونی گھر کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کسی نے بہت پیار سے اپنی بیوی کے لیے بنوایا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کی بنیاد میں کالے جادو کے کچھ اثرات ہیں جن سے پیچھا چھڑانا بے حد مشکل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہانی پڑھنے کے دوران آپ کو کچھ سوال الجھن میں ڈال دیں، لیکن جیسے جیسے کہانی اپنے انجام کی سمت جائیگی آپ کو سوالوں کے جوابات بھی ملتے جائیں گے اور پھر شاید فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ حقیتا قصوروار کون تھا۔کون تھا جس نے اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لگام نہیں ڈالی اور کتنے ہی گھروں کو اپنے ساتھ تکلیف میں ڈال دیا قصہ مختصر کرتے ہیں اور اس آسیب زدہ خونی گھر کی کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔



وقاص سائٹ سے نکل کی گھر کی جانب رواں دواں ہونے کی امید میں نکلا تھا اور اب بری طرح ٹریفک میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹہ ہونے کو آرہا تھا اور وہ بمشکل کچھ ہی گز بڑھ سکا تھا۔

"افففف خدایا، اس ٹریفک سے کب جان چھٹے گی۔ پہلے آفس کی ٹینشن بھگتاؤ اس کے بعد ٹریفک میں پھنس کے رہ جاؤ۔" چاروں طرف سے ہارن اور شور شرابے کے ساتھ دھواں دھواں ماحول کسی بھی انسان کے لیے کوفت کا باعث بن سکتا تھا۔ اچانک ڈرائیو سیٹ پر بے زار بیٹھے ہوئے وقاص کا موبائل تھرتھرا اٹھتا ہے ایک تو میں اس کی ٹون آف کر کے کھولنا بھول جاتا ہوں۔ موبائل ڈیش بورڈ سے تھرتھراتا ہوا بریک کے پاس جا گرا۔ اسی وقت ٹریفک نے آگے بڑھنا شروع کیا تو وقاص بوکھلا گیا۔ بمشکل اسکرین پر نظر رکھتے ہوئے ٹٹول کے موبائل اٹھایا اور دیکھے بغیر ہی کال ریسیور کرلی۔

"یس، وقاص اسپیکنگ۔"

"ارے واہ۔ شکر ہے شہیر پورے دن کے بعد ایک اچھی نیوز تو سننے کو ملی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں میں ابھی آجاتا ہوں۔" وقاص نے خوش ہوتے ہوئے فوراہی آفر دی۔

"اچھا کل چلو یہ بھی ٹھیک ہے کل جمعہ ہے ہاف ڈے ہوسکتا ہے۔"

"ہائی وے کالونی والا مکان۔"

"نہیں نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"چابی بھی تمہارے پاس ہے۔ اوکے ڈن۔ تھینک یو شہیر۔ تم نے میری بہت بڑی مشکل حل کردی۔ اب کم از کم اس ٹریفک سے تو پیچھا چھٹے گا میرا۔" وقاص نے ایک بار پھر ہینڈ بریک کھینچتے ہوئے کہا کیونکہ آگے پیچھے ہر طرف گاڑیاں رک گئی تھیں۔ سگنل بند ہو چکا تھا۔

"دیکھیں وقاص، کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ پہلے سکون سے وہ مکان دیکھ لیں ہر قسم کی تسلی کرلیں پھر ہی ڈن کریں ہوسکتا ہے اس سے بہتر کوئی اور مکان مل جائے۔" شہیر نے ایک فائل نکال کر وقاص کے آگے رکھی اور بے دھیانی میں مسلسل بولتا رہا۔ "ہے تو پورا مکان ،لوکیشن بھی اچھی ہے۔"

"میرے بھائی یہ تو ایسا لگتا ہے میرا ہی انتظار کررہا تھا مکان۔ ہر چیز سوٹ کررہی ہے۔" وقاص نے فائل دیکھتے ہوئے بے ساختہ کہا تو شہیر کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ گیا۔

"سب سے بڑھ کے مالک مکان ساتھ نہیں ہے اور کیا چاہیے یار۔"

"ہاں یہ پورا مکان ہی خالی ہے۔" شہیر نے سر ہلاتے ہوئے وقاص کی تائید کی۔

"دراصل میں تو پورا دن آفس ہی ہوتا ہوں، میری سالی بھی جاب کرتی ہے دو چھوٹے بچے اور بیوی ہی پیچھے ہوں گے اچھا ہے اکیلا گھر ہو تو سکون رہتا ہے ذرا۔ مالک مکان کے ساتھ سو پنچائیت نکل آتی ہیں اور پرائیویسی بھی نہیں رہتی نا۔"

شہیر ایک بار پھر فائل اپنی طرف کر کے وقاص کو لوکیشن سمجھانے لگا۔ "یہ سیدھا ہائی وے سے آپ لیفٹ سائیڈ۔"

"ہاں ہاں دیکھا ہوا علاقہ ہے میرا یہ سب۔ پانی وغیرہ کا بتائیں اس کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے وہاں؟" وقاص کو اچانک یاد آیا ٹینکر ڈلوانا جیب پر بہت بھاری پڑتا ہے۔

"نہیں میرا نہیں خیال۔ اتنے سالوں سے مکان کرائے پر ہی ہے کسی نے پانی کی تو شکایت نہیں کی۔" شہیر نے فوراً ہی وقاص کو جواب دیا اور ساتھ ہی ایک سوچ نے اسے تنگ کیا۔

جب جان پر بن جائے تو پانی کو کون پوچھتا ہے۔

"کیا کریں یار، ان ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آسان نہیں ہے پورا گھر بار ایک جگہ سے دوسری جگہ شفٹ کرنا۔" وقاص نے شرمندہ ہوتے ہوئے مزید سوال پوچھے۔

"کوئی اور بات ہے تو ابھی بتادو ایسا نا ہو بعد میں مسئلہ ہو۔ میں نوکری پیشہ انسان ہوں، بار بار نوکری سے چھٹی کر کے ان کاموں کو نہیں دیکھ سکتا۔"

شہیر سر ہلاتا ہو وقاص کی ایک بار اور بھرپور تسلی کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ "یقین کریں وہ مکان آپ کی خواہش اور ضرورت کے حساب سے اے ون ہے یہ

لیکن......"
وقاص جو انہماک سے پوری بات سن رہا تھا شہیر کے بات ادھوری چھوڑنے پر بے ساختہ بول اٹھا۔
"لیکن کیا دیکھیں کرایہ زیادہ نا ہو۔ میں نے پہلے ہی اپنی رینج بتا دی تھی۔"
"نہیں نہیں کرایہ تو مناسب ہی ہے بلکہ سچ مانیں تو کم ہی ہے آس پاس کے دوسرے گھروں سے بس وہ......"
شہیر نے ایک بار پھر جھجک کے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"کیوں میرے بھائی مکان تو صاف ستھرا ہے نا کہیں......" وقاص نے چمکتی ہوئی نگاہوں سے شہیر کو بغور دیکھا۔
"کک کیا مطلب۔" شہیر ایک دم گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"
وقاص نے حیران ہو کے شہیر کا ری ایکشن دیکھا اور ہنس کے بولا۔
"ارے بھئی میرا مطلب تھا کہیں کوئی سایہ وایہ تو نہیں ہے گھر میں اسی لیے کرایہ کم ہے۔ آپ تو ایسے گھبرا گئے جیسے واقعی وہ آسیب زدہ گھر ہو۔" وقاص نے ایک دم قہقہہ لگایا۔ "مذاق کر رہا ہوں یار ریلکس ریلکس۔"
شہیر نے دھیرے سے اپنی کرسی پر بیٹھ کے بات کا آغاز کیا۔
"دراصل وہ مکان کسی نے بہت چاہ کے ساتھ اپنی بیوی کے لیے بنایا تھا، ایک حادثے میں اس کی بیوی اسپتال جا پہنچی تو اسی کے علاج کے لیے مکان کرائے پر چڑھایا ہوا ہے۔ وہ پہلے خود رہتے تھے ادھر۔ بس ہونی کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر آپ کو معلوم ہے، آج کل کے اسپتالوں کا کیا حال ہے۔ بندہ اپنی کھال بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بیچارے نے اپنی بیوی کے لیے مکان کرائے پر چڑھا دیا ہے۔ میں نے سوچا پوری تفصیل بتا دوں آپ کو۔ اسی لیے کرایہ بھی کم ہے کیونکہ ان کو ایک مخصوص رقم ہر ماہ چاہیے ہوتی ہے اسپتال میں جمع کرانے کے لیے۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس یوں سمجھیں اس گھر کے کرائے سے وہ اپنی بیوی کا علاج کرا رہے ہیں۔"
"ارے میں تو واقعی مذاق کر رہا تھا۔ آپ سیریس ہی ہو گئے۔ ٹھیک ہے بلکہ اچھا کیا مجھے بتا دیا اب میں مزید خیال رکھوں گا کرائے کا کہ لیٹ نہیں ہو۔"
لیکن شہیر نے وقاص سے نظریں چراتے ہوئے ایک بار پھر اس کو آفر دی۔ لیکن پھر بھی کل پہلے آپ مکان کو دیکھ لیں۔ اپنا اطمینان کر لیں۔ تب ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ کوئی فورس نہیں ہے۔" شہیر نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر گیند وقاص کے کورٹ میں ڈال دی۔
"ویسے اگر یہ سمجھ نہیں آتا تو میرے پاس ایک اور مکان آنے والا ہے لیکن ایک ماہ بعد اس کا ایگریمنٹ ختم ہوگا۔"
"وقت کا ہی تو ایشو ہو رہا ہے بھائی میرے۔ بیوی صاحبہ آدھے گھر کا سامان پیک کر کے بیٹھ چکی ہیں اور روز مجھے الارم کی طرح یاد دلاتی رہتی ہیں کہ اگلے ماہ بچوں کے پیپرز قریب ہیں اسی لیے ہمیں اسی ماہ گھر شفٹ کرنا ہے، ورنہ بچے ڈسٹرب ہو جائیں گے خیر چھوڑیں اسے بس اب آپ یہ بتاؤ کب دکھا سکتے ہو امکان۔ کہیں پھر چابی......" وقاص بات ادھوری چھوڑ کر مسکرانے لگا تو شہیر نے بے ساختہ قہقہہ لگا کر دراز سے چابی نکال کے لہرائی۔
"تو بس پھر دیر کس بات کی ہے۔ وقاص نے خوشگوار موڈ میں شہیر سے کہا۔"
شہیر کچھ سوچتا ہوا وقاص سے بولا۔ "کیا سیکٹر ۱۶ کے پاس مل لیں کل؟"
وقاص نے جو اپنے موبائل میں میسج دیکھ رہا تھا ایک دم چونک کے شہیر کو دیکھا۔ "سیکٹر ۱۶۔"
شہیر ایک دم گھبرا گیا کہ پول کھل گئی وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔
"ہاں کیوں۔ کیا ہوا۔"
"لو جی۔ آدھا مسئلہ تو آپ نے ادھر ہی بیٹھے بیٹھے حل کر دیا جناب۔"
شہیر نے ناسمجھی سے وقاص کو دیکھ کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"کیا مطلب......"
"ارے بابا میرا آفس سیکٹر ۲۰ میں ہی تو ہے۔"
شہیر نے گہری سانس لے کر سکون سے فائل واپس دراز میں رکھ دی۔ "اوہ اچھا اچھا، اسی کے ساتھ جو روڈ

ہائی وے پر نکلتی ہے وہ سیدھا کالونی کے مین گیٹ تک جاتی ہے۔

''واہ اس سے اچھی کیا بات ہے بھئی۔ اب کم از کم وقت پر گھر تو جا سکوں گا۔ ورنہ ایک گھنٹہ تو صرف ٹریفک سے ہی مارا ماری کرنے میں نکل جاتا ہے۔'' وقاص نے سر جھٹکتے ہوئے شہیر کو دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

''آپ سمجھیں، میری طرف سے یہ ڈیل ڈن ہے کیونکہ بنا دیکھے ہی مجھے سوٹ کر گیا ہے وہ۔'' ساتھ ہی اپنا موبائل نکال کے چیک کیا جس کی بلند آواز اسے بتاتی ہے کوئی فون کر رہا ہے۔

شہیر نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔

''لگتا ہے قسمت آپ کو ہر حال میں یہ ہی مکان دلانا چاہتی ہے۔''

''بس اب مکان کی حالت دیکھ کر میری پوری اور آدھی گھر والی فیصلہ لے لیں گی۔'' وقاص بات کا اختتام کرتے ہوئے ایک بار پھر فون کی سمت متوجہ ہو گیا۔

''جیسا آپ کو مناسب لگے۔''

''جب آپ بولیں گے میں مکان دکھادوں گا۔''

......☆☆......

سورج اپنا سفر طے کرتا ہوا کہیں اور نمودار ہونے جا رہا تھا پیچھے اداسی سے بھرا ہوا ماحول چھوڑ کر اسی اداسی سے بھری شام کے وقت شہیر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ایگریمنٹ بنا رہا تھا جو کل اسے وقاص کے سپرد کرنا تھا۔ اچانک اسے مالک مکان کا خیال آیا تو وہ موبائل اٹھا کر تفصیل بتانے لگا۔

''جی ہیلو۔'' ''شہیر بول رہا ہوں۔''

''ایک بندہ آیا تو ہے لیکن......'' شہیر کی سماعت میں وقاص کے قہقہے کی بازگشت سنائی دی۔ وہ ایکدم اداس ہو گیا۔

''فیملی والا ہی ہے۔ دو بچے ہیں، کب تک چلے گا یہ سلسلہ میرے ضمیر پر بہت بوجھ بڑھتا جا رہا ہے بھائی۔ چلیں بس یہ آخری ہی کرایہ دار ہوں گے میری طرف سے اس سے زیادہ برداشت......''

''جی مجھے معلوم ہے آپ کی بھی مجبوری ہے لیکن...... اوکے......'' شہیر فون رکھ کر خود کلامی کرنے لگا۔

''کوشش تو کی تھی کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ خاندان بچ جائے اس بار۔ پتہ نہیں کب تک وہ شیطانی چکر چلتا رہے گا۔'' شہیر نے سر کو کرسی کی پشت گاہ سے ٹکاتے ہوئے ایک ہاتھ سے ماتھے کو سہلایا۔ یہ پیسے اور خواہشات کا حصول انسان کو کس قدر گری ہوئی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ نا چاہتے ہوئے بھی دوسرے کو کھڈے میں گرا دیتا ہے اور خاموش رہنے پر مجبور بھی ہوتا ہے۔ شہیر نے بددلی سے ایگریمنٹ کو سائیڈ میں کیا۔

......☆☆......

پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ ہی خوب صورت اور ٹھنڈی روشنی نے پھیل کر انسانوں کو خواب غفلت سے جگانے کا بھرپور بیڑا اٹھایا اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہر گھر سے صبح کی مخصوص چہل پہل کی آوازیں اور افرا تفری والی صورت حال مچی ہوئی تھی۔ ایسے میں جھلائی ہوئی سونیا نے ایک کے بعد دوسرے کارٹن کو کھولا۔

''پتہ نہیں کہاں رکھ دیا ہے عمر تم کچھ اور پہن لو نا۔''

''نہیں ماما مجھے وہی جوگرز پہننے ہیں، کل بھی نہیں نکالے تھے آپ نے۔'' عمر نے منہ بسورتے ہوئے سونیا کو دیکھا۔

''آج شو کا لاسٹ ڈے ہے اور ہم سب بلیک جوگرز پہن کر جا رہے ہیں مجھے نہیں معلوم بس وہی چاہیے مجھے اور ابھی۔''

چوتھی کلاس کے ہونہار اسٹوڈنٹ عمر کے اسکول میں میجک شو کا آج آخری دن تھا، اسی لیے وہ بجائے یونیفارم کے جینز اور بلیک شرٹ میں، میچنگ جوتے پہن کے جانے کی ضد کر رہا تھا۔

''اففف کہاں سے ڈھونڈوں اس وقت۔'' سونیا نے غصے سے ایک نظر عمر کو دیکھا جو اب رونے کی تیاری کرنے لگا تھا اور دوسری نظر وال کلاک کی سمت دیکھا جو اسکول وین آنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ ''اوکے اب یہ لاسٹ کارٹن کھول رہی ہوں اگر اس میں بھی نہیں ملے تو۔ سوری میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' سونیا نے عمر کو گھورتے ہوئے پاس

رکھے کارٹن کو کھولا اور اتفاق سے وہی جوتوں کا نکلا۔

''ہرے، مل گئے مل گئے۔'' عمر نے خوشی سے چیختے ہوئے ایک دم ہی سونیا کو پیچھے کر کے خود شاپر نکالا اور اپنے جوگرز ڈھونڈنے لگا۔

''لاؤ مجھے دو ورنہ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔''

سونیا بے ساختہ مسکرا دی۔

اسی وقت وین کی کرخت آواز سن کے چھوٹی مہر بھی ننھے ننھے قدم اٹھاتی ہوئی بھائی اور ماں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ وین آ گئی پھر سے مہر نے منہ بسورتے ہوئے سونیا کو دیکھا۔

''آج چھٹی کر لوں ماما؟''

''خبردار چلو فوراً باہر نکلو۔ ورنہ وہ ہارن دے دے کے پورے محلے کو اکٹھا کر لے گا۔'' سونیا نے پھرتی سے مہر کو گود میں لیا اور عمر کو باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گیٹ کی سمت بڑھنے لگی۔ اچھے بچے روز چھٹی نہیں کرتے دیکھو بھائی بھی تو جاتا ہے نا اسکول۔''

''ماما نیند نہیں پوری ہوتی نا۔ یہ اسکول رات میں نہیں ہو سکتا تھا۔'' مہر نے سونیا کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے لاڈ سے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

''چلو اس پر بعد میں بات کریں گے ابھی آپ جاؤ۔ بھائی بھی آ رہا ہے۔'' سونیا نے گود سے اتارتے ہوئے آگے بڑھایا اور پلٹ کے عمر کو دیکھنا چاہا جو تیزی سے جوتے پہننے کے بعد اپنا تھرماس اٹھانے کچن بھاگ رہا تھا۔ ہری اپ عمر۔'' سونیا نے مہر کو وین میں چڑھتے دیکھ کر فوراً ہی بلند آواز میں عمر کو آواز لگائی مبادا وین والا سمجھے آج وہ نہیں جائے گا۔

''او کے ماما بائے۔'' عمر نے بھاگتے ہوئے سونیا کو بائے کہا اور پھرتی سے وین میں چڑھ گیا۔

سونیا نے دونوں کو جاتے دیکھ کے سکون کی سانس لی اور گھر کی سمت دیکھ کر تھکے تھکے انداز میں سوچنے لگی ایک بار پھر سارا سامان پیک کروں اب۔ پتہ نہیں مکان کب ملے گا۔ پوچھتی ہوں وقاص سے۔ اتنی مشکل ہو رہی ہے مجھے۔ ذرا احساس نہیں ہے۔ سونیا بڑبڑاتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور ایکدم ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ سامنے ہی تین کارٹن کھلے ہوئے پڑے تھے۔

''ہیلو باجی۔'' الماس کی فریش آواز سن کر سونیا نے بے دلی سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا ہوا، خیر تو ہے اتنی بری شکل بنا رکھی ہے۔'' الماس نے سونیا کو چھیڑتے ہوئے کچن کی سمت قدم رواں کیے۔
''تمہیں کیا تم جاؤ بس اپنے آفس پھر پیچھے تمہارے بھائی صاحب بھی نکل جائیں۔'' سونیا نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے الماس کو گھورا۔
''ارے رے رے..... صبح صبح کس کا منہ دیکھ لیا تھا باجی جو اتنا غصہ ہو رہی ہیں۔'' الماس نے فریج سے جوس نکالتے ہوئے حیران ہو کر سونیا کو پلٹ کے دیکھا جو سارا سامان بکھرے خود بھی الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔
''یہ دیکھ لو تم۔'' سونیا نے ہاتھ کے اشارے سے آس پاس کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ ''پچھلے پندرہ دن سے یہ سب ایسا ہی پڑا ہوا ہے اور میں ضرورت کے وقت ان میں سے سامان نکال رہی ہوں۔''
''باجی یہ تو آپ کی پرانی عادت ہے۔ ہر کام وقت سے پہلے شروع کر دینا اور پھر بعد میں واویلا مچانا۔'' الماس نے بنا کسی لگی لپٹی کے سونیا کو آئینہ دکھایا۔
''کیوں آپ پہلے سے ہی پیکنگ شروع کر دیتی ہیں، مکان تو ملنے دیا کریں پھر سب مل کے کرا لیتے۔''
''کون سب؟ تم یا تمہارے بھائی۔'' سونیا نے الماس کا بے فکری انداز دیکھتے ہوئے جواب طلبی کی۔
''ایک ہی دن میں مکان بھی فائنل ہو جاتا ہے کبھی کبھی پھر پورے مکان کا سامان سمیٹتے ہوئے کتنی مشکل ہوتی ہے معلوم ہے تمہیں۔''
''ابھی بھی تو آپ کو مسئلہ ہو رہا ہے نا۔ اس وقت سب مل کے......''
''بس کرو الماس۔ ایک تو تم میری مشکل کا احساس کرنے کے بجائے، مجھے ہی نصیحتیں کرنے لگی ہو۔'' سونیا نے تنگ کے الماس کو خاموش کرا دیا۔
''اور کیوں جا رہی ہو آج اتنی جلدی''
''اچھا اچھا سوری بھئی۔ یہ بتائیں آپ کے شوہر نامدار جاگ گئے یا......'' الماس نے فوراً ہی موضوع بدلنے میں عافیت جانی۔
''پہلے یہ بتاؤ اتنی جلدی؟'' سونیا نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔
''کیا کریں یار۔ ٹرانسفر کرانا ہے نا اپنا تو سوچا ہر کام وقت پر ہی کر لوں تا کہ کھڑوس باس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔'' الماس نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے داد طلب نگاہوں سے سونیا کی سمت دیکھا۔ ''اچھا کر رہی ہوں نا۔''
''مجھے کیا معلوم۔ صبح سے اس بکھیڑے میں لگی ہوئی ہوں۔ کیا کیا دیکھوں میں اکیلی جان۔'' سونیا کی سوئی ایک ہی جگہ پھنس چکی تھی۔
الماس نے ہار مانتے ہوئے سر نفی میں ہلایا اور وقاص کو دیکھنے ان کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

......☆☆......

شہیر نے چابی نکال کے سامنے رکھی اور اسے گھورنے لگا۔
''ہیلو پاپا۔'' الشبہ نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر شہیر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔
''کیسے ہیں آپ۔''
''ہیلو پاپا کی جان۔'' شہیر نے مسکراتے ہوئے اپنی بیٹی کو دیکھا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔
''کیا بات ہے صبح صبح مسکے لگ رہے ہیں۔''
''وہ پاپا......'' الشبہ نے بات ادھوری چھوڑی۔
''بولو بولو۔ کیا چاہیے میری بیٹی کو۔'' شہیر نے ناشتہ کرتے ہوئے بیٹی کا حوصلہ بڑھایا۔
''میرا اسکول ٹرپ پر جا رہا ہے۔'' الشبہ نے جھجک کے شہیر کی سمت دیکھا۔ ''میں...... وہ...... میں جانا چاہتی تھی...... اگر آپ اجازت دیں تو......''
''ہوں۔'' شہیر نے متوقع خرچے کا سن کے ہنکارا بھرا۔
''کب جا رہا ہے اور کتنے پیسے چاہیے ہوں گے۔''
''بس بیس ہزار۔ آنا جانا اور کھانا پینا بھی شامل ہے اس میں۔'' الشبہ نے فوراً ہی سارا حساب کتاب دینا شروع کر دیا۔ ''اگلے ماہ ہم اسکول سے ہی جائیں گے اور دس دن بعد واپسی۔ میڈم بھی جا رہی ہیں اور ہماری بکنگ بھی وہی کرائیں گی۔''
''اچھا...... اچھا۔'' شہیر نے الشبہ کی نان اسٹاپ

گاڑی دیکھ کر خوش دلی سے جواب دیا۔ اور ہماری بیٹی دس دن رہ لے گی پاپا کے بنا۔

''اوہ پاپا......'' الشبہ نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑی اور شہیر کے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا۔

''چلو میں سوچتا ہوں کیا ہو سکتا ہے۔'' شہیر نے حساب کتاب لگاتے ہوئے بیٹی کو آسرا دیا۔ ''ابھی تو فیس بھی جمع کرانی ہے پھر یہ خرچہ۔'' دل ہی دل میں شہیر نے کمیشن کی مد میں آنے والے پیسوں کا سوچا۔

''لیکن پاپا......'' الشبہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔

شہیر اپنی ہی سوچوں میں گم تھا اس نے سنا نہیں الشبہ شہیر کو خاموش دیکھ کر شرمندہ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی ابھی کالج اور کوچنگ کی فیس کے بعد یہ خرچہ پاپا کے لیے مشکل کھڑی کر دے گا۔ صرف بیس ہزار تو نہیں جمع کرانے تھے راستے کے خرچے کے لیے بھی کچھ ہاتھ میں ہونا لازمی تھا لیکن اسکول کا یہ آخری سال تھا وہ یہ ٹرپ ہرگز بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھی پھر پتہ نہیں کون سی دوست کہاں جائے گی کب ملنا ہوگا۔ الشبہ نے یاسیت سے سوچوں میں گم شہیر کو دیکھا۔

''کاش پاپا کسی طرح پیسے ارینج کر دیں۔''

......☆☆......

''کیا رہا گھر کا وقاص؟'' سونیا نے وقاص کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی اور فوراً ہی سوال پوچھ لیا۔

''آج دکھائے گا وہ اسٹیٹ ایجنٹ۔'' وقاص نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اتنے دن ہو گئے ہیں۔'' سونیا نے ایک بار پھر جھلاتے ہوئے وقاص کا پرسکون انداز دیکھا۔

''بھئی تم بھی تو کسی کی نہیں سنتی ہو۔ پہلے مکان ملنے دیا کرو پھر یہ سب الٹ پلٹ کیا کرو۔'' وقاص نے کن انکھیوں سے لاؤنج دیکھتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

''جیسے ہی سنتی ہو ہم شفٹ کرنے لگے ہیں اسی وقت پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے، پیکنگ کے نام پر ہم سب کو ٹارچر کرنے لگتی ہو۔''

''کیا؟ میں ٹارچر کرتی ہوں۔'' سونیا کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

وقاص نے مایوسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب اگلے پندرہ منٹ تک اس نے ملازمہ کی عدم دستیابی، ان کی کام چوری، وقاص کی بے پروائی، بچوں کی شرارتوں سے لے کر الماس کی شادی تک کی تفصیل سنی تھی۔

''اور آپ بولتے ہیں میں ٹارچر کرتی ہوں۔'' سونیا کی آواز بھرا گئی۔ ''یہ صلہ ملتا ہے مجھے۔''

''ارے یار۔ اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ سوری آئی ایم ویری سوری۔ اچھا لو تمہارے سامنے ہی فون کر لیتا ہوں تاکہ اندازہ ہو جائے تمہیں بھی، میں سیریس ہوں اور جانتا ہوں تم کس قدر مشکل میں ہو۔'' وقاص نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے فوراً ہی موبائل نکال لیا اور جیسے ہی شہیر کا نمبر ڈائل کرنے لگا اس کی کال آ گئی۔

''لو دیکھو اسی اسٹیٹ ایجنٹ کی کال آ رہی ہے۔ اس کو بھی کمیشن کی ضرورت ہے ہمیں مکان کی۔ دونوں کا کام پھنسا ہوا ہے اور تمہیں لگتا ہے ہم سب ہی سست ہیں جان کر تمہیں اس مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔''

''ہیلو۔'' وقاص نے بات کرتے کرتے فون اٹھا لیا۔ سونیا جو اسے جواب دینے لگی تھی، ایکدم خاموش ہو کے اسے گھورنے لگی۔

''کتنے بجے؟''

''اچھا......اچھا ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔''

''ہاں ہاں میرے بھائی میں اپنی مرضی سے ہی وہ گھر لوں گا۔ دکھا تو دو پہلے۔ کیوں فکر مند ہو رہے ہو۔'' وقاص نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سونیا کی تسلی کرائی۔ ''میں اپنی فیملی کو بھی ساتھ ہی لے آؤں گا تاکہ ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ ہو سکے۔''

''ایگریمنٹ؟ اچھا چلو لے آنا وہ بھی۔'' وقاص نے شہیر کی بھی تسلی کرائی۔ ''بھئی ہماری بیگم ہی فیصلہ کریں گی رہنا انہوں نے ہے۔ مکان جیسا بھی ہو وہ جانیں ان کا کام جانیں۔''

سونیا نے ہنہ بول کے وقاص کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''چلیں پھر ملتے ہیں آج شام کو۔''

''شکریہ بھائی میرے۔'' وقاص فون بند کر دیا ہے اور مسکراتے ہوئے سونیا کو اپنی سمت گھورتے ہوئے پایا۔

''ارے بھئی آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جاؤ گی کیا۔''

تیار رہنا پانچ بجے تک آجاؤں گا سب ساتھ ہی چلیں گے ۔اب تو مسکرا دو۔''
''سونیا کے چہرے پر چھایا ہوا تناؤ بے ساختہ ختم ہوگیا۔''

......☆☆......

''بھائی جان یہ تو بہت مزے کی جگہ ہے۔'' الماس نے شہر سے دور ہائی وے پر بنی ہوئی کالونی دیکھ کے حیرت اور خوشی سے اعتراف کیا۔''مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔کراچی جیسے شہر میں اتنا صاف ستھرا بھی کوئی پراجیکٹ ہوسکتا ہے۔''
''شہر سے دور ہے نا اسی لیے ابھی تک بچا ہوا ہے۔'' وقاص نے بھی صاف ستھری سڑک دیکھتے ہوئے خوشی محسوس کی۔''سب سے اچھی بات ٹریفک کا نا ہونا ہے ویسے۔دیکھو نا ہارن کی مکروہ آواز نا ہی دھواں۔کیسی اچھی سڑک ہے۔''
''ہاں ادھر تو گاڑی ڈرائیو کرنے کا بھی مزہ آتا ہوگا۔''سونیا نے سامنے بچھی ہوئی کیٹ آئیز کو دیکھتے ہوئے وقاص کی سمت چہرہ کیا۔''میرا ووٹ تو ابھی سے اس مکان کے لیے پکا سمجھیں۔''
''میرا بھی بھائی جان۔'' الماس نے بھی فوراً ہی ہاتھ کھڑا کردیا۔
''اور ہمارا بھی بابا۔'' عمر نے بھی آس پاس بنے ہوئے پارک دیکھ کے مہر کی توجہ ادھر کرائی۔
''واہ بھئی واہ۔یہ تو پہلی بار ہوا ہے ہم سب اس ان دیکھے گھر کے لیے راضی ہوگئے ہیں۔'' وقاص نے قہقہہ لگاتے ہوئے گیر بدلا اور اپنا موبائل نکال کے شہیر کو فون کرنے لگا۔
''یہ پتہ نہیں کہاں رہ گیا ہے۔اب اس چیک پوسٹ سے انٹری کیسے ہوگی۔''
''واہ سکیورٹی کا بھی اچھا سسٹم ہے۔'' سونیا نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔
''ظاہر ہے آبادی کہاں ہے آس پاس۔اسی لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے رات میں تو یہ جگہ کافی خوفناک لگتی ہوگی چاروں طرف ہو کا عالم ہو جاتا ہوگا نا۔'' وقاص نے ارد گرد دیکھتے ہوئے ویرانی محسوس کی۔''اسٹریٹ لائٹس بھی صرف وہی ہیں جو اس کالونی کے لیے راستہ ہے۔''
''وہ کیا ہے بھائی جان۔'' الماس نے دور چند لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا تو سوال پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔
''پتہ نہیں۔'' وقاص نے بھی غور سے اس جگہ کو دیکھا۔''چند لوگ ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔غریب طبقہ لگتا تھا۔''
''اوہ۔یہ تو کوئی جنازہ ہے۔'' وقاص نے بے ساختہ بلند آواز میں کہا تو سونیا کے ساتھ الماس بھی چونک گئی۔
''جنازہ؟ یعنی وہ قبرستان ہے وقاص۔'' سونیا نے گھبراتے ہوئے تصدیق چاہی۔
''اتنا قریب۔''
''لگ تو رہا ہے یار۔'' وقاص نے بھی سر کھجاتے ہوئے حیرانی سے وہ جگہ دیکھی۔قبرستان کی حدود جہاں سے شروع ہورہی تھیں اسی کے بہت پاس اس رہائشی کالونی کی باؤنڈری وال لگ رہی تھی۔''اتنا کلوز ہونے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔'' وقاص نے دل ہی دل میں سوچا اور ایک بار پھر جنازے کو دیکھنے لگا۔

......☆☆......

''سوری سوری۔'' شہیر نے اپنی بائیک وقاص کی گاڑی کے قریب روکتے ہوئے معذرت کی۔
''ہائی وے پر کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا کافی ٹریفک بلاک تھے۔'' شہیر نے وقاص کو الجھی ہوئی نگاہوں سے دائیں سمت دیکھتے ہوئے دیکھا تو خود بھی وہیں دیکھنے لگا۔
''کیا ہوا خیریت تو ہے۔'' شہیر نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکالتے ہوئے سرسری سے انداز میں وقاص سے پوچھا۔
''آئیں چیک پوسٹ کی سمت چلتے ہیں۔'' اور آگے قدم بڑھا دیے۔
''یار وہ قبرستان ہے۔'' وقاص نے فوراً ہی شہیر کو اطلاع فراہم کی۔
''جی ہے۔'' شہیر نے حیرت سے وقاص کو دیکھا۔''
''تمہیں حیرت نہیں ہوئی رہائشی کالونی کے اتنے قریب کون قبرستان بناتا ہے یا شاید یہ ہی اس جگہ کے قریب بنی ہے۔''

''یہ تو بنانے والے سے پوچھنا بنتا ہے بھائی۔'' شہیر نے اپنا آئی ڈی واپس لیتے ہوئے وقاص کے کندھے پر ہاتھ دھرا۔ ''آپ اکیلے تو اس گھر میں نہیں رہیں گے ویسے۔ یہ دیکھیں کم و بیش دو ڈھائی سو گھرانے رہتے ہیں ادھر اور کافی عرصے سے۔''

''پھر بھی کچھ عجیب سا لگا مجھے۔'' وقاص نے ایک بار پھر الجھی ہوئی نظروں سے کالونی اور قبرستان کی حدود کا موازنہ کیا۔

''فیصلہ کرنا ابھی بھی آپ کے ہی ہاتھ میں ہے وقاص۔ یقین کریں میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہر چیز آپ کے سامنے ہی ہے۔'' شہیر نے ایک بار پھر موقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنی صفائی دی۔ ''کہیں بعد میں آپ بولیں مجھے تفصیل کیوں نہیں بتائی۔''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں اپنی رضامندی سے ہی مکان لوں گا۔ وہ بس ایسے ہی۔'' گاڑی کے قریب پہنچ کے وقاص نے اس ٹاپک کو کلوز کرنا ہی مناسب جانا۔

''چلیں پھر میں آگے بڑھتا ہوں آپ میرے پیچھے آجائیں۔'' شہیر نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے وقاص کا کندھا تھپتھپایا۔

''او کے۔'' وقاص نے بھی گہری سانس لیتے ہوئے ساری سوچوں کو جھٹکا۔

''کیا ہوا؟'' سونیا نے تیزی سے سوال پوچھا۔

''کچھ نہیں بھئی۔'' اس کے پیچھے چلنا ہے بس۔'' وقاص نے سرسری سا جواب دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک نظر قبرستان کی سمت دیکھا۔

''بابا...... بابا دیکھیں عمر تنگ کر رہا ہے۔'' ایکدم مہر نے چیخ کر وقاص کو اپنی سمت متوجہ کرنا چاہا۔

''کوئی نہیں کوئی نہیں۔ بابا یہ گندی ہے۔'' عمر نے بھی جوابی کارروائی کی۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے شیشہ کیوں بند کیا میری طرف کا۔'' عمر نے چیختے ہوئے سوال پوچھا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' وقاص نے جو ذہنی طور پر کچھ الجھ گیا تھا ایک دم دونوں کو جھڑک دیا۔

''خاموش ہو جاؤ۔''

''شش۔'' سونیا نے وقاص کا موڈ بھانپ کے فوراً ہی دونوں بچوں پر ایک تیز نظر ڈالی اور الماس کو اشارہ کیا وہ بچوں کا مسئلہ حل کرے۔

''کس گلی میں گیا وہ۔'' وقاص نے اچانک سونیا کو مخاطب کیا۔

''ارے ابھی تو ادھر ہی تھا۔'' سونیا نے حیرت سے وقاص کو دیکھا۔

''ایکدم کہاں غائب ہو گیا وہ اسٹیٹ ایجنٹ۔''

''اسی وقت وقاص کے فون کی گھنٹی بجی۔ ہاں بھئی کدھر رہ گئے تم۔'' وقاص نے شہیر کو مخاطب کیا۔

''بھائی اپنے دائیں سمت دیکھیں۔ جی جی وہی۔ بس ذرا سا آگے آجائیں۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ کو۔ دائیں سمت کے بالکل آخری والے مکان کے پاس کھڑا ہوں میں۔'' شہیر نے تفصیل سے جواب دیا تو وقاص نے بھی گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

''وہ رہا۔'' بالآخر وقاص نے شہیر کو دور ایک مکان کے پاس کھڑے ہوئے دیکھ کے شکر کا کلمہ ادا کیا۔ جبکہ سونیا حیرت سے اس دیوار کو تک رہی تھی جو باؤنڈری وال تھی۔ یقیناً اس کے پیچھے قبرستان ہی تھا۔ سونیا، جیسے ہی وقاص کو اس طرف دھیان دینے کا کہنے لگی اسی وقت عمر اور مہر ایک بار پھر جھگڑ نے اس کی توجہ بچوں کی طرف ہو گئی۔

''اتنی تیزی سے آگئے میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔'' شاندار گھر کو دیکھ کے وقاص کا موڈ از خود ہی بہتر ہو گیا تھا۔

''بائیک کا یہی فائدہ ہوتا ہے جتنی دیر میں آپ نے گاڑی موڑی میں گلی تک آگیا تھا۔ سیدھی سیدھی روڈ ہے مین گیٹ سے بس آپ نے اس بات کا دھیان رکھنا ہے۔''

''یہ......!'' ایکدم الماس نے گھر کے مین گیٹ کے انتہائی قریب چند درختوں کے پار دیوار پر لگے ہوئے سیکورٹی کیمرے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا اتنی سخت سیکورٹی ہے ادھر۔''

''ارے یہ۔ نئے نئے گھر بسے تھے تو اتنی سیکورٹی نہیں تھی تو یہ جو کوٹھے بنے ہوئے ہیں آس پاس وہاں سے

بچوں وغیرہ نے دیوار میں شگاف کردیے تھے کچھ جگہ ۔اب ان بچوں کو کتنی بار منع کرتے، اسی لیے اس کا حل یہ نکالا جگہ جگہ کیمرے لگادیے ہیں خاص طور پر جو گلی بالکل ہی آخر میں ہے اس میں۔'' شہیر نے سکون سے پوری تفصیل بتائی اور الماس کو دیکھا جو اِدھر اُدھر دیکھ کر گھر کے ساتھ پڑوسیوں کے گھر کا بھی معائنہ کررہی تھی۔

''ہاں بھئی تم اچھی طرح دیکھ لو۔ ایسا نہ ہو اگلے ہی دن تم کو......'' وقاص نے ہنستے ہوئے سونیا کو چھیڑا جو بہت غور سے برابر والے گھر کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ گھر بہت کلوز نہیں ہے۔'' سونیا نے ایک دم شہیر کو مخاطب کیا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے دو فیملیز کے گھر ہوں یہ۔''

شہیر ایک دم گڑبڑا گیا۔

''جی......وہ......وہ......''

''باجی چھوڑو نا ہمیں کیا۔ ہمارا گیٹ الگ ہے ان کا الگ ہے۔''

''لیکن دیکھو ان کی کھڑکی میں کوئی کھڑا ہو کر اس گھر کا پورا جائزہ لے سکتا ہے۔'' سونیا نے بغور سامنے کھڑکی کو دیکھا جس کا ہلتا ہوا پردہ بتا رہا تھا۔

''کوئی اس کے پیچھے ہے۔''

''کیا ہم اندر سے گھر دیکھ سکتے ہیں، یا سارا دن باہر ہی کھڑے رہیں گے۔'' ہلکے پھلکے طنز کے ساتھ وقاص نے سونیا کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوال پوچھا تو وہ جھینپ گئی۔

''آئیں اندر سے بھی گھر دیکھ لیں۔'' شہیر نے فوراً ہی چابی نکال کے گھر کا مرکزی دروازہ کھولا جس میں صرف ہلکی سی کنڈی لگی ہوئی تھی۔

''اوہ واؤ۔'' الماس نے اندر قدم رکھتے ہی سونیا کی جانب دیکھا اور ستائشی نظروں سے سامنے لان کو دیکھا۔ جہاں مختلف درختوں کے ساتھ، لان کے بیچوں بیچ دو بینچ کے ہمراہ ایک جھولا بھی لگا ہوا تھا۔

''باجی کی چاندنی ہوگئی بھئی۔''

سونیا جس کو گارڈننگ کا شوق تھا وہ بھی لان کی حالت دیکھ کے سر ہلانے لگی۔

''یہ تو بہت عمدہ ہے۔'' رنگ برنگے پھول لائن سے سجے ہوئے تھے جو ماحول کے ساتھ طبیعت پر بھی بہت اچھا اثر ڈال رہے تھے لیکن وہ کچھ مرجھائے ہوئے تھے ،شاید خالی گھر ہونے کے سبب کسی نے ان کی دیکھ بھال نہیں کی تھی۔ مگر شہر سے دور ہونے کے باعث زمین میں قدرتی کھاد موجود تھی اس لیے وہ مکمل طور پر خراب نہیں ہوئے تھے۔

''آپ کو گھر بھی پسند آئے گا۔ کچھ تبدیلیاں مالک مکان نے کی تھیں۔ ویسے اس پوری کالونی کا نقشہ ایک ہی طرز کا تھا لیکن آپ کو علم ہے ہمارے لوگوں کا جب تک اپنی مرضی سے کچھ بدل نہیں دیں ان کو چین نہیں آتا۔'' شہیر نے بھی مسکراتے ہوئے سب کاری ایکشن دیکھا اور اپنا کمیشن کھرا ہوتا محسوس کرنے لگا۔

''چلیں اندر تو چلیں۔'' وقاص نے سونیا کو الماس کی جانب دیکھتے ہوئے اندر بڑھتے ہوئے کہا تو شہیر نے بھی فوراً ہی آگے بڑھ کے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

''کیا ہوا شہیر۔''

''وہ کچھ وقت سے بند ہے نا تو شاید لاک میں کچرا آگیا ہے۔'' شہیر نے ایک بار پھر چابی کو دروازے میں گھماتے ہوئے سرسری سا انداز اپنایا۔

''یہ لیں کھل گیا۔'' بالآخر کچھ ہی لمحے بعد شہیر نے سب کو مخاطب کیا اور گیٹ کھولنے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی اند رسے ایک کالی بلی نے باہر کی جانب چھلانگ لگائی، شہیر بے ساختہ چیخ کے سائیڈ میں ہوگیا اور وقاص بھی بری طرح چونک گیا جو اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ سونیا اور الماس ایک دم ہنس دیں تو شہیر شرمندہ سا ہوگیا۔

''گھر خالی ہو تو یہ جانور رہنے لگتے ہیں۔''

وقاص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

''فکر نہ کرو۔ ہمیں بھی علم ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ چلو اندر سے بھی دکھادو۔ دیکھیں ذرا اور کیا کیا نکلتا ہے۔'' ایک ایک کرکے سب اندر داخل ہوکر گھر کا معائنہ کرنے لگے کہ ایکدم دھاڑ کی آواز سے گیٹ بند ہوگیا۔ سب ڈر کے چونک گئے اور پھر پیچھے مڑ کے دیکھا تو دروازے کے پاس دونوں بچے کھڑے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی سہمے ہوئے تھے۔

''یہ کیا بدتمیزی تھی۔'' وقاص بھی باقی لوگوں کی طرح

سمجھا کہ یہ کام انہوں نے کیا ہے۔
شہیر فوراً ہی آگے بڑھ کے اس کے کندھے تھام کے آگے بڑھا دیتا ہے۔
''ارے کوئی بات نہیں۔ بچے ہی تو ہیں۔ آپ آئیں اندر چلیں۔''
سونیا اور الماس بھی بچوں کو گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئیں بچوں نے ایک دوسرے کو حیرانی دیکھنے لگے۔
''میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' عمر نے مہر کو مخاطب کیا۔ ''اور میں نے بھی۔'' مہر نے بھی منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔
''کچن بھی اچھا بنا ہوا ہے باجی۔'' الماس نے سونیا کی توجہ امریکن طرز کے بنے ہوئے کیبنٹ کو دیکھتے ہوئے کہا اور کچن سے منسلک چھوٹے دروازے کو دیکھ کر اسے کھولنے لگی۔
''یہ بیسٹ ہے نا؟''
''ہوں۔'' سونیا نے بھی مسکراتے ہوئے اپنا پرس کچن سلیب پر رکھا اور الماس کے پیچھے باہر نکل گئی۔ دونوں نے خود کو لان میں پایا۔ ''مجھے شروع سے ہی یہ طرز بہت پسند تھا۔'' سونیا نے اعتراف کیا۔
''انگلش فلموں میں اتنا اچھا لگتا ہے نا۔'' الماس نے شرارتی انداز اپنایا اور دونوں بہنیں قہقہہ لگاتے ہوئے لان میں بنے ہوئے جھولے پر بیٹھ کے پینگیں لینے لگیں۔
''ماسٹر بیڈ روم نیچے ہے اور دو بیڈ روم اوپر ہیں، دونوں کے ایک ایک دروازے ٹیرس میں بھی نکلتے ہیں اور چھت کی سیڑھی باہر کار پورچ کی طرف سے بھی ہے دوسری یہ ہے۔'' شہیر نے پروفیشنل انداز سے مکان کا نقشہ بتایا۔
''ہر کمرے میں اٹیچ باتھ روم بھی ہے اور......''
''یار......'' وقاص نے شہیر کو دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تو شہیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔
''کچھ الگ سے فیلنگ آ رہی ہیں مجھے۔'' وقاص نے کھوئے کھوئے انداز میں شہیر کے حواس خطا کیے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی گھٹن محسوس ہوئی تھی جو ابھی تک ہے۔

''ک...... کک...... کیا مطلب، کیسی فیلنگ۔ کیسی گھٹن۔'' شہیر ایکدم بوکھلا گیا۔
وقاص اپنا سر کھجاتے ہوئے شہیر کو دیکھتا ہے۔
''کچھ سمجھ نہیں آ رہا کیسے بیان کروں لیکن کچھ تو ہے۔''
''وہ...... وہ...... دراصل خالی گھر ہے نا تو۔ شاید اسی لیے......'' شہیر نے بات بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ ''ایسا تو نارمل ہے وقاص۔ تازہ ہوا کا دخل نہیں ہو تو گھٹن ہو جاتی ہے۔''
وقاص نے سر جھٹک کے موضوع بدلا۔
''اچھا ایگریمنٹ لائے ہو نا ساتھ؟''
''وہ باہر میری بائیک میں ہے۔ پرانا ہے اسی مکان کا۔ آپ پڑھ لیں تو میں دوسرا بنوالوں گا میں نے نیا نہیں بنایا کہ شاید آپ کو مکان پسند نہیں آئے تو بے کار ہو جائے گا وہ۔'' شہیر نے بھی فوراً بات بدل دی۔
وقاص سر ہلاتے ہوئے شہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔
''چلو یار باہر چلو۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے ادھر۔''
شہیر باہر کی سمت منہ موڑتے ہوئے وقاص کی مزید تسلی کرتا ہے۔
''دراصل بند گھر میں گھٹن سی ہو جاتی ہے۔ تازہ ہوا جو نہیں آتی۔''
''ہاں شاید۔ اسی لیے۔'' دونوں باہر نکل آئے اور شہیر کی بائیک کے پاس کھڑے ہو کے اگریمنٹ ڈسکس کرنے لگے۔'' شہیر بار بار کن انکھیوں سے برابر والے گھر کو دیکھ رہا تھا جس کی کھڑکی کا ایک پردہ مسلسل ہل رہا تھا۔ وقاص نے بھی اسے محسوس کر کے پوچھ لیا۔
''کیا ہے اس گھر میں بھائی میرے جو اس طرح......''
شہیر چونک سا گیا۔
''ارے کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں نا۔''
وقاص شرارتی انداز میں مسکرایا ہے۔ ''تم بار بار ادھر ایسے دیکھ رہے ہو جیسے......''
شہیر جھینپ کر مسکرا دیا۔
وقاص فائل کو دیکھتے ہوئے بولا۔
''ہم کچھ تو ہے جناب جس کی پردہ داری ہے۔'' پھر

آگے ہو کے شہیر کی طرف جھک کے راز داری سے بات مکمل کی۔ اگر کوئی حسین لڑکی وڑکی ہے تو دیکھو مجھے چپکے سے بتادو میری بیوی کے سامنے بھولے سے بھی تذکرہ نہیں کرنا ورنہ وہ مر کے بھی یہ مکان نہیں لینے دے گی۔''

شہیر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ دراصل ادھر ایک بوڑھے میاں بیوی رہتے ہیں جو......''

''دھت بوڑھے انکل آنٹی بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ جن کو تم ایسے چھپ چھپ کے دیکھے جا رہے تھے حد کر دی یار۔ میں ایویں ہی کسی خوش فہمی کا شکار ہو رہا تھا۔'' وقاص نے شہیر کی بات کاٹی۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ ان کی کوئی بیٹی ویٹی ہے؟''

شہیر ہنستے ہوئے جواب دیتا ہے۔ ''وہ میاں بیوی کافی ایجڈ ہیں اور ان کا ایک ہی بیٹا ہے جو......''

وقاص نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

''چھوڑو میاں۔ کیا بوریت بھری باتیں کر رہے ہو۔''

''سن تو لیں۔'' شہیر نے شاید کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔

وقاص شہیر کو بغور دیکھتا ہے۔

''دراصل وہ میاں بیوی نہیں چاہتے کوئی اس مکان میں رہنے آئے۔''

وقاص ایک دم چونک گیا۔ ''وہ کیوں بھئی۔''

شہیر نے گہری سانس لے کر نظریں نیچی کر لیں۔

''تاکہ ان کی پرائیویسی ڈسٹرب نہ ہو۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' وقاص نے بے ساختہ اس مکان کی سمت دیکھا۔ ''پوری کالونی ان کی ہے کیا۔''

''اسی لیے ان دونوں نے اس مکان کے بارے میں کافی من گھڑت باتیں پھیلا رکھی ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' وقاص نے حیرت سے شہیر کی سمت دیکھا۔

''کیسی باتیں۔''

شہیر ایک دم جھجک کے رک گیا۔

''وہ دراصل......وہ......''

''ارے بھائی مکمل کر بتاؤ۔ اگر ہم ادھر رہنے لگے تو معلوم تو ہونا چاہیے نا۔ آس پڑوس کیسا ہے اسی حساب سے ان سے تعلقات بنانے جائیں گے۔''

شہیر نے دھیمے لہجے میں وقاص کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں نے مشہور کر رکھا ہے یہ گھر...... یہ گھر......'' اچانک تیز آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔ وقاص شہیر دونوں اچھل کر رہ گئے۔ الماس اور سونیا باتیں کرتی ہوئی باہر نکلتی ہیں تو شہیر کی بات ادھوری رہ جاتی ہے۔''

''گھر تو اچھا ہے بھائی جان۔''

سونیا نے بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتے تائید کی۔

''ہاں مجھے بھی پسند آیا۔''

شہیر نے خوش ہو کر وقاص کی سمت دیکھا۔

''دیکھا میں نے کہا تھا نا۔ گھر آپ کی ریکوائرمنٹ کو پورا کرتا ہے۔''

''ارے بابا۔ لوکیشن مجھے بھی پسند آئی تھی تب ہی تو ان کو دکھانے لایا ہوں۔ ہاں وہ کیا بتا رہے تھے تم، ان کے بارے میں۔'' وقاص نے ہاتھ سے پڑوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہیر کو بات مکمل کرنے کا کہا۔ ''کیسی باتیں پھیلا رکھی ہیں۔''

''پھر کبھی۔ اب تو آپ ادھر ہی آ کر رہیں گے۔ سب معلوم ہو جائے گا۔'' شہیر نے دل ہی دل میں وقاص سے معذرت کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور فائل اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ''آئیں اب گھر کو پوری طرح دیکھ لیں اور مجھے بتا دیں کیا کام کرانا ہے تاکہ میں اسی ویک گھر ورکنگ پوزیشن میں لے آؤں۔''

''بڑی جلدی ہے بھئی۔'' وقاص نے فائل پر سرسری سی نگاہ ڈالی۔

''جتنا جلدی کام ہوگا اتنی ہی جلدی میرا کمیشن ملے گا نا۔'' شہیر نے متوقع کمیشن ملنے کی خوشی میں خوشگوار انداز سے جواب دیا

''اپنے کمیشن کے چکر میں ہمیں نامروا دینا دوست۔'' وقاص نے شہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے کہا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ شہیر لمحہ بھر کے لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

شہیر اور وقاص کے جانے کے بعد سونیا الماس لان میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگیں، الماس کو عمر نے آواز دے کے جھولے کی طرف بلایا تو وہ وہاں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد سونیا نے سرسری سی نگاہ آس پاس دوڑائی تو ایک بار پھر نظر برابر والے گھر کے ہلتے ہوئے پردے پر پڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پردہ برابر ہو گیا۔ سونیا نے کندھے اچکا کے اپنی نظریں پھیر لیں سامنے ہی ایک چمکتی ہوئی گیند پڑی تھی جو پہلے نہیں تھی۔ سونیا بے دھیانی سے اسے دیکھنے لگی اور آہستہ سے کک مار کے اس کو سائیڈ میں کر دیا۔

''الماس ادھر آؤ۔'' سونیا نے بلند آواز میں بہن کو پکار کے کچن کے دروازے سے داخل ہوئی تاکہ اوپری منزل بھی دیکھ لی جائے۔

''او کے بچو، اب آپ لوگ کھیلو میں ذرا آپ کی ماما کی بات سن لوں۔''

''او کے خالہ۔'' عمر اور مہر نے الماس کو جانے کی اجازت دی تو وہ قہقہہ لگاتی ہوئی گھر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ میرا کمرا باجی۔'' سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ دیکھتے ہی الماس نے اعلان کر دیا۔

''او کے او کے۔ لے لینا دوسرا بھی تو دیکھ لو۔''

''نہیں نہیں مجھے یہ ہی چاہیے اس کی کھڑکی دیکھیں سیدھی لان میں کھل رہی ہے واؤ۔'' الماس نے فرانسیسی طرز کی کھڑکی کھول کے نیچے دیکھا اور بچوں کو دیکھ کے ہاتھ لہرایا۔

''چلو ٹھیک ہے پھر دوسرا کمرہ بچوں کے لیے سیٹ کر دیں گے۔'' سونیا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ''ویسے مجھے یہ بھی پسند آئی بات کہ چھت کی سیڑھیاں لان سے بھی ہیں۔''

''یار اچھا گھر ہے۔ بڑے دل سے بنوایا ہے کسی نے۔'' الماس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''ہاں میں بھی نوٹ کر رہی تھی۔ ایک ایک چیز بہترین اور کمال کی لگائی ہوئی ہے۔'' سونیا نے بچوں کے کمرے پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالی ''اور یہ کمرا تو لگتا ہے کسی نے بطور خاص بنایا ہی بچوں کے لیے ہے۔'' سونیا نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا جہاں دیوار کے ساتھ ہی رنگ برنگے کیبنٹس لگے ہوئے تھے۔ ''اچھا ہے ہمیں مزید کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' الماس نے دل ہی دل میں کمرے کی سیٹنگ کی تعریف کرتے ہوئے کہا اور نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔

الماس نے جاتے جاتے ایک بار پھر اپنے ہونے والے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کے آگے جاتے ہی آہستگی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور کالی بلی نکل کے سیڑھیوں کے پاس رک گئی۔

''ہاں بھئی، او کے کر دوں مکان کو۔'' وقاص نے الماس اور سونیا کو دیکھتے ہوئے سوال پوچھا۔

''بالکل بھائی جان اس سے بہترین مکان کہاں ملے گا وہ بھی اس کرائے میں۔'' الماس نے فوراً ہی اپنی رائے دی۔

''آپ کیا کہتی ہیں بیگم صاحبہ۔''

''ہوں پسند تو مجھے بھی بہت آیا ہے مکان۔ ہماری ضرورت کے عین مطابق ہے۔'' سونیا نے بھی تعریفی سند دے ڈالی۔

''اسی وقت دنوں بچے ہنستے مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''چلو پھر میں اسے بتا دیتا ہوں اور باقی کی تفصیل بھی ڈسکس کر لیتا ہوں۔'' وقاص نے سر ہلاتے ہوئے باہر کھڑے ہوئے شہیر کو اشارہ کیا جو کسی سے فون پر بات کر رہا تھا اور خود بھی باہر نکل گیا۔

''ارے یہ چاکلیٹ کہاں سے آئی بھئی۔'' الماس نے عمر کے ہاتھ میں چاکلیٹ دیکھ کے سوال پوچھا تو مہر نے بھی اپنی چاکلیٹ سامنے کی۔ ''دونوں کے پاس ہے واہ بھی واہ۔ کس نے دی۔'' الماس نے دونوں کی چاکلیٹ سے ایک ایک بائٹ لی۔

''اس نے دی۔'' مہر نے چاکلیٹ کھاتے ہوئے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ ''وہ جو چھت پر تھا نا۔''

''تم لوگ چھت پر بھی چلے گئے اور ہم بس کمرے

ہی دیکھ کر نیچے اتر گئے۔ ''شریر بچے'' الماس نے دونوں کو گدگداتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تھا کون وہ۔''

''اسٹیٹ ایجنٹ ہوگا الماس۔'' سونیا نے اِدھر اُدھر اپنے پرس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

''ہم ہوں۔ آپ نے ٹھینکس کیا تھا نا؟'' الماس کو فوراً ہی اپنی کیٹس کا خیال آیا۔

''یس خالہ۔''

الماس نے مسکراتے ہوئے دونوں کو پیار کیا۔

''شاباش چلو دیکھو بابا کہاں ہیں، واپس بھی تو جانا ہے ہم نے۔''

''ارے ہاں بھی، کہاں رہ گئے یہ دونوں۔'' سونیا نے بھی چونک کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شام کے سائے بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔

''چلو ہم تو گاڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' سونیا نے الماس کو دیکھتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ''یہ لوگ خود ہی آجائیں گے۔'' دونوں کے جاتے ہی کالی بلی سیڑھیاں اتر کے عین اسی جگہ جا کر بیٹھ گئی جہاں سونیا کھڑی تھی۔

شہیر اور وقاص چھت کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے دروازے کا معائنہ کر رہے تھے، شہیر نے کوشش کی کسی طرح گیٹ کھل جائے تاکہ چھت بھی دکھائی جاسکے۔

''میں کل ہی کسی مزدور کو بلا کر اس کا لاک تڑواتا ہوں۔ زنگ لگ گیا ہے شاید۔'' شہیر نے ایک بار پھر چابی کو تالے میں ڈال کے گھماتے ہوئے کہا۔

''زنگ کی وجہ سے اکثر یہ صورت حال ہوجاتی ہے اسی لیے نہیں کھل رہا۔''

''کوئی بات نہیں یار۔ جب کلر وغیرہ کراؤ گے تو اس کو بھی دیکھ لینا۔''

''ادھر سے ویو دیکھنا ذرا۔ بڑا شاندار نظارہ ہوتا ہے۔'' شہیر نے لالچ دینے کے انداز میں وقاص کو للچایا۔

''اب ادھر آہی جائیں گے سب کچھ دیکھ لیں گے۔'' وقاص نے شہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

''چلیں نیچے؟''

''ہاں ہاں چلیں۔'' شہیر نیچے جاتے ہوئے پلٹ کے دروازے کے تالے کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔ ''اتنی جلدی زنگ کیسے لگ گیا آخر۔''

وقاص جو چند قدم آگے نکل گیا تھا کچھ سوچتے ہوئے واپس پلٹا۔

''ایگرمنٹ تو دیدو۔ میں پڑھ لوں گا پھر چابی لیتے ہی سائن کرالینا اور ایڈوانس وغیرہ بھی۔''

شہیر جو اپنی ہی دھن میں تھا ایک دم چونک گیا۔

''اوکے۔ وہ تو شاید نیچے ہی رکھ دیا تھا۔''

''بار بار آفس سے آنا ممکن نہیں ہوگا میرے لیے۔''

وقاص کو نیچے سونیا کا پرس اور ایگرمنٹ کی کاپی رکھی ہوئی نظر آئی۔ شہیر نے بھی گردن ہلا کے اس کی تائید کرتا ہے اور دونوں باہر نکل جاتے ہیں۔ وقاص اپنی گاڑی کی طرف جاتا ہے اور شہیر اپنی بائیک کی سمت بڑھ کر الگ الگ راستے پر گامزن ہوجاتے ہیں۔

دونوں گاڑیوں کے جانے کے بعد مہر اور عمر کے کھائے ہوئے چاکلیٹ ریپر گھر کے مرکزی دروازے پر ہوا سے اِدھر اُدھر ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی ایک طرف سے کالی بلی آکر ان ریپرز کو چاٹنے لگی اور وقفے وقفے سے منہ اوپر کرکے رونے لگی۔

شہیر اور وقاص کے جانے کے بعد برابر والے مکان کی کھڑکی کا وہ پردہ جو مستقل ہل رہا تھا وہ بالآخر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور ایک خوب صورت لیکن ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ نمودار ہوا جو اداسی کے عالم میں اس گھر کو دیکھ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کی نظریں چھت کی سمت اٹھ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگتا ہے۔

''جاچکے وہ لوگ رخ تاج۔ اب آبھی جاؤ اور بیٹھ جاؤ کب تک وہی کھڑی رہوگی۔''

رخ تاج آہستگی سے پلٹی اور اپنے شوہر کے دیکھنے سے پہلے ہی آنکھیں صاف کرلیں لیکن وہ یہ بھول گئی تھیں کہ جب رفاقت چالیس سال سے زائد ہوجائے تو میاں بیوی ایک دوسرے کی دل کی باتیں بھی جان لیتے ہیں۔

''اتنا پیارا جوڑا ہے شاہ جی۔'' رخ تاج نے دھیرے سے کہا اور بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''ہوں۔'' شاہ جی نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب رکھی اور دوسرے ہاتھ سے ناک کی

پھنگ پر ٹکے ہوئے چشمے کو اتارا۔
''تم کب تک ایسے ہی ہر ایک کے آنے جانے پر......''
''تو کیا کروں پھر۔'' رخ تاج نے بے بسی سے ان کو دیکھا۔
شاہ جی نے چادر اپنے پاؤں پر درست کی اور کتاب کے اوپر بے خیالی میں ہاتھ پھیرنے لگے۔
''تم ان پر صبر کرلو۔''
''نہیں ہوتا صبر شاہ جی یقین کریں نہیں ہوتا۔ بچے بھی ساتھ تھے ان کے۔'' رخ تاج نے شاہ جی کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔
''چھوٹے چھوٹے دو بچے اور جوان میاں بیوی۔''
''کوئی بے وقوفی نہیں کرنا تم۔ سمجھ رہی ہونا۔'' شاہ جی نے فوراً ہی اپنی بیوی کا انداز چیک کیا۔
رخ تاج جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھیں۔ کھوئے کھوئے انداز میں خود کلامی کرتی رہیں۔ ''پتہ نہیں کون بدنصیب ہیں اس بار جو پھر اس خونی مکان کی بھینٹ چڑھنے لگے ہیں۔''
شاہ جی رخ تاج کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کتاب کی سمت متوجہ ہوگئے۔
رخ تاج کو جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ جھجکتے ہوئے شاہ جی کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔
''کیا میں......وہ میں سوچ رہی تھی کہ میں......''
شاہ جی نے فوراً ہی چشمے کے اوپر سے گھورتے ہوئے ان کو ٹوک دیا۔
''خبردار جو تم اس گھر میں گئی تو......''
''لیکن......''
''پہلے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی دھکے مار کے باہر نکال دیں گے تم کو۔ کوئی ہماری بات کو سیریس نہیں لیتا۔''
''ہاں اور جب تک وہ ہماری بات سنتے اس وقت تک بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔''
''اس لیے میں تم کو سختی سے منع کررہا ہوں۔ اس بار تم ان نئے کرائے داروں سے کوئی رابطہ نہیں رکھوگی۔''
رخ تاج سر جھکا کر بیٹھ گئی تو شاہ جی ایک نظر اپنی بیوی کو دیکھ کے کتاب میں مصروف ہوگئے۔ کھڑکی سے

باہر وہی خونی گھر اپنی ویرانیت لیے کھڑا تھا شاید کسی کے انتظار میں۔

......☆☆......

''آپ دونوں بھی میری مدد کرادیں میں اکیلی کیا کیا دیکھوں۔'' ایک بار پھر سونیا جھلائی ہوئی پورے لاؤنج میں پھیلے ہوئے کارٹن دیکھ کے روہانسی ہوگئی جبکہ سامنے ہی وقاص صوفے پر نیم دراز لیپ ٹاپ پر اپنا کوئی کام کر رہا تھا الماس اور بچے لوڈو کھیل رہے تھے۔

الماس فوراً ہی لوڈو چھوڑ کر اپنی بہن کی مدد کرنے پہنچ گئی۔

''یہ چیٹنگ ہے خالہ۔'' عمر نے بے ساختہ الماس کو ٹوکا۔

''آپ ہار رہی تھیں۔''

الماس نے قہقہہ لگایا عمر کو پیار کیسا اور سونیا کی جانب بڑھ گئی۔

''لائیں باجی میں تہہ کردوں کپڑے۔''

''شکر ہے تمہیں بھی خیال آگیا۔'' سونیا نے پیار بھری گھوری دی اپنی چھوٹی بہن کو۔''

''ویسے اس گھر کی لوکیشن ہمیں کتنی سوٹ کرتی ہے نا لیکن......''

''سالی صاحبہ۔لیکن ویکن، اگر مگر کے چکروں سے نکلو اور بس یہ پیکنگ کو فائنل کرکے ادھر سے شفٹ کرنے کی سوچو۔'' وقاص نے بھی لیپ ٹاپ ایک طرف کرتے ہوئے بھرپور انگڑائی لی۔

''تھک گیا یار۔''

''اوہو وقاص بھائی۔میرا مطلب تھا ادھر کچھ ایسا تھا کچھ الگ سی فیلنگ تھی جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔'' الماس نے کھوئی کھوئی سی کیفیت بیان کی۔

''ہر نئے گھر میں عجیب ہی لگتا ہے یار۔لیکن پھر یوز ٹو ہوجاتے ہیں تو سب نارمل ہوجاتا ہے۔''

سونیا نے کارٹن کے اوپر کارٹن رکھتے ہوئے شرارتی انداز سے وقاص کو دیکھا۔

''مجھے تو گھر کافی اچھا لگا۔ویسے بھی اس والے گھر میں دو تین سال ہو ہی گئے نا۔اب دل بھرنے لگا تھا اس گھر سے۔''

''ہماری بیگم کو انکھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ہم سے پوچھو ہر گیارہ مننتھ بعد نئے سرے سے گھر ڈھونڈنا اور کھڑوس باس سے آدھے دن کا آف لینا اور اتنا سامان شفٹ کرانا ہائے ہائے کتنا دل گرده کی بات ہوتی ہے۔''

سونیا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے وقاص کو چپ کرایا۔

''بس بس۔اس مکان میں تو پورے تین سال ہونے کو آرہے ہیں۔''

''یہ بھی خدا کی کرنی ہے یار۔جس گھر کو عرصے تک استعمال کر سکتے تھے۔اسی کو چھوڑنا پڑ رہا ہے۔'' وقاص نے الماس کو دیکھ کے ہاتھ سے چائے پینے کا اشارہ کیا اور ساتھ چہرے پر مسکینیت طاری کردی۔

''باجی آپ بھی پئیں گی۔'' الماس نے مصنوعی انداز سے اپنے لاڈلے اور چہیتے بہنوئی کو دیکھتے ہوئے بہن سے بھی پوچھا۔

سونیا حیرت سے وقاص کو دیکھ کے بولی۔

''ابھی تو چائے پی تھی وقاص۔''

جب ہماری بیگم صاحبہ کے لیے اتنا سامان لے کر دوسرے مکان میں جانا مشکل نہیں تو۔ہمارا ایک کے بعد دوسرے کپ کو پینا مشکل کیوں؟''

الماس مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

''ویسے بھائی۔وہ نیا گھر آپ کے آفس سے کافی نزدیک ہے۔''

وقاص نے جو دوبارہ لیپ ٹاپ کھول رہا تھا ایکدم ایکسائیٹڈ ہوکر جواب دیا۔

''یہی تو مین ریزن ہے یار گھر بدلنے کا میرا آفس۔ راتوں کو لیٹ آنا آئی کین ناٹ افورڈ۔اوپر سے کراچی کا تباہ کن ٹریفک۔''

الماس مسکراتے ہوئے چائے بنانے کمرے سے نکل گئی، سونیا وقاص کی تو جہ اپنی طرف کھینچی۔

''اب آپ کوشش کیجیے، الماس کی بھی برانچ چینج ہوجائے۔''

وقاص ایک دم چونک گیا۔

''ارے ہاں اچھا یاد دلایا۔''

''اور بچوں کا اسکول بھی۔''

''ہاں وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔پہلے ہی بات کر رکھی

تھی نا

سونیا نے آس پاس بکھرا ہوا سامان دیکھ کر بے زاری سے منہ بنا لیا اور سامنے رکھا ہوا کارٹن اٹھا کر پیک شدہ سامان کے پاس رکھ کے اپنے کندھے دباتے ہوئے بولی۔

''چلیں بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چائے وائے پی کے سونے آ جائیں۔ اور ہاں......'' وہ یکدم جاتے جاتے رکی۔

''کل یاد سے مزدور بھیج دینا تا کہ......''

وقاص نے موبائل واپس رکھ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔

''او کے بیگم صاحبہ اور کوئی حکم خادم کے لائق الماس کے لیے بھی میسج کر دیا ہے بندے کو۔ امید ہے اسی ویک کچھ ہو جائے گا۔''

سونیا نے ہنستے ہوئے صوفے سے اپنا پرس اٹھایا جو نئے مکان میں لے گئی تھی۔

''ارے یہ مجھے نکلتے ہوئے مل نہیں رہا تھا۔''

''سامنے ہی تو رکھا ہوا تھا کچن میں۔'' وقاص نے سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے سونیا کو جواب دیا۔

سونیا نے بے خیالی میں کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پرس کھولا سامنے ہی آئینہ رکھا ہوا تھا اسے نکال کر اپنا چہرہ دیکھنے لیکن وہ آئینہ بالکل سیاہ تھا۔

''یہ کیا ہو گیا۔''

وقاص سونیا کی آواز سن کر چونک گیا۔

''کیا ہوا سونیا، کوئی چوہا تو نہیں نکل آیا۔''

''کچھ نہیں۔'' سونیا نے بلند آواز میں جواب دیا اور اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

''یقیناً عمر نے کیا ہو گا۔ بدتمیز نا ہو تو۔''

......☆☆......

فیصل ابھی ابھی ثمن کی رپورٹس ڈاکٹر سے ڈسکس کر کے آیا تھا افسردہ سا بیٹھا اپنی بیوی کو تک رہا تھا کہ اس کے موبائل کی ٹون بجی۔

''ہوں۔''

''پتہ نہیں۔ خوش خبری ہے یا......''

''کیا نئے کرائے دار مل گئے۔''

''جی مل ہی گئے۔''

فیصل افسوس سے سر ہلانے لگتا ہے۔

''کتنے لوگ ہیں۔''

''میاں بیوی دو بچے اور ایک سالی۔'' اسپیکرز سے نکلتی ہوئی آواز میں بھی افسوس شامل تھا جسے سن کے فیصل نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''اففف پھر سے بچے۔'' دوسری طرف شہیر بھی اپنی بیٹی کی پکچر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

''بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔''

''میرا علی بھی معصوم تھا شہیر۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ تم نے دیکھا ہوا تھا نا۔'' فیصل کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''اس نے تو کبھی کسی سے اونچی آواز سے بات بھی نہیں کی تھی شاید۔''

شہیر شرمندہ ہوتے ہوئے فوراً ہی اپنی صفائی دینے لگا۔

''مم......میرا وہ مطلب نہیں تھا فیصل بھائی......''

''میرا بھی کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے شہیر۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ کیا کروں۔ کب تک کروں۔ تم تم کو تو معلوم ہے۔''

''جی سر۔ مجھے معلوم ہے۔'' شہیر نے ایک بار پھر الشبہ کی پکچر دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

''لیکن میں بھی تو مجبور ہوں نا یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے لیے ہی تو کر رہا ہوں کیونکہ میرے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

شہیر اور فیصل یہ کرتے ہوئے بھول گئے مکافات عمل بھی اسی دنیا میں رہتے ہوئے بھرنا پڑتا ہے۔

(ان شاءاللہ باقی اگلے ماہ بشرطیہ زندگی)

قاتل سے مقتول تک

ریاض بٹ

گھر میں شادیانے بج رہے لڑکیاں سہرے کے گیت گا رہی تھیں اچانک دوسرے کمرے میں دلہا کو قتل کردیا گیا دلچسپ بات یہ ہے کہ بھرے پرے گھر میں کسی نے قاتل کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔
انسپکٹر خالد کی ڈائری کا ایک ورق دیہاتی پس منظر میں ایک سنسنی خیز کہانی۔

انسان کے دو رخ ہوتے ہیں ایک نیک اور ایک بدی والا۔ یعنی انسان دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ گاؤں دیہات کے چوہدریوں اور جاگیرداروں کے متعلق آپ لوگوں نے بہت سی کہانیاں پڑھی اور سنی ہوں گی۔ میری تفتیشی کہانی زر گزیدہ جو جنوری 2012ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔ چوہدری رحمت علی عام چوہدری اور روایتی جاگیرداروں سے مختلف تھا۔ وہ خاصا معقول اور غریبوں کا ہمدرد تھا۔ اس کے دو بیٹے حشمت علی اور صفدر علی تھے۔ حشمت علی باپ کا حامی اور صفدر علی مخالف تھا۔ صفدر علی کی عمر پچیس سال اور حشمت علی بیس سال کا تھا۔ چوہدری رحمت علی کے ساتھ میرے اچھے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس نے کبھی نہ تو قانون کو ہاتھ میں لیا تھا اور نہ کسی کے ساتھ ظلم کیا تھا اور ایک کیس کو حل کرنے میں اس نے میری مدد بھی کی تھی۔ میں ہمیشہ سے روایتی قسم کے چوہدریوں اور جاگیرداروں سے مراسم نہیں بڑھاتا تھا اور اگر وہ قانون شکنی کرتے تھے تو ان سے آئینی اور آہنی ہاتھوں سے نمٹتا تھا۔

بات ہورہی تھی چوہدری رحمت علی کی۔ جب اس نے پر خصوص انداز اور تاکیدی لہجے میں اپنے بڑے بیٹے صفدر علی کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تو میں انکار نہ کرسکا۔ ان دنوں ویسے بھی میں چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ جب چوہدری مجھے دعوت دینے تھانے میں آیا تھا تو بڑی راز داری سے ایک بات میرے کان میں ڈالی تھی۔

''تھانیدار صاحب آپ نے بارات سے پہلے جو رات آئے گی اس رات ضرور آنا ہے۔''

''اس کی کیا وجہ ہے؟'' میں نے معنی خیز نظروں سے چوہدری کو دیکھا تھا۔

دراصل میرے بیٹے شہر سے کسی رقاصہ کو لانے کا پروگرام بنا رہے ہیں جبکہ میں ایک لوک فنکار کو بلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

''یعنی آپ قانون کے کاندھے پر اپنی خواہشوں کی بندوق رکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل جناب آپ میری بات کی تہہ تک پہنچ ہی گئے ہیں۔'' ''لیکن چوہدری صاحب ایک بات آپ ابھی سے اپنے پلے باندھ لیں کہ اگر رات کو وہاں کوئی غیر قانونی کام مثلاً جوا یا عیاشی وغیرہ ہوئی تو میں مہمان سے تھانیدار بن جاؤں گا۔

آپ کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی جرات نہیں کرے گا۔'' چوہدری نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بہرحال آخر وہ رات آگئی میں اے ایس آئی جاوید خان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ ایک مشہور لوک فنکار کو بلایا گیا تھا۔ رات تین بجے تک محفل جمی رہی۔ اس کے بعد جس کو جہاں جگہ ملی وہ سو گیا۔ ہمارے لیے ایک علیحدہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن ہمارے نصیب میں آرام نہیں تھا۔ ابھی ہمیں سوئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہوا تھا یہ اٹھنے کے بعد گھڑی دیکھ کر معلوم ہوا تھا کہ ہمارے کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور ساتھ ہی اے ایس آئی بھی..... دروازے پر چوہدری کا خاص نوکر رمضانی تھا۔

''تھانیدار صاحب آپ کو چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔'' میں رمضان کے چہرے سے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے بلکہ گڑبڑ ہے بہرحال اس نے چوہدری تک



ہماری رہنمائی کی۔ وہ ایک کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا اور غم و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"تھانیدار صاحب یہ دیکھیں۔" اس نے نیچے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ یہ کیا" میں اچھل پڑا۔ کمرے کا دروازہ بظاہر بند تھا دروازے اور فرش کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ جس سے خون بہہ کر آیا تھا اور کمرے کے باہر آ کر جمنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ دسمبر کا مہینہ تھا سردی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اے ایس آئی بھی میرے ساتھ ہی آ گیا تھا۔ ابھی زیادہ بھیڑ اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری رحمت علی رمضانی منظور یہ بھی چوہدری کا نمک خوار تھا میں اور اے ایس آئی ہی موجود تھے۔ میں نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔

"چوہدری صاحب یہ کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا......اوہ میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ اس کمرے کا ایک دروازہ حویلی کی پچھلی طرف بھی کھلتا ہے۔ پھر ہم پانچوں وہاں پہنچے تھے۔ اس طرف دراصل کھیت تھے اور دروازہ ہمیں کھلا ہوا ملا۔ ہم تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ بڑا بھیانک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ صفدر علی کی آدھی سے زیادہ گردن کٹی ہوئی تھی اور اس کی گردن سے ہی بہہ کر خون باہر گیا تھا۔

چوہدری بیٹے کی کٹی ہوئی گردن دیکھ کر چکرا کر گرنے لگا تھا۔ کہ منظور اور رمضانی نے اسے سنبھال لیا۔ وہ ان کے ہاتھوں میں بے ہوش ہو گیا۔ جوان بیٹے کو اس حال میں دیکھنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے چوہدری دھان پان سا بندہ تھا دونوں اسے اٹھا کر لے گئے اے ایس آئی اور میں باریک بینی سے لاش کا جائزہ لینے لگے۔

چھوٹے چوہدری صفدر علی کے سر کے پچھلے حصے پر پہلے کسی ڈنڈے وغیرہ سے ضرب لگائی گئی تھی پھر کسی تیز دھار آلے سے اس کی گردن کاٹی گئی تھی۔ لاش کے قریب ایک زنانہ انگوٹھی بھی پڑی ہوئی تھی جس کو اٹھا کر میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا اس پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی سوال یہ تھا کہ صفدر علی جس نے صبح دولہا بن کر دلہن لینے جانا تھا اس کمرے میں کیوں آیا تھا؟ اور اس کا قاتل کون تھا؟ اور قتل کی وجہ؟

بہر حال تھوڑی دیر بعد ہی پوری حویلی میں کہرام مچ گیا۔ چھوٹا چوہدری دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ان کی ماں زینت بیگم کے بین دلوں کو تڑپا رہے تھے۔ چوہدری اپنی خواب گاہ میں تھا اور ایک ڈاکٹر اسے دیکھ رہا تھا وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ شہنائیاں آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گئی تھیں۔ چوہدری کی حویلی میں فون موجود تھا۔ میں نے وہاں سے تھانے فون کر کے دو سپاہیوں کو بلا لیا۔ انہوں نے گاڑی میں آنا تھا اور ضروری تیاری کے ساتھ آنا تھا۔

میری خواہش تھی کہ چوہدری رحمت علی ہوش میں آ جائے۔ سپاہیوں اور گاڑی کے آنے سے پہلے وہ ہوش میں آ گیا۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ ایک سپاہی کو لاش کے ساتھ بھجوا دیا۔ اے ایس آئی بھی چلا گیا۔ اس نے تھانے میں جانا تھا اور میری غیر موجودگی میں وہاں کا انتظام سنبھالنا تھا۔ سپاہی قاسم میرے پاس رہ گیا۔ چھوٹے چوہدری حشمت علی نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اس وقت ایک کمرے میں

میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت کردوں میں نے اس کمرے کو جس پر صفدر علی کا قتل ہوا تھا سر بمہر کروادیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ کمرے سے باہر بہہ کر آنے والے خون تک رسائی کیسے ہوئی تھی؟

دراصل رمضانی کے ذمے مہمانوں کے لیے صبح کا ناشتہ بنوانے کا کام تھا اس سلسلے میں وہ گودام کی طرف گھی کا کنستر لینے جارہا تھا۔ بڑے چوہدری کو جو خود بھی پکانے والوں کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا جا کر ساری صورت حال بتادی۔ وہ ان سے گپ شپ لگانے کے بہانے دراصل ان کی نگرانی کررہا تھا۔ بار ت بات ہو رہی تھی حشمت علی کی۔

''حشمت علی مجھے افسوس ہے کہ تمہارا بازو تمہارا بڑا بھائی تم سے جدا ہوگیا۔ اب جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو تمہیں برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ میں تمہارے بھائی کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''تھانیدار صاحب میں کوئی بھڑک نہیں ماروں گا۔ کیونکہ اباجی نے مجھے ہمیشہ قانون کا احترام کرنا ہی سکھایا ہے۔ معاملہ آپ کے ہاتھ میں آچکا ہے اور مجھے قوی امید ہے کہ آپ قاتل یا قاتلوں تک پہنچ جائیں گے۔ آپ مجھ سے جس قسم کا تعاون چاہتے ہیں اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ حشمت علی نے تعاون آمیز میں کہا۔

''دیکھو حشمت میاں ہمیں ایسے معاملات میں کچھ ایسے سوالات بھی پوچھنے پڑتے ہیں جو ناگوار گزرتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ تم ناگواری کا اظہار کیے بغیر ان سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔ میں نے اسے ہر قسم کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنے کے لیے کہا۔

''آپ کسی قسم کی فکر کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنے سوالات کی پٹاری کھول دی۔

''تمہارے خیال میں تمہارا بھائی اس کمرے میں کیا کرنے گیا ہوگا؟''

''اس معاملے میں ٹھیک وجہ بتانی تو ذرا مشکل ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ وہاں چرس لینے گیا ہوگا کیونکہ اس کمرے میں اس نے چرس چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔

''اوہ تو وہ چرس بھی پیتا تھا لیکن یہ بات کچھ ہضم نہیں ہورہی۔ اگر وہ چرس پیتا تھا تو چرس اس کی جیب میں ہونی چاہیے تھی۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر......'' اس نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔

''ہوسکتا ہے وہ اپنے دو دوستوں کے لیے وہاں سے زیادہ مقدار میں لینے گیا ہو۔''

''اوہ کیا تمہارے والد صاحب کو اس بات کا پتہ ہے؟''

''نہیں وہ چھپ کر پیتا تھا۔ میں نے بھی اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ اس نے بڑا ہونے کے باوجود میری منت سماجت کی تھی کہ میں اباجی کو نہ بتاؤں اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد اس موذی نشے کو خیرآباد کہہ دے گا۔''

''وہ کریکٹر کا کیسا تھا؟''

''دیکھیں جی آپ سے میں نے وعدہ کیا ہے کہ ہر بات سچ بتاؤں گا۔ اباجی کے دل میں مزارعوں کے لیے نرم گوشہ ہے جب کہ بھائی صفدر کہتا تھا کہ ان کی لگامیں کھینچ کر رکھنی چاہئے ورنہ یہ سر چڑھ جاتے ہیں دوسرے وہ ذرا رنگین مزاج تھا۔''

''تم اس معاملے میں کیا کہتے تھے؟'' میں نے مقتول کی رنگین مزاجی کو ذہن میں نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''جناب میں اباجی کے خیالات سے متفق ہوں وہ بھی انسان ہیں ان کے ساتھ اگر نرم رویہ رکھا جائے تو وہ زیادہ لگن اور محنت سے کام کرتے ہیں۔''

''کیا تمہارے علم میں ایسی کوئی بات ہے کہ کبھی صفدر علی نے کسی مزارعے کی بہو بیٹی کے ساتھ چھیڑ خانی کی ہو۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں چاچا فضل کی بیٹی کمو کے ساتھ چند دن پہلے اس نے چھیڑ خانی کی تھی اور وہ باقاعدہ فریاد لے کر اباجی کے پاس آیا تھا۔''

''اوہ۔'' میں اچھل پڑا یہ تو بڑے کام کی بات تھی۔

''اس کا میرا مطلب ہے چاچا فضل دین کا کوئی جوان بیٹا بھی ہے۔''

''جی ہاں اس کا بیٹا غلام دین بڑا گھبرو جوان ہے۔''

''اس کا ردعمل کیا تھا؟''

باپ نے تو پردہ ڈال دیا تھا لیکن غلام دین عرف غلامے کو کہیں سے پتہ چل گیا تھا وہ بڑے غصے میں تھا لیکن اباجی

نے اسے بلا کر سمجھا دیا تھا کہ جوان ٹھنڈے رہو میں نے صفدر علی کی کافی گوشمالی کی ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"تمہارے خیال میں یہ کارروائی اس کی ہوسکتی ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔"

"خیر تم فکر نہ کرو میں اسے بھی ٹٹولوں گا۔تم اب جاؤ اور اپنے والد صاحب کو تسلی دلاسہ دو اور مقتول کے دوستوں کو بھیج دو۔"

کچھ دیر کے بعد رمضانی میرے پاس آیا اور بتایا کہ دونوں دوست چلے گئے ہیں کہہ رہے تھے پھر آئیں گے میں نے رمضانی سے پوچھا۔

"بڑے چوہدری صاحب کی حالت اب کیسی ہے؟"

"حالت تو ٹھیک نہیں ہے لیکن وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" رمضانی نے کہا۔

چند ہی لمحوں بعد میں چوہدری رحمت علی کی خواب گاہ میں موجود تھا وہ تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ اپنے بیڈ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا تھا پاؤں کی طرف حشمت علی بیٹھا تھا۔

"تھانیدار صاحب کوئی بات معلوم ہوئی؟" اس نے مجھے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے حشمت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"برخوردار تم ذرا باہر جاؤ۔" وہ سر جھکا کر کمرے سے چلا گیا۔

"بڑا برخوردار قسم کا لڑکا ہے۔" میں نے رحمت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی تھانیدار صاحب اس کی طرف سے مجھے ہمیشہ ٹھنڈی ہوا ہی آئی ہے۔"

"اور صفدر علی کی طرف سے۔" میں نے چوہدری رحمت علی کا فقرہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب بس کیا بتاؤں؟ صفدر علی منہ زور گھوڑا تھا۔ میں نے اسے شادی کی لگام ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر شاید خدا کو منظور نہیں تھا۔"

"خیر ماں باپ تو اولاد کا بھلا ہی سوچتے ہیں اگر آپ کے علم میں کوئی واقعہ یا بات ہو تو مجھے بتائیں تاکہ میں تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا سکوں۔" چوہدری نے بھی مجھے کمو عرف کلثوم والا واقعہ بتایا اور پھر بولا۔

"آپ اس طرف تفتیش کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں اس نے رضائی کو ٹانگوں سے ذرا اوپر کرتے ہوئے کہا لیکن چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر بولا۔

"مجھے نہیں امید کہ غلامے نے اتنی بڑی جرات کی ہوگی۔"

"خیر چوہدری صاحب غیرت اور عزت بہت کچھ کروا دیتی ہے۔اب آپ آرام کریں۔"

اس کے بعد میں نے سپاہی قاسم کو ساتھ لیا اور تھانے میں آ گیا۔ رمضانی نے ہمیں ناشتہ کروادیا تھا۔شام کو پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی اور ساتھ لاش بھی۔ رپورٹ کے مطابق پہلے مقتول کے سر پر کسی مضبوط ڈنڈے سے دو ضربیں لگائی گئیں یہ ضربیں بڑی شدید تھیں۔ جنہوں نے مقتول کو نیم بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیا اور پھر اس نیم بے ہوشی کی حالت میں اس کے گلے پر تیز دھار چھری یا خنجر چلا دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے یعنی مقتول نے چرس بھی پی ہوئی تھی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ مقتول واقعی چرس پیتا تھا۔ لاش لینے کے لیے ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔میرے خیال میں بڑی جلدی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے سپاہی کو بھیج کر انہیں بلالیا۔لاش لینے کے لیے حشمت علی اس کا چاچا شجاعت علی اور چار بندے اور آئے تھے۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد لاش ان کے حوالے کردی۔ ابھی میں نے آرام کرنے اپنے کوارٹر میں نہیں جانا تھا کیونکہ میں نے مقتول کے دوستوں ارشد خان اور منیر کو بلانے سپاہی قاسم کو بھیجا ہوا تھا۔ عشاء کی اذانوں سے ذرا پہلے دونوں آ گئے۔ ان کے باپ بھی ساتھ آ گئے تھے۔ میں نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا کہ معمول کی پوچھ گچھ کے لیے ان کے بیٹوں کو بلایا ہے میں جلد ہی انہیں واپس بھیج دوں گا۔ پہلے میں نے منیر کو بلالیا۔وہ گندمی رنگت کا ایک جوان تھا آنکھیں چر سیوں جیسی تھیں۔

"کیا حال چال ہیں منیر صاحب؟" میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جناب۔"

"ادھر تمہارا جگری یار قتل ہوگیا تھا اور تم دونوں وہاں سے رفو چکر ہوگئے تھے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بس جناب ہم پریشان ہوگئے تھے۔"

''کیوں کیا تم دونوں کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہے؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب ہم تو صفدر کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے ہم نے ایک دفعہ.....'' وہ خاموش ہوگیا۔

''تم نے ایک دفعہ کیا کیا تھا؟ فوراً بتاؤ ورنہ؟'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اوہ بس رہنے دیں جی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہئے۔''

''جو بات بھی ہے جلدی بتاؤ۔'' میں نے اپنا رولر ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''وہ جی صفدر علی کی گاؤں فرید آباد کے چھوٹے چوہدری دلدار علی سے مرغوں کی لڑائی پر منہ ماری ہوگئی تھی وہ صفدر علی کو دھمکیاں دینے لگا ہم نے اسے ٹھنڈا کردیا۔

''کس طرح ٹھنڈا کیا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''دراصل اس نے صفدر علی کا گریبان پکڑ لیا تھا میں نے اسے دھکا دے کر صفدر علی کا گریبان چھڑالیا تھا اگلے ہی لمحے ارشد خان نے اس کے منہ پر ایک مکا ٹکادیا تھا پھر لوگوں نے چھڑادیا۔''

''اچھا......اس نے کوئی دھمکی وغیرہ دی ہوگی؟''

تھانیدار صاحب وہ تو بھیگی بلی بن گیا تھا۔

''دیکھو منیر اگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تم نے اپنے بیان میں کہیں گڑبڑ کی ہے تو میں تمہاری کھال کرادوں گا۔''

''جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے اس میں ذرا برابر بھی جھوٹ نہیں ہے ویسے اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟''

''بولو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''کہیں آپ دلدار پر شک تو نہیں کررہے؟''

''تم اس بات کو چھوڑو کہ میں کس پر شک کررہا ہوں اور کس پر نہیں اب تم جاؤ اور باہر بیٹھو لیکن ٹھہرو۔'' میں نے سپاہی قاسم کو بلا کر کہا۔

''اس کو اپنی تحویل میں رکھو ہوسکتا ہے اس کو چابی دینی پڑے۔'' میں نے نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''اور دوسرے کو بھیج دو۔''

''چلو جوان۔'' وہ منیر کو لے گیا۔ چند لمحوں بعد ارشد خان میرے سامنے تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا تقریباً چوبیس سالہ جوان تھا بڑی بڑی مونچھیں اس کے گورے چٹے چہرے پر اپنی بہار دکھا رہی تھیں اس سے بھی میں نے کافی گھما پھرا کر سوال کیے تھے لیکن اس کے جواب بھی منیر کے جوابات سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ چرس پیتے ہیں اور صفدر علی ان کے لیے ہی چرس لینے گیا تھا اور وہ کھسکے اس کے لیے تھے کہ پولیس انہیں پریشان کرے گی۔''

میں نے ارشد خان کو بھی دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے کوئی بات چھپائی ہے یا کہیں غلط بیانی سے کام لیا ہے تو بتادو ورنہ میں اسے سپاہی قاسم کے حوالے کردوں گا جو اس کا حشر نشر کردے گا۔ لیکن اس نے کہا آپ ہر طرح اپنا اطمینان کرلیں ہم کہیں بھاگیں گے نہیں انہوں نے فی الحال میرا شک رفع کردیا تھا۔ میں نے دونوں کو اس تاکید کے ساتھ کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں رخصت کردیا۔ ویسے دلدار علی کو بھی میں نے شک کی فہرست میں شامل کرلیا تھا اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ جب میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں گیا صفدر علی جیسے جوان کے قاتل یا قاتلوں کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے کئی لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا ہوتا ہے اب مسئلہ یہ نہیں رہا تھا کہ صفدر علی اس کمرے میں کیوں گیا تھا بلکہ اب مسئلہ یہ تھا کہ قاتل اس کمرے میں کب اور کیسے گیا تھا۔ بے شک اس کمرے کا دروازہ کھیتوں کی طرف تھا لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ تو بند ہی ہوتا ہے پھر وہ کمرہ استعمال میں بھی نہیں تھا میں نے دیکھا تھا کہ گھر کا کچھ فالتو سامان وہاں پڑا ہوا تھا ویسے قاتل اس سامان کے پیچھے آسانی سے چھپ کر بیٹھ سکتا تھا اگلی صبح میں نے تھانے کے کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد سپاہی قاسم کو دلدار علی کی طرف بھیج دیا۔ اسے فرید آباد جانا تھا جو تین میل دور تھا لیکن دو گھنٹے کے بعد اس نے آکر بتایا۔ چھوٹا چوہدری دلدار علی نہیں ملا...... بڑا چوہدری فرخ علی خود پریشان ہے کہ وہ بتائے بغیر کہاں چلا گیا۔ یہ ایک اور پریشان کن صورت حال تھی اور مجھے امید تھی کہ بڑا چوہدری بھی آج کل میں آنے والا ہے۔ ہوا بھی ایسے ہی۔

دو دن بعد چوہدری فرخ علی اپنے دو باڈی گارڈز کے ساتھ آگیا۔ اس نے عقل مندی یہ کی کہ خود ہی باڈی گارڈز کو

باہر رکنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ پچاس سالہ ایک قوی بندہ تھا۔ اس نے اعلیٰ قسم کا اونی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا مہنگے کپڑے کی واسکٹ اس کی شخصیت کو مزید ابھار رہی تھی۔ وہ شکل سے کچھ پریشان اور مضطرب لگتا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اس نے میرے بولنے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔

''تھانیدار صاحب آپ نے دلدار علی کو کیوں بلا بھیجا تھا؟''

آپ کے علم میں یہ بات تو آ ہی گئی ہوگی کہ چوہدری رحمت علی کے بیٹے صفدر علی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے نپے تلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''بھلا وہ اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ صفدر علی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں تھا۔''

''ایک بار دونوں کا ٹکراؤ ہو چکا ہے۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا اور منیر اور ارشد سے حاصل ہونے والی معلومات اس کے گوش گزار کر دیں۔

''اوہ تھانیدار صاحب میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔''

''چوہدری صاحب یہ جوان اپنے معاملات خود ہی نمٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز نگاہوں سے چوہدری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟ تھانیدار صاحب۔'' میری بات سے وہ چونک گیا تھا۔

''فی الحال میں زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ آپ یہ بتائیں دلدار علی کدھر ہے؟''

''آپ نے تو مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ اس رات سے غائب ہے جس رات صفدر علی کا قتل ہوا تھا۔''

''اوہ یہ تو بڑی گمبھیر صورت حال ہے میں نے چوہدری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہر حال تھانیدار صاحب میں اتنے دنوں سے دلدار علی کو ہی ڈھونڈ رہا ہوں...... ورنہ اس دن سپاہی کے ساتھ ہی دلدار کو لے کر آ جاتا میں قانون کو مقدم سمجھتا ہوں۔''

''آپ کے اور چوہدری رحمت علی کے خیالات کتنے ملتے جلتے ہیں۔'' میں نے ویسے ہی روانی میں کہہ دیا۔

''لیکن تھانیدار صاحب میرا دلدار علی کہاں غائب ہو گیا''

''آپ بالکل فکر نہ کریں اب اسے ڈھونڈنا میری درد سری ہے۔''

''ویسے تھانیدار صاحب میں دلدار علی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانا چاہتا ہوں۔''

''رپورٹ۔'' میں نے چونک کر چوہدری فرخ علی کی طرف دیکھا۔

''بالکل مجھے خیریت نظر نہیں آ رہی۔''

''ٹھیک ہے آپ محرر کے پاس جا کر رپورٹ درج کروا دیں۔'' وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا اور میرے لیے سوچوں کے در کھول گیا۔ میں نے اے ایس آئی جاوید خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ چائے آ گئی۔

''یہ چائے بھی کیا چیز ہے؟ جسم و دماغ کو تازہ دم کر دیتی ہے۔'' چائے پینے کے دوران جاوید خان کے ساتھ میں تبادلہ خیالات کرتا رہا۔

''تمہارے خیال میں دلدار علی کدھر گیا ہوگا؟''

''سر ہو سکتا ہے اسی نے صفدر علی کو پار کر دیا ہو اور خود روپوش ہو گیا ہو۔ یہ بات تو عموماً سچ ہی ثابت ہوئی ہے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اور کچھ لوگ خاموشی سے اپنا کام کر جاتے ہیں۔''

یہ بات میں نے اسے منیر اور ارشد خان سے ہونے والی تفتیش کے تناظر میں بتائی تھی کہ لڑائی کے بعد دلدار علی نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر کہا۔

''تمہاری بات دل کو تو لگتی ہے لیکن کچھ سوال ایسے ہیں جن کا جواب ضروری ہے۔''

''کون سے سوال سر؟''

''دلدار علی نے اتنے عرصہ انتظار کیوں کیا؟ اور اسی رات کا انتخاب کیوں کیا جب وہ صبح دلہا بننے والا تھا اور وہ اس کمرے تک کیسے پہنچا جب کہ وہ مہمانوں میں بھی شامل نہیں تھا؟''

یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ میں نے مہمانوں سے بھی سوال و جواب کئے تھے لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی

تھی جو صفدر علی کے قتل پر روشنی ڈال سکتی اس رات وہاں دلدار علی نہیں تھا۔ اے ایس آئی کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔
''سر اس کا مطلب ہے کہ اگر ان سوالوں کے جواب مل جائیں تو اونٹ کسی کروٹ بیٹھ سکتا ہے۔''
''بالکل بظاہر یہ معاملہ جتنا سیدھا لگتا ہے اتنا سیدھا ہے نہیں۔ بہر حال تم مخبروں کو متحرک کر دو۔ مجھے چوہدری رحمت علی اور چوہدری فرخ علی کے خاندان کے متعلق معلومات چاہئے۔ خاص کر دلدار علی اور صفدر علی کے متعلق۔
''ٹھیک ہے سر میں آج ہی مخبروں کو متحرک کر دیتا ہوں اور وہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر جب وہ بولا تو اس کے لبوں پر میرے دل کی بات تھی سر کیوں نہ غلام دین کو بلا کر اس سے ایک چھوٹا سا انٹرویو کر لیں۔
''میں بھی یہی سوچ رہا تھا...... تم سب سے پہلے اسے ہی بلا لو؟''
وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ یہ کام ابھی کر دیتا ہے تقریباً دو گھنٹے بعد غلام دین میرے سامنے تھا۔ اس کا باپ فضل دین بھی ساتھ ہی آ گیا تھا لیکن عملے نے اسے باہر ہی بٹھا دیا تھا غلام دین عرف غلاما تئیس چوبیس سالہ ایک کڑیل اور گھبرو جوان تھا وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''جوان گھبرائے ہوئے ہو یار میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا؟''
''تھانیدار صاحب میں تھانے میں پہلی بار آیا ہوں اس نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔
''اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو تمہیں پریشان ہونے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی خوف میں ڈوبی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں نے جرم تو کوئی نہیں کیا۔ لیکن میں حیران اور پریشان اس لیے ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرے نرم لہجے سے جیسے اس نے حوصلہ پاتے ہوئے کہا۔
''دیکھو جوان میں صفدر علی کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اس لیے تمہیں بلایا ہے اس نے تمہاری بہن کے ساتھ جو حرکت کی تھی وہ اسے قتل کرنے کے لیے کافی تھی۔'' میں نے اسے گرمانے کے لیے کہا۔
''تھانیدار صاحب میں تو اسے مزا چکھانا چاہتا تھا۔ لیکن ابا نے اور چوہدری رحمت چاچا نے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ اگر وہ دوبارہ ایسی حرکت کرتا تو میں کسی کی پروا نہ کرتا۔''
اب اس کا خوف دور ہو گیا تھا اور وہ اعتماد سے بات کر رہا تھا علاوہ ازیں اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔
''اچھا یار میں مان لیتا ہوں کہ تمہارا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن قتل تو ہوا ہے نا۔'' میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر کہا۔
''تمہارے خیال میں صفدر علی کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''
''یہ تو مجھے نہیں پتا البتہ تھانیدار صاحب صفدر علی بڑا کمینہ بندہ تھا جہاں خوب صورت لڑکی دیکھتا تھا رال ٹپکا دیتا تھا کسی بھائی خاوند یا باپ نے پار کر دیا ہوگا۔ ویسے تو سیانے کہتے ہیں کہ دشمن مرے تے خوشی نہ کریے۔ سجنا وی مرجاناں۔ دشمن کے مرنے پر خوشی کے شادیانے نہیں بجانے چاہیں۔ دوست اور پیاروں نے بھی مرجانا ہے لیکن تھانیدار صاحب مجھے اس کے مرنے سے خوشی ہوئی ہے خس کم جہاں پاک۔''
اس کے بعد میں نے کافی گھما پھرا کر اس سے سوال وجواب کیے تھے لیکن وہ قاتل یا قاتلوں کی نشان دہی نہ کر سکا۔ البتہ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے سن کر میں اچھل پڑا۔
قارئین آپ سوچیں کہ وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ میں ابھی وہ بات آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ مخبروں کے ذریعے میں نے ابھی اس کی تصدیق بھی کرنی ہے۔ اگر یہ بات سچ نکلتی ہے تو مجھے تفتیش کا رخ خیر ابھی یہ صرف ہوا میں گھوڑے دوڑانے والی بات ہے اونٹ کی طرح تفتیش کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اور کبھی کبھی تفتیش کا اونٹ کسی ایسی کل بیٹھ جاتا ہے جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا کہ تھانیدار صاحب جو بات میں نے آپ کو بتائی ہے اس میں میرا نام نہ آئے تو میں آپ کا حد درجہ مشکور و ممنون ہوں گا۔ کیونکہ یہ بات چوہدری صاحب نے دنیا سے چھپائی ہوئی ہے۔'' میں نے صرف خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ اگلے تین دن اس کیس کے

سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔
چوتھے دن اس وقت جب صبح کے دس بجے کا وقت ہوگا ایک بندہ میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ گاؤں فریدآباد اور ڈھوک شمس کے درمیان جو ویرانہ ہے وہاں درختوں پر مردار خور گدھ بیٹھے ہوئے ہیں اور معاملہ سنگین لگتا ہے۔ یہ وہ دور تھا قارئین جب لوگ بلا خوف وخطر پولیس کے ساتھ تعاون کرتے تھے یہ بندہ جس کا نام ناصر تھا اور اس کا تعلق گاؤں فریدآباد سے تھا کسی کام سے شہر آ رہا تھا اس نے ایک خلاف معمول بات دیکھی اور پولیس کو مطلع کرنا اپنا فرض سمجھا۔ میں نے تمام حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ شہر میں اسے ضروری کام تھا اس لیے اس نے ہمارے ساتھ اس جگہ جانے سے معذرت کرلی۔ جس قسم کے حالات اس نے بتائے تھے میں نے انہی کے مطابق کانسٹیبل آفتاب اور سپاہی سکندر کو تیاری کا حکم دیا۔ ایک گھنٹے میں ہم تینوں سرکاری گاڑی میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ علاقہ کھڈے نالوں والا تھا اور وہاں بیری کے درخت اور شیشم کے درخت تھے ایک پرانا سا برگد کا درخت بھی تھا۔ جس کے نیچے ایک کنواں بھی تھا۔ ہمیں اطلاع دینے والے کے پاس اتنا ٹائم نہیں تھا کہ وہ قریبی گاؤں فریدآباد میں اطلاع دیتا۔ اسے کچہری میں کام تھا اور ٹائم نکلا جا رہا تھا بہرحال اس نے ہمیں اطلاع دے دی تھی مردار خور گدھ زیادہ برگد اور اس کے قریب شیشم کے درختوں پر بیٹھے تھے۔ سپاہی سکندر کے پاس رائفل تھی اس نے ہوائی فائر کر کے گدھوں کو اڑا دیا۔ میں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ جو کچھ ہے وہ کنویں میں ہے ہمارے پاس بڑی ٹارچیں بھی تھیں لیکن کنواں اتنا گہرا تھا کہ ٹارچوں کی روشنی اس کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھیں میں نے سپاہی کو حکم دیا کہ وہ گاؤں فریدآباد میں جائے اور چوہدری فرخ علی اور دو کنویں میں اترنے کے ماہر بندوں کو لے آئے رسے اور دوسرا ضروری سامان ہم لے آئے تھے۔ اس دوران میں نے اردگرد گھوم پھر کر زمین سے بھید لینے کی کوشش شروع کر دی کانسٹیبل بھی ہاتھ بٹا رہا تھا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی جنہیں جلدی جانا ہوتا تھا وہی لوگ پیدل سائیکلوں اسکوٹروں اور جیپ کاروں وغیرہ میں یہاں سے گزرتے تھے زیادہ تر آمدورفت پکی سڑک سے ہوتی تھی۔ جو گاؤں فریدآباد کے پہلو سے ہو کر گزرتی تھی۔ بہرحال کھرے ڈھونڈنے میں مجھے جزوی طور پر کامیابی حاصل ہوئی کھرے صرف کنویں کے آس پاس دس گز کے احاطے میں محفوظ تھے باقی کھرے گڈمڈ تھے یہ کھرے بھی پرانے لگتے تھے۔ بہرحال تھانے سے ادھر آئے ہوئے میں نے کھوجی بابا کو بلانے سپاہی قاسم کو بھیج دیا تھا سپاہی قاسم کے پاس اپنا ذاتی اسکوٹر تھا اس نے بابا کھوجی کو لے کر آنا تھا۔ بہرحال سپاہی سکندر پہلے آ گیا۔ وہ چوہدری فرخ کی جیپ پر آیا تھا جیپ میں دو باڈی گارڈ اور تین ہٹے کٹے بندے بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی چوہدری کے ساتھ اتر کر آ گئے۔

''کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟'' چوہدری سیدھا میری طرف آیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر میری طرف دیکھنے لگا میں اور کانسٹیبل انہیں دیکھتے ہی متروک کنویں سے ہٹ آئے تھے تاکہ کھرے محفوظ رہیں۔

''چوہدری صاحب ابھی تک تو میں خود کچھ نہیں سمجھ سکا۔ بہرحال میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس کنویں میں کوئی انسانی لاش ہے۔'' چوہدری صاحب کے حلق سے ایسی آواز نکلی جیسے اس کے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو۔

بہرحال میں نے چوہدری کے ساتھ آئے ہوئے دو بندوں کو رسوں کی مدد سے کنویں میں اترنے کے لیے کہا اور سپاہی سکندر اور کانسٹیبل کو ان کی مدد کرنے کے لیے حکم دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی جان جوکھوں تک ودو کے بعد انہوں نے ایک انسانی لاش نکال لی۔ لاش پرانی لگتی تھی۔ لاش کے ساتھ ایک آٹھ نو انچ پھل والی خوفناک چھری بھی تھی جس پر خون لگا ہوا تھا جو اب خشک ہو گیا تھا۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی چوہدری فرخ کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اگر باڈی گارڈ اسے سنبھال نہ لیتے تو وہ اوندھے منہ لاش کے اوپر گرا ہوتا۔ یہ اس کے بیٹے دلدار علی کی لاش تھی۔ اس کی گردن بھی اس طرح کٹی ہوئی تھی جیسے صفدر علی کی کٹی ہوئی تھی لیکن بظاہر اس کے جسم پر اور کوئی چوٹ نہیں تھی۔ چوہدری فرخ کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ یک ٹک اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ رہا تھا پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے باڈی گارڈز اور اس کے ساتھ آئے ہوئے تینوں بندے اسے لے کر چلے گئے۔ اتنے میں سپاہی قاسم کھوجی بابا جس کا نام نذر محمد تھا کو لے کر آ گیا۔ کھوجی بابا نے پندرہ بیس منٹ کی عرق ریزی کے بعد بتایا

کہ مقتول کے علاوہ تین بندوں کے کھرے اور ہیں کنویں کے پاس دھینگا مشتی ہوئی ہے اور قریب قیاس بات یہ ہے کہ دو بندوں نے مقتول کو پکڑا تھا اور تیسرے نے اس کا گلہ کاٹ کر اس کی لاش آلہ قتل سمیت اس کنویں میں پھینک دی تھی۔ میں نے کھروں کے مولڈ تیار کروائے اور لاش کو کانسٹیبل آفتاب اور سپاہی سکندر کی نگرانی میں سول اسپتال برائے پوسٹ مارٹم بھجوادیا۔ کھوجی بابا کو اپنی جیب خاص سے کچھ انعام دیکر سپاہی قاسم کے ساتھ رخصت کردیا۔ اور خود تھانے میں واپس آ گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ ہماری اس ساری کارروائی کے دوران کوئی فرد وہاں سے نہیں گزرا تھا۔ وہ ایک ایسا ہی علاقہ تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میں یہ سوچنے لگا کہ دلدار علی وہاں کیوں گیا تھا اور جن تین بندوں کے کھرے ملے تھے وہ کون تھے؟ اور انہوں نے دلدار علی کو قتل کیوں کیا تھا؟ کیا صفدر علی کے قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق تھا؟ یہ سوال ایسے تھے جنہوں نے میرے ذہن میں ہلچل مچائی ہوئی تھی۔ مخبروں کی طرف سے رپورٹیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سب سے تفصیلی اور معتبر رپورٹ آپا شاہین لے کر آئی۔ اس سے ان باتوں کی تصدیق بھی ہوگئی جو غلام دین مجھے بتا گیا تھا۔ لیجئے اس کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب چوہدری رحمت علی بہت زیادہ رحم دل ہے۔ آپ نے وہ بات تو سنی ہوگی کہ انسان کو نہ اتنا میٹھا ہونا چاہئے کہ خود غرض قسم کے لوگ اسے نگل لیں اور نہ اتنا کڑوا ہونا چاہئے کہ لوگ اسے تھوک دیں۔ یعنی اس سے نفرت کرنے لگیں۔ چوہدری صاحب پہلی قسم کے لوگوں میں سے ہیں لوگوں نے ان سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں صفدر علی چوہدری صاحب کا حقیقی بیٹا نہیں ہے ان کی بیگم ساتھ لے کر آئی تھی اس وقت صفدر علی صرف دو سال کا تھا۔ زینت بیگم کی پہلی شادی ناکام ہوگئی تھی دراصل اس کا پہلا خاوند شوکت خان ایک شرابی کبابی بندہ تھا وہ جوا بھی کھیلتا تھا زینت بیگم کے ماں باپ نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی بیٹی کو اس سے طلاق دلوائی وہ بھی اتنے گئے گزرے نہیں تھے چھوٹے زمیندار تھے ان دنوں ابھی چوہدری رحمت علی کی شادی نہیں ہوئی تھی پھر کسی طرح چوہدری رحمت علی نے زینت بیگم کو دیکھ لیا۔ شاید آپ نے زینت بیگم کو نہیں دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت ہے اور اس وقت تو وہ چودھویں کا چاند تھی جوانی ٹوٹ کر اس پر برسی تھی بہر حال قصہ مختصر زینت بیگم اور چوہدری رحمت علی کی شادی خانہ آبادی ہوگئی۔ اس نے نہ صرف زینت بیگم کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا۔ بلکہ اس کے دو سال کے بیٹے کو بھی اپنا ہی بیٹا سمجھ کر اس کی پرورش کی۔ زینت بیگم کا تعلق شہر سے ہے گاؤں میں چوہدری نے یہ مشہور کروادیا تھا کہ اس کی اور زینت بیگم کی شادی تین سال پہلے شہر میں ہوئی تھی۔ پہلے وہ شہر میں ہی رہتی تھی اس طرح شاید چوہدری رحمت علی یہ چاہتا تھا کہ کوئی کم ازکم گاؤں میں صفدر علی کو اس کا سوتیلا بیٹا نہ سمجھے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ میں نے بھی بڑی استادی اور مشکل سے یہ اندر کی باتیں معلوم کی ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی چوہدری سے شادی کے ایک سال بعد زینت بیگم نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا لیکن وہ صرف چند دن زندہ رہنے کے بعد فوت ہوگئی۔ اس کے دو سال بعد حشمت علی پیدا ہوا۔ پھر زینت بیگم کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ حالانکہ چوہدری رحمت علی نے صفدر علی کی پرورش بڑے اچھے طریقے سے کی۔ اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی لیکن شاید باپ کی طرف سے اس کے خون میں جو خرابی تھی وہ رنگ لائی اور صفدر علی اوباش لڑکا اور ظالم بن گیا۔ چوہدری رحمت علی پریشان رہنے لگا۔ اسے زینت بیگم اور کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ صفدر علی کے پاؤں میں شادی کی بیڑی ڈال دی جائے۔'' چنانچہ آگے کے حالات آپ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے آپا شاہین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاہین تمہاری پرواز اور کام کا میں نے اندازہ لگالیا ہے کیا یہ بات بھی تم نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا حشمت علی کو یہ پتہ ہے کہ صفدر علی اس کا سوتیلا بھائی ہے؟''

میری معلومات کے مطابق نہیں۔'' آپا شاہین نے پورے اعتماد سے کہا۔

یہاں یہ بات بتانا بھی مناسب ہوگی کہ جائے واردات سے ملنے والی انگوٹھی بھی میں نے اے ایس آئی کے توسط سے آپا شاہین کو بھجوادی تھی۔ اس کے متعلق بھی بڑی سنسنی خیز معلومات وہ لے کر آئی تھی۔ وہ بات ابھی میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ بہر حال اتنا بتادیتا ہوں کہ صفدر علی کے قتل کا معمہ کافی حد تک حل ہوگیا تھا۔ مناسب موقع پر سب کچھ آپ کے علم میں آجائے گا۔ آپا شاہین کو رخصت کرنے کے بعد

میں نے کانسٹیبل آفتاب کو ساتھ لیا اور چوہدری رحمت علی کی حویلی پہنچ گیا۔ آپا شاہین انگوٹھی مجھے واپس دے گئی تھی اور وہ اس وقت میری جیب میں تھی۔ چوہدری کی طبیعت اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی اس کو جب پتہ چلا کہ میں آیا ہوں وہ خود میرے استقبال کے لیے حویلی کے دروازے پہ آ گیا۔ پھر وہ مجھے اور کانسٹیبل کو بیٹھک میں لے گیا اور میرے منع کرنے کے باوجود کھانے پینے کے لیے کہہ دیا۔

''چوہدری صاحب میں چوہدرانی جی سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بسم اللہ جی پہلے کچھ کھا پی لیں پھر یہ کام بھی ہو جائے گا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ایک نوکر چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا اس میں چائے کے علاوہ ابلے ہوئے انڈے کھوئے والا حلوہ وغیرہ تھا چائے پینے کے دوران میں نے چوہدری سے پوچھا۔

چوہدری صاحب کیا یہ بات حشمت علی کو معلوم ہے کہ صفدر علی اس کا سوتیلا بھائی ہے۔'' چوہدری رحمت علی اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں کوئی جادوگر ہوں اور جادو کی پٹاری اس کے سامنے کھول دی ہو۔

''یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟ آخر اس کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔

''آپ اس بات کو چھوڑیں کہ مجھے کس نے بتایا؟ آپ تصدیق یا تردید کریں۔''

''یہ بات تو بالکل صحیح ہے لیکن میں نے صفدر علی اور چوہدرائن کی بہتری کے لیے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی۔'' چوہدری رحمت علی نے بوجھل سی آواز میں کہا۔ پھر ساری تفصیل یعنی ساری کہانی میرے گوش گزار کر دی اور یہ کہانی مخبر آپا شاہین کی مجھ تک پہنچائی گئی کہانی سے سو فیصد مطابقت رکھتی تھی۔

''چوہدری صاحب آپ کی نیت صاف تھی آپ کو لوگوں سے نہیں ڈرنا چاہیے آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا کوئی کام آپ سے سرزد نہیں ہوا بہر حال...... میں نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔

''آپ چوہدرانی کو بھیج دیں میں تنہائی میں ان سے کچھ سوال جواب کرنا چاہتا ہوں۔'' پھر میں نے کانسٹیبل آفتاب کو بھی باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد جو خاتون میرے سامنے آئی وہ پچاس کے پھیرے میں تھی اس عمر میں بھی اس میں رعنائی تھی خوب صورتی تھی اور کشش موجود تھی۔ اس نے موٹی سی گرم قیمتی چادر سے اپنے آپ کو لپیٹا ہوا تھا۔

''چوہدرانی جی میں بھی آپ کے بیٹے کی طرح ہوں جس کرب دکھ اور تکلیف سے آپ گزر رہی ہیں اس سے میں بے خبر نہیں ہوں لیکن اپنے فرض سے مجبور ہوں۔'' اس نے صرف اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ میں نے کھنکھار کے گلہ صاف کیا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ لوگوں کی ساری کہانی مجھ تک پہنچ چکی ہے میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا حشمت علی کو یہ بات پتہ ہے کہ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

چوہدری صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور میں آپ کے سوال کو پوری طرح سمجھ گئی ہوں اب کوئی بات چھپانے کا کیا فائدہ؟ میں پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ حشمت علی کو یہ بات بالکل پتہ نہیں ہے کہ صفدر علی اس کا سوتیلا بھائی تھا یہ بات بھی آپ ذہن سے نکال دیں کہ صفدر علی کے قتل میں حشمت علی کا ہاتھ ہے دونوں بھائیوں میں بڑا پیار تھا البتہ حشمت علی اس بات پر کڑھتا رہتا تھا کہ صفدر علی حرکتیں بڑی غلط کرتا ہے جس کی وجہ سے بڑے چوہدری صاحب کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔''

''اچھا جائیداد وغیرہ کا کوئی چکر تو نہیں تھا۔''

''تھانیدار صاحب میں نے مر کر خدا کو جان دینی ہے میں نے جتنے دکھ اٹھائے تھے جتنے زخم مجھے شوکت خان نے لگائے تھے ان پر اپنی محبت کا ٹھپہ چوہدری صاحب نے رکھا اور بالکل حقیقی اولاد کی طرح صفدر علی کی پرورش کی اور جائیداد میں برابر کا حصہ دے دیا۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے چوہدری صاحب جیسے بندے خال خال ہی ہیں میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر جیب سے جائے واردات پر سے ملنے والی انگوٹھی ڈرامائی انداز میں نکالی اور اس کی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے سوال کیا۔

''اس انگوٹھی کو آپ پہچانتی ہیں؟''

''اوہ یہ انگوٹھی پہلے آپ یہ بتایئے کہ یہ انگوٹھی آپ کو ملی کہاں سے؟'' اس نے مضطربانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"فی الحال کسی مصلحت کے تحت یہ بات میں بتانے سے قاصر ہوں آپ کے جواب سے میں قاتل یا قاتلوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"یہ انگوٹھی تو میں نے کچھ عرصہ پہلے اپنی ہونے والی بہو نازیہ عرف نازی کو پہنائی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"بہت شکریہ چوہدرانی جی۔ اب آپ سے میری ایک گزارش ہے کہ ابھی آپ اس انگوٹھی کا کسی سے ذکر نہ کریں حتی کہ چوہدری صاحب سے بھی نہیں اور اپنے بیٹے حشمت علی سے بھی نہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ انگوٹھی دیکھ کر بہت زیادہ مضطرب اور پریشان ہوگئی ہے میں نے انگوٹھی کو دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اسے ابھی بہت چکر کاٹنے تھے اور عدالت میں بھی جانا تھا۔ میں نے چوہدرانی کو فارغ کردیا۔ چند ہی لمحوں بعد چوہدری رحمت علی میرے پاس آ گیا اور سوال کیا۔

"تھانیدار صاحب آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں یا ہنوز دلی دوراست والا معاملہ ہے۔"

"بس چوہدری صاحب صرف دو دن ٹھہر جائیں میں قاتل کے متعلق آپ کو بتا دوں گا۔ صرف ایک تصدیق باقی ہے۔"

پھر میں نے اس سے رخصت چاہی اور کانسٹیبل آفتاب کو لے کر حویلی کے باہر کھڑی سرکاری گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

"سر تھانے جانا ہے یا؟" ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے فرید آباد جانا ہے۔ چوہدری فرخ کی حویلی۔"

حویلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ چوہدری فرخ کی طبیعت اب بہتر ہے اور وہ اپنے بیڈروم میں ہے۔ جو ملازم یہ اطلاع لے کر آیا تھا میرے کہنے پر اس نے مجھے چوہدری فرخ کے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ کانسٹیبل آفتاب کو میں نے گاڑی میں رہنے دیا تھا اس وقت چوہدری اپنی خواب گاہ میں اکیلا تھا اور کمبل سینے تک لیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور مجھے بیڈ کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ بولا۔

"تھانیدار صاحب میرے بیٹے کی لاش کب تک مجھے مل جائے گی؟"

"آپ حوصلہ رکھیں چوہدری صاحب انشاء اللہ شام تک لاش پوسٹ مارٹم ہو کر تھانے میں آ جائے گی۔ آپ شام سے ذرا پہلے بندے بھیج دیجئے گا۔"

"تھانیدار صاحب آپ کو کچھ پتہ چلا کہ میرے دلدار کو کس نے اتنی بے دردی سے قتل کر کے لاش کنویں میں پھینک دی تھی۔"

"ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا لیکن بہت جلد میں قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ میرے سینے میں تو اس وقت ٹھنڈ پڑے گی جب قاتل پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائیں گے۔"

"انشاء اللہ ایسے ہی ہوگا۔ چوہدری صاحب میں ایک خاص مقصد لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔" میں نے چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی کھل کر بات کریں میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"منظور پہلے آپ کے پاس تھا؟"

"منظور جی ہاں وہ پہلے میرے پاس ہی تھا۔"

"میری معلومات کے مطابق آپ نے اسے ملازمت سے نکال دیا تھا۔ وجہ کیا ہوئی تھی؟"

"مجھے دلدار علی نے بتایا تھا کہ یہ قابل بھروسہ بندہ نہیں ہے اسے فوراً نکال باہر کریں۔"

"اس نے ایسا کیا کر دیا تھا؟"

"تھانیدار صاحب میں نے زیادہ کرید نہیں کی تھی ہاں اگر دلدار علی زندہ ہوتا تو وہ......" چوہدری خاموش ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں نے اس کے زخم ادھیڑ دیئے ہوں۔ بہر حال جو کچھ میں نے معلوم کرنا تھا کرلیا تھا۔ مخبر آپا شاہین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں چوہدری فرخ کی خواب گاہ سے نکل آیا تھا۔ جب ہم واپس تھانے میں پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔ میرے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں لیکن ابھی میں نے ایک کام اور کرنا تھا۔ مجھے لاش کی واپسی اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ ابھی مجھے اپنی سیٹ پر بیٹھے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سپاہی قاسم نے آ کر اطلاع دی۔ سر

لاش آ گئی ہے اور یہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ ہے۔ ساتھ ہی اس نے رپورٹ میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے سپاہی کو حکم دیا کہ جونہی کوئی لاش لینے آئے مجھے مطلع کیا جائے۔

سپاہی نے کہا ٹھیک ہے اور مجھے سلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اپنی نظریں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر مرکوز کر دیں۔ رپورٹ کے مطابق 16 دسمبر رات نو بجے اور دس بجے کے درمیان دلدار علی کی موت واقع ہوئی تھی اور یہ تاریخ صفدر علی کے قتل سے دو دن بعد کی تھی موت کا باعث وہ کٹی ہوئی گردن ہی تھی۔ اس کے علاوہ لاش کے جسم پر چوٹ یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ دلدار علی کو دو دن بعد کیوں قتل کیا گیا؟ اور وہ اس ویرانے میں کیسے پہنچا؟ یا کیوں گیا تھا؟ بہرحال آدھے گھنٹے بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ چوہدری فرخ نے چار پانچ بندے لاش لینے کے لیے بھیجے ہیں۔ میں نے حسب معمول ضروری کاغذی کارروائی کر کے لاش ان کے حوالے کر دی اس کے بعد میں نے وردی اتار کے سادہ کپڑے پہنے اور سپاہی قاسم کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمارے قدم ڈھوک نمس کے ایک گھر کی طرف اٹھنے لگے فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے پیدل ہی ہم چل پڑے تھے۔ یہ ایک چھوٹے زمیندار کا گھر تھا۔ نام اس کا عارف معلوم ہوا تھا سپاہی نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ ایک بارہ سالہ لڑکے نے کھولا۔ چند لمحے وہ ہماری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''بیٹا عارف صاحب گھر میں ہیں؟'' سپاہی نے پیار سے پوچھا۔

''جی اباجی گھر میں ہی ہیں۔ میں انہیں بھیجتا ہوں۔'' بہرحال اس کے آنے پر ہم نے اپنا تعارف کروایا۔ تو وہ بولا۔

''ٹھہریے تھانیدار صاحب میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب میں ذرا چائے پانی کے لیے کہہ دوں۔''

''عارف صاحب ہم بہت جلدی میں ہیں یہ تکلف پھر کبھی سہی ہم آپ کی بیٹی سے چند سوال پوچھنے آئے ہیں۔''

''تھانیدار صاحب میں نے چوہدری رحمت علی کے منہ کے پیچھے اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے بیٹے صفدر علی کو دے دیا تھا وہ اپنے بیٹے کے پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈال کر اس کے قدم غلط راستوں کی طرف جانے سے روکنا چاہتا تھا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔''

''خیر عارف صاحب جو کچھ ہو چکا ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔''

''میں تنہائی میں اس سے سوال و جواب کروں گا۔'' پھر میں نے سپاہی کو بھی باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جو لڑکی میرے سامنے آئی وہ بیس سال کی ایک خوب صورت لڑکی تھی اس نے ایک موٹی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

''دیکھو نازی تم میری بہنوں کی طرح ہو تم نے میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینے ہیں۔''

''تھانیدار صاحب اب کوئی بات چھپانے سے کیا فائدہ؟ آپ نے مجھے بہن کہا ہے اس لیے مجھ امید ہے کہ آپ میرا پردہ رکھیں گے۔ کیونکہ ابھی میری زندگی پڑی ہے اور میرے ماں باپ نے میری شادی بھی کرنی ہے۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''تھانیدار صاحب دلدار علی نے ایک دن مجھے کہا کہ وہ مجھ پسند کرتا ہے یہاں یہ بات میں آپ کو بتا دوں کہ ہماری ڈھوک میں ہر تین ماہ بعد مرغوں کی لڑائی کا پیڑ ہوتا ہے اور اس پیڑ میں دور دور سے اس لڑائی کے شوقین آتے ہیں اور دلدار علی اور صفدر علی بھی آئے تھے وہ اپنے مرغ تو نہیں لائے تھے لیکن جیب میں نوٹ ڈال کر ضرور لائے تھے اور شرطیں لگا رہے تھے ایسے ہی ایک پیڑ پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مجھے بھی دلدار علی اچھا لگتا تھا۔

''تھانیدار صاحب ابا نے مجھے اپنی عزت کا واسطہ دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری رحمت علی یہ کہہ رہا کہ صفدر علی کی یہ ضد ہے کہ شادی کرے گا تو صرف مجھ سے۔ ویسے سچی بات پوچھیں تو مجھے صفدر علی پسند نہیں تھا اس کا کردار بھی ٹھیک نہیں تھا لیکن ابا کی عزت کی خاطر میں چپ ہو گئی تھی اور اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس نے کچھ باتوں پر پردہ ڈال لیا تھا لیکن

میں نے بھی غیر محسوس طریقے سے اسے گھیرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دیکھو..... نازی یہ اب تو تم دلدار کو بھی کھو چکی ہو۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔

''تمہاری منگنی کی انگوٹھی کدھر ہے؟''

''تھانیدار صاحب یہ تو چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات تھی۔ وہ انگوٹھی تو میں نے اتار کر کہیں رکھ دی تھی۔''

''دیکھو نازی مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری منگنی صفدر علی کے قتل سے تین دن پہلے ہوئی تھی اچھا جاؤ تم انگوٹھی لے آؤ۔'' میں نے دیکھا کہ اس کی حالت وہی ہوگئی ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

''انگوٹھی کا آپ کیا کریں گے؟ پتہ نہیں میں کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں۔''

''وہ انگوٹھی یہ ہے۔'' اچانک میں نے ڈرامائی انداز میں جیب سے انگوٹھی نکال کر اس کے سامنے کردی۔

''یہ..... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینا آ گیا ہے۔

''دیکھو میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے کوئی بات نہ چھپانا۔ لگتا ہے صفدر علی کا قتل تم نے کیا ہے؟''

''میں نے قتل؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ تو بے ہوش ہونے کو تھی۔

''پھر سچ سچ بتادو کہ انگوٹھی جائے واردات پر کیسے پہنچی؟''

''جائے واردات پر۔'' اس نے زیر لب دہرایا۔ وہ چند لمحے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ انگوٹھی مجھ سے دلدار لے گیا تھا۔ کہتا تھا میں پیر صاحب سے اس پر ایسا دم کروادوں گا'' کہ وہ خاموش ہوگئی۔

''تو یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ صفدر علی کا قاتل دلدار ہے لیکن وہ انگوٹھی جائے واردات پر کیوں چھوڑ آیا تھا؟'' بہرحال اس سوال کا جواب ملنا اب مشکل تھا کیونکہ وہ خود قتل ہوگیا تھا۔

''لیکن اس کا قاتل کون تھا؟'' اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے نازی سے کہا۔

''ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں لیکن ایک بات تو بتاؤ کہ تم نے انگوٹھی کے سلسلے میں مجھے چکر دینے کی کوشش کیوں کی؟''

''تھانیدار صاحب مجھے معاف کردیں۔ دراصل دلدار علی نے مجھے بتادیا تھا کہ اس نے صفدر علی کا پتہ صاف کردیا ہے لیکن انگوٹھی اس کی جیب میں پڑی ہوئی تھی جو افراتفری میں وہاں گر گئی تھی میں یہ بات اس لیے چھپا رہی تھی کہ کہیں آپ مجھے بھی جرم میں شریک سمجھ کر گرفتار نہ کرلیں۔''

''دیکھو نازی بات تو کچھ ایسی ہی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں تھانے کچہری سے بچایا جائے تم بھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم نے انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ بتایا ہے۔'' اس کے بعد میں نے عارف کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر ہم وہاں سے تھانے میں واپس آ گئے تھے۔ صفدر علی کے قاتل کا تو پتا چل چکا تھا شاہد مرغوں کے پیڑ پر لڑائی کو تو اس نے معاف کردیا تھا یعنی دلدار علی نے لیکن اپنی محبوبہ کون کسی کو دیتا ہے اس سے پہلے کہ وہ سہرا باندھ کر اس کی محبوبہ کو بیاہ کر لے آتا دلدار علی نے یہ کانٹا نکال دیا اور انگوٹھی کو وہاں گرا آیا۔ جس نے آخر میں سارے راز فاش کردیے۔ میرے ذہن میں جو جھماکا ہوا تھا اب اس کے متعلق بتادوں۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال درآیا تھا کہ دلدار علی رات کے اس پہر وہاں متروکہ کنویں پر کیوں گیا تھا اور دو دن وہاں چھپا رہا تھا؟

ماسی بختاں ہی اس معاملے پر روشنی ڈال سکتی تھی۔ نازی نے مجھے کہا تھا کہ اس رات ماسی بختاں کے ذریعے اس نے دلدار علی کو بلایا تھا۔ جب ہم تھانے میں پہنچے تھے تو کافی رات ہوچکی تھی۔ اس لیے میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ اگلی صبح میں سپاہی قاسم کو ماسی بختاں کو بلانے کے لیے اور سپاہی برکت کو منظور کو پکڑ کر لانے کے لیے بھیج کر میز پر بکھرے کاغذات کو نمٹانے میں لگ گیا۔ دو دن سے میں ان کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے بتایا گیا کہ دونوں آ گئے ہیں۔ میں نے اطلاع لانے والے سپاہیوں سے کہا۔ ابھی انہیں ایک گھنٹہ کڑی نگرانی میں رکھو اور جونہی گھنٹہ پورا ہوا انہیں بھیج دینا۔ ایک ایک کرکے۔ سب سے پہلے منظور کو میرے سامنے لایا گیا۔

''منظور میاں تمہارا بہی خواہ تو اس جہاں سے ٹکٹ کٹا گیا ہے اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''تھانیدار صاحب ہمارا کام تو مالکوں کی خدمت کرنا ہے دلدار صاحب نے مجھے کہا تھا کہ میں ایک ڈرامہ کروں گا

تا کہ تم چوہدری رحمت علی کی حویلی تک رسائی حاصل کرسکو۔"

"اور تم چھوٹے چوہدری صفدر علی کو قتل کرنے میں اس کا ہاتھ بٹا سکو۔ کیوں یہی بات تھی نا۔ منظور میاں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب میرے ذمے تو صرف یہ ڈیوٹی تھی کہ میں نے اس کمرے کا پچھلا دروازہ کھلا رکھنا تھا۔" اس نے بڑی معصومیت سے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا۔ یہ عقدہ بھی حل ہوگیا تھا کہ قاتل دلدار اس کمرے تک کس طرح پہنچا تھا۔ میں نے اسے حوالات میں بند کرواکے ماسی بختاں کو بلالیا۔ اس نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کیا اور یہ بتادیا کہ پانچ سو روپے کے لالچ میں آکر اس نے دلدار کو یہ پیغام دیا تھا کہ متروک کنویں پر نازی نے رات کو اسے بلایا ہے اور اس نے یہ کام مقتول صفدر علی کے جگری یاروں منیر اور راشد خان کے کہنے پر کیا تھا وہ ایک چالیس سالہ عورت تھی۔ اور گھروں میں کام کرنے کے علاوہ یہ پیغام رسانی ہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ اپنا منہ بند رکھے۔ میں اسے بھی اس معاملے سے دور رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اگر اس کو شاملِ قتل کرتا تو نازی کو بھی مقدمے میں ملوث کرنا پڑتا لیکن قارئین یہ حالات پر منحصر تھا۔ کیونکہ مجھے اپنا فرض مقدم تھا اس کے بعد میں نے کانسٹیبل آفتاب کو بلا کر حکم دیا کہ وہ دو سپاہیوں کو ساتھ لے جائے اور منیر اور راشد خان کو لے آئے۔ انہوں نے گرفتاری دینے میں کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن اقبال جرم کرنے کے سلسلے میں تھوڑی سی مار ضرور کھائی ان کے اقبال جرم کی کہانی کچھ یوں ہے۔

جب صفدر علی قتل ہوگیا تو ان کا شک سیدھا سیدھا دلدار علی پر گیا۔ جب انہوں نے تحقیق کی تو یہ بات کھلی کہ دلدار علی اور نازی صفدر علی کی ہونے والی بیوی کے درمیان پیار کی کھچڑی پک رہی تھی اور وہ کنویں پر ملتے تھے۔ پیسوں کے لالچ اور یہ جان کر کہ صفدر علی قتل ہوچکا ہے یہ راز ماسی بختاں نے ہی افشاں کیا تھا اب تو دونوں کو یقین ہوگیا کہ صفدر علی کو دلدار نے ہی قتل کیا ہے لیکن مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ دلدار علی منظر سے غائب ہوگیا تھا۔ آخر دو دن بعد ہی انہیں اپنے ایک اور جواری دوست اکرم سے یہ پتہ چلا کہ دلدار علی کرامت عرف کرمو کے ڈیرے پر ہے وہاں رات کو جوا ہوتا ہے آخر انہوں نے ماسی بختاں کے ذریعے اسے کرمو کے ڈیرے پر پیغام بھجوایا۔ پیغام کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ بہر طور پر قسمت اور محبت کا مارا دلدار علی وہاں آ گیا۔ تینوں وہاں چھپے بیٹھے تھے ان کا تیسرا ساتھی اکرم ہی تھا اسے انہوں نے ایک ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا جو ابھی تک دیا نہیں گیا تھا۔ دلدار علی کو موت کھینچ کر وہاں لے آئی تھی۔ جونہی وہ کنویں پر پہنچا تینوں نے اسے دبوچ لیا۔ منیر نے چھری اس کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ تم نے ہی صفدر علی کو قتل کیا تھا۔ وہ اس اچانک پڑنے والی افتاد سے پہلے ہی گھبرایا ہوا اور خوفزدہ تھا جھٹ بولا۔

"اگر میں سچ سچ بتادوں تو کیا تم مجھے چھوڑ دوگے؟"

"بالکل۔" تینوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

"میں نے ہی صفدر علی کا گلہ کاٹا ہے ایک ڈنڈا اور چھری لے کر میں اس کمرے کے پچھلی طرف سے کمرے میں داخل ہوا تھا کیونکہ منظور نے پچھلا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اکرم اور راشد خان نے اسے پکڑا تھا اور منیر نے اس کے گلے پر چھری چلادی تھی۔ پھر تینوں نے مل کر لاش کنویں میں پھینک دی تھی اور آلہ قتل یعنی چھری بھی کنویں کے اندر ہی پھینک دی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ قاتل تک کسی ذریعے سے یا خود نشان دہی کرسکتے تھے انہوں نے قانون کو ہاتھ میں کیوں لیا تھا۔ منیر اور راشد کا جواب اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی مجھے اس طرح یاد ہے جس طرح یہ کل کی بات ہو۔

"تھانیدار صاحب بے شک آپ کیس بنا کر بھیج دیں لیکن ہمیں خدشہ تھا کہ دلدار کا باپ اپنا اثر رسوخ اور پیسہ خرچ کرکے اسے بری کروالیتا یا کم سزا ہوتی۔ ہم اپنے جگری یار کے قاتل کو اس طرح ذبح کرنا چاہتے تھے جس طرح اس نے ہمارے جگری یار کو کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ماسی بختاں کا نام پرچے میں شامل نہ کریں اس طرح میں نازی کو بھی اس قصے سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ قارئین آپ خود فیصلہ کریں کیا میں نے غلط کیا تھا؟

کایا پلٹ

محمد سلیم اختر

وقت کبھی یکساں نہیں رہتا سمے کے ساتھ زندگی بھی بدلتی رہتی ہے کبھی زندگی دکھ درد دیتی ہے کبھی وقت خوشیوں سے دامن بھر دیتا ہے۔ ایک نوجوان کی روداد، زمانے نے اسے دھتکار دیا تھا

آج کل کے اس ترقی یافتہ مگر خود غرض دور میں انسان کی یہ فطرت بن گئی ہے کہ وہ جھونپڑے کے عالم کی قدر نہیں کرتا لیکن محل کے جاہل کے سر پر بٹھاتا ہے کیونکہ قدریں بدل رہی ہیں، معیار زندگی سے بلند تر ہوتا جارہا ہے، ضروریات زندگی میں اضافہ ہو رہا ہے اور معیار برقرار رکھنے کے لئے دولت مند ہونا ضروری ہے۔ دولت کی اسی کشاکش نے خونی رشتوں میں بھی تقسیم کردی ہے۔ امیر رشتہ دار غریب رشتہ دار کو نزدیک نہیں آنے دیتے، ان سے نفرت کرتے ہیں اور کئی غریبوں کو اپنا رشتہ دار تسلیم ہی نہیں کرتے۔

میں نے بھی ایک غریب خاندان میں جنم لیا۔ میرے ابا جان اپنے گاؤں میں زمینداری کرتے تھے۔ زمین اتنی زیادہ نہ تھی اس لئے بمشکل گزر بسر ہی ہوتی تھی۔ میرے ماں اور باپ دونوں معمولی پڑھے لکھے تھے جب کہ ہماری برادری کے کچھ افراد نے تعلیم حاصل کی اور شہر میں جا کر ملازمت کرنے لگے، پھر کچھ نے بعد میں شہر میں ہی مستقل رہائش رکھ لی اور اپنے ذاتی گھر بھی بنا لئے۔ ان میں میری خالہ بھی شامل تھیں۔ میرے خالو کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے مگر انہوں نے گریجویشن کرنے کے بعد مختلف کورس کئے اور گورنمنٹ کے ایک ادارہ میں اچھی پوسٹ پر فائز ہو گئے۔ میرے امی اور ابا عموماً انہیں ملنے جاتے رہتے تھے۔ میری امی اور ابو عموماً انہیں ملنے جاتے رہتے تھے۔ میری امی غیر معمولی طور پر حسین تھیں، میری خالہ بھی کم نہ تھیں، اسی لئے ان کی اولاد بھی حسین ہی تھی۔ خالہ کی لڑکی نورین مجھ سے ایک سال بڑی ہے۔ بچپن میں ہم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ جب بھی میں شہر اس کے گھر جاتا یا بھی وہ ہمارے گھر آتی تو ہم جی بھر کر کھیلا کرتے، لڑائی جھگڑا بھی کرتے اور خود ہی راضی بھی ہو جاتے۔ نورین کا شمار خاندان کی خوبصورت ترین بچیوں میں ہوتا تھا جب کہ میں لڑکوں میں بہت ہی خوبصورت تھا۔ برادری کے سب لوگ ہم دونوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔

میں ان دنوں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا کہ ابو جان اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی بے وقت موت نے امی اور مجھے بے آسرا کر ڈالا۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ برادری کے لوگوں نے بہت چاہا کہ امی دوسری شادی کرلیں مگر وہ نہ مانیں، انہوں نے میری اور کنیز کی خاطر اپنی جوانی کی پروا نہ کی اور وہ خود محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلانے لگیں۔ تھوڑی بہت جو زمین تھی، وہ پٹے پر دے دی اور ہماری خاطر دن رات ایک کر ڈالا، انہوں نے لوگوں کے گھر میں کام کیا اور میری پڑھائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا۔ جب ابو زندہ تھے تو اس وقت مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا مگر اب جب ابو اس دنیا میں نہ رہے تو پڑھائی سے میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میں اکثر ابو کو یاد کر کے روتا رہتا تھا، امی میری ڈھارس بندھاتی تھیں مگر میں اب پڑھنا نہیں چاہتا تھا اور امی نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا...... ابا جان اس دنیا سے کیا گئے کہ ہمارے رشتہ داروں نے بھی منہ پھیر لئے، دکھ اور درد کے اس عالم میں کسی نے بھی ہمدردی کے دو بول ہم سے نہ کہے کیونکہ ہم غریب تھے۔ میرے خالو اور خالہ نے بھی ہماری دلجوئی نہ کی، وہ صرف ایک رات ہمارے گاؤں ٹھہر کر واپس شہر چلے گئے اور پلٹ کر ہماری خبر نہ لی۔ خالہ



جمیلہ کا تعلق اسی گاؤں سے تھا اور وہ معمولی پڑھی لکھی تھیں مگر اب ان کے نخرے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ خود کو ''بیگم صاحبہ'' کہلوانے لگی تھیں۔ نورین اور اس کے دیگر بہن بھائی بھی کم نہ نکلے بلکہ وہ اپنی ماں سے دو ہاتھ آگے تھے۔ نورین کا تو اب گاؤں کے ماحول میں دم گھٹتا تھا۔ میں نے بچپن میں ہی خونی رشتوں کی اتنی بے حسی دیکھی تو میں تڑپ اٹھا۔ پھر جیسے تیسے کر کے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور یہ عہد کیا کہ اب میں شہر میں کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کروں گا۔ میں اب جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ میں اپنے دراز قد، سرخ و سپید رنگت اور خوبصورت نقوش کے باعث ہمیشہ ہی صنف مخالفت میں مقبول رہا ہوں مگر میں نے کسی کو بھی گھاس نہ ڈالی کیونکہ میرے خوابوں میں تو نورین بسی ہوئی تھی، میں دن رات اس کے ملن کے خواب دیکھا کرتا تھا حالانکہ ہم دونوں میں اس موضوع پر کبھی بات ہی نہ ہوئی تھی مگر پھر بھی مجھے یہ یقین تھا کہ نورین میری محبت کر ٹھکرائے گی نہیں، وہ حسن اور خوبصورتی کا ایک جیتا جاگتا اور مکمل شاہکار تھی۔ وہ بچپن میں بھی کم نہ تھی مگر اب جوانی میں اس کا حسن دو چند ہو گیا تھا، اس کے حسن کی رعنائیاں میرے جسم و جاں میں لہو بن کر دوڑنے لگی تھیں...... جب بھی مہینوں بعد اس کا دیدار نصیب ہوتا تو جی چاہتا تھا کہ میں اسے اس دنیا کی نظروں سے چھپا لوں مگر یہ سب تو میرے خواب تھے، سپنے تھے جو میں روز دیکھتا تھا جب کہ نورین نے اب تو کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہ کی تھی۔ وہ بچپن کا زمانہ بھول گئی تھی، بے پناہ خوبصورتی اور دولت نے اسے مغرور بنا ڈالا تھا۔ وہ ہر وقت امیری کے نشہ میں سرشار رہنے لگی تھی، شہری ماحول نے اسے بہت ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ دن بدن پہلے سے بھی زیادہ نکھرتی جا رہی تھی اور شاید پیسہ چیز ہی ایسی ہے جو کینوس میں رنگوں کو سمیٹ کر دلکش شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ نورین کی مجھ سے یہی بے خبری کبھی کبھی مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیتی مگر اس دل کا کیا کرتا جو مانتا ہی نہ تھا۔ یہ تو ان کو معلوم ہوگا کہ جن کے دل میں کوئی بسا ہوتا ہے اور وہ اسے دل سے نکال کر اپنی دسترس میں لانا چاہتے ہوں مگر لا نہیں سکیں، وہ اتنا

نزدیک ہوتا ہے کہ جب ذرا گردن جھکائیں دیکھ لیں اور اس قدر دور ہوتا ہے کہ ہاتھ بڑھانے پر ہاتھ نہ آئے اور چاند کو دیکھنے والے بچے کی طرح ہمک کر رہ جائیں۔ ایسے لوگوں پر تو ایک لمحہ صدیوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ کئی بار من میں آئی کہ میں نورین پر اپنی چاہت کا اظہار کردوں، اسے کہہ دوں کہ نورین! میں تمہیں چاہتا ہوں اپنے آپ سے بڑھ کر، تم میری شریانوں میں میرے لہو کے ساتھ ساتھ تیرتی ہو...... مگر ہمت نہ ہوتی، میں خاموش اور چپ چاپ اپنی غربت کا ماتم کرنے لگتا اور ایسے میں مجھے ماں اور کنیز کا خیال آنے لگتا۔

میں نے کئی جگہوں پر درخواستیں ارسال کر رکھی تھیں۔ کہیں سے تو بلاوا ہی نہ آتا تھا اور اگر انٹرویو کا بلاوا آ بھی جاتا تو رشوت اور سفارش نہ ہونے کی وجہ سے میں ناکام ہوجاتا پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ امی میری کامیابی کے لئے دن رات دعائیں مانگا کرتی تھیں اس لئے مجھے یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔ پھر دو سال ٹھوکریں کھانے کے بعد تقدیر کو مجھ پر رحم آ ہی گیا، میری ماں کی دعائیں رنگ لائیں اور مجھے ایک گورنمنٹ ادارہ میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ وہ دن میرے اور میری ماں کے لئے زندگی کا بہترین دن تھا۔ میں اپنے گاؤں سے بہت دور راولپنڈی چلا آیا جہاں اس محکمہ کا زونل آفس تھا۔ میں نے وہاں رپورٹ کی تو مجھے محکمہ کی ایک برانچ آفس میں تبدیل کردیا گیا جو کہ واہ فیکٹری میں واقع ہے۔ چند دن نئے ماحول اور نئے شہر میں پریشانی سی رہی مگر آہستہ آہستہ میں گھل مل گیا۔ دو تین ماہ بعد میری یہاں سے بھی تبدیلی ہوگئی اور میں اس شہر آیا، جہاں نورین اور خالہ، خالو رہتے تھے۔ وہ شہر ہمارے گاؤں بھی نزدیک تھا۔ میں بہت ہی خوش ہوا اور خوشی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب نورین سے ملنے کے مواقع ملتے رہیں گے۔ میں نے سب سے پہلے ڈیوٹی جوائن کی اور اپنی رہائش کا بندوبست کرنے کے بعد نورین کے گھر چلا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری تبدیلی اب اس شہر میں ہوگئی ہے مگر کسی نے بھی میری آمد پر خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ ان سب کا سلوک بیگانوں جیسا تھا، صرف خالہ نے میری تھوڑی بہت آؤ بھگت کی مگر اس میں بھی بناوٹ کا عنصر نمایاں تھا میں نے اندازہ لگالیا کہ ان لوگوں کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا کیونکہ میری وہاں موجودگی میں ہی خالہ اور نورین کسی جاننے والے کے گھر چلی گئیں اور گھر میں خالو اور چھوٹے بچے رہ گئے۔ میں بھی لوٹ آیا، اب یہ یقین ہوگیا تھا کہ میرے مقدر کے آسمان میں نورین کا ستارہ نہیں ہے، وہ اور میں ایک نہ ہوسکیں گے کیونکہ میں ان لوگوں کے معیار سے بہت پست ہوں لیکن دل ان حقائق کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ دل کے ہاتھوں ہی مجبور ہوکر میں نے نورین کے نام ایک خط لکھا جس میں اس بات کا اظہار کیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور یہ میری ہی نہیں، میری ماں کی بھی خواہش ہے۔ میں تو بچپن ہی سے تمہیں چاہتا ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ اب میری محبت بھی جوان ہوگئی ہے، تمہیں پانے کی خواہش دل کے آنگن میں واویلا مچاتی رہتی ہے اور اب تمہارا حصول ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ یہ خط لکھنے کے بعد میں پھر نورین کے گھر گیا اور خط اسے جلدی میں دے کر اس گھر سے نکل آیا۔ دو دن خیریت سے گزر گئے، تیسرے دن نورین میری رہائش گاہ پر آگئی۔ وہ نہایت ہی غصہ میں لگ رہی تھی۔ وہ گاڑی میں آئی تھی، جسے کوئی نوجوان چلا رہا تھا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا نورین کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ نورین نے آتے ہی غصہ سے بولنا شروع کردیا کہنے لگی۔

''ساجد! تمہاری پہلی بدتمیزی معاف کررہی ہوں مگر اس کے بعد تمہیں معافی نہیں ملے گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے میرا لکھا ہوا خط میرے سامنے ہی پھاڑ کر ریزہ ریزہ کرڈالا اور کہنے لگی۔'' تم اپنی اوقات تو دیکھو...... زمین کی خاک ہوکر آسمان سے ملن کے خواب دیکھتے ہو، تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ جتنی تمہاری ایک ماہ کی تنخواہ ہے، اس سے زیادہ تو میرا جیب خرچ ہے، میں تو تم جیسے شخص سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ ہم میں اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے، تم زمین کی خاک ہو اور خاک پر ہی رہی تو بہتر ہے۔ تم جو خواب دیکھ رہے ہو اس کی تعبیر نہیں ملے گی، زمین پر ہی رہو اور آسمان تک پہنچنے کی کوشش نہ کرو۔''

نورین نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی اور غصہ

سے پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ میرے دل اور دماغ سے نورین سے عشق کرنے کا بھوت لمحوں میں اتر گیا۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھ رہی تھی، میں جان گیا کہ نورین کے ساتھ جولڑکا گاڑی میں آیا تھا وہ یقیناً اس کا محبوب ہوگا اور کسی امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہوگا جب کہ میں ایک مفلس اور دیہاتی شخص ہوں، میرا اور ان کا بھلا کیا مقابلہ؟...... وقتی طور پر نورین کی تلخ باتوں نے مجھے بہت دکھ پہنچایا، مجھے اپنی غربت اور بے بسی پر رونا بھی آیا لیکن میں نے یہ سب کچھ حقیقت جان کر برداشت کرلیا اور یہ عہد کیا کہ آج کے بعد میں نورین کے سپنے نہیں دیکھوں گا اور آئندہ کبھی بھول کر بھی اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ میں نے اس پر عمل بھی کیا اور اپنی تمام توجہ ملازمت پر لگادی، میں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا کہ غربت ہی میرا مقدر ہے اور تمام عمر یہ طوق گلے میں پڑا رہے گا کیونکہ میری بنیادیں غربت کی مٹی سے تعمیر کی گئی ہیں۔ میں نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیئے کیونکہ امیری اور غریبی کے درمیان حائل خلیج کبھی بھی ریپ نہیں ہوسکتی تھی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس خلیج کی گہرائی میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، یہ انسانی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے اور یہ بعض اوقات اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے، خصوصاً ''اس وقت جب رشتے اپنا بھرم رکھو بیٹھیں، امیری رشتہ داروں کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ جائے اور وہ دولت کی خاطر محبت جیسے پاک اور مقدس جذبوں کا بھی خون کرنے لگیں حالانکہ محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہوتا ہے۔

میں جسادارہ میں ملازمت کرتا تھا وہ اوپر کی کمائی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ بدنام ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والے کئی کلرک لاکھوں کے مالک تھے مگر میرے ضمیر نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ میں جانتا تھا کہ حرام کی کمائی وقتی طور پر بہت لذت دیتی ہے اور جب یہ رگوں میں خون بن کر گردش کرنے لگتی ہے تو انسان سے اچھائی اور برائی کی تمیز چھین لیتی ہے پھر ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب یہ خون کینسر بن کر رگوں میں دوڑتا ہے اور اس وقت سوائے پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا...... میں جانتا تھا کہ نورین کا باپ بھی ان ہی طریقوں سے

نظم

دسمبر جب بھی آتا ہے
کئی سالوں سے میرا
مشغلہ ہے یہ کہ
تیرے آنے کے دن گن کے
پھول نرگس کے
اپنے کمرے میں
سجائے رکھتی ہوں
اور دسمبر جب بھی آتا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے
بس اب ان
پیلے پھولوں کی جگہ
سُرخ پھول لے لیں گے
مگر دسمبر آ کے گزر جاتا ہے
اور ہر بار ہی
پیلے پھولوں سے
گلدان کو فرصت نہیں ملتی
بالکل ایسی ہے جیسے
مجھے تم سے ''محبت'' نہیں ملتی

(شاعرہ: فوزیہ غزل...... شیخوپورہ)

امیر بنا ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس کی سزا بھی ضرور بھگتے گا کیونکہ غلط راستوں سے آنے والی دولت اپنے ساتھ برائیوں کا انبار بھی لاتی ہے۔

ایک سال بعد میری تبدیلی پھر راولپنڈی ہوگئی۔ میں نے کرایہ کا چھوٹا سا مکان لے لیا۔ پھر امی اور کنیز کو پنڈی لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ رضا مند نہ ہوئیں۔ راولپنڈی کا زونل آفس بہت بڑا ہے جس میں چالیس کے قریب آفیسر بیٹھتے تھے اور ہر ایک کا اپنا اپنا حلقہ اور اسٹاف تھا۔ چند ایک لڑکیاں بھی اس دفتر میں کرتی تھیں۔

میں شروع میں اتنے بڑے دفتر اور نئے ماحول میں بہت ہی نروس رہا مگر پھر اس ماحول میں رچ بس گیا۔ اسی دفتر میں ایک لیڈی افسر تھی۔ اس کا نام ہما تھا۔ اس کے بارے میں دفتر کے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ وہ بہت ہی سخت آفیسر ہے اور اسٹاف اس سے ہمیشہ تنگ رہتا ہے، غیر شادی شدہ اور حد سے بڑھ کر حسین ہے اور کام کے معاملہ میں وہ کسی کے ساتھ نرمی نہیں برتتی اور یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حکام اس کی کارکردگی سے بہت مطمئن ہیں۔ کئی بار یونین والوں نے اس کے خلاف نعرہ بازی بھی کی اور اس کو یہاں سے تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی مگر ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی اور ہما کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی، اس کا حوصلہ اور بھی زیادہ ہوگیا۔ وہاں کے حالات اور سب کی باتیں سن کر میں نے بھی دعا مانگی کی میری اس کے ساتھ ڈیوٹی نہ لگے کہ ساتھیوں سے اس کے بارے میں سن سن کر اس سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ دفتر کے قریب ہی سرکاری بنگلے میں رہائش پزیر تھی پھر ایک سال اور گزرا تو میری تبدیلی میڈم ہما کے ساتھ کر دی گئی۔ ٹرانسفر آرڈر پڑھ کر میرا خون خشک ہونے لگا کہ اب آزادی اور بے فکری کے دن ختم ہو جائیں گے۔ دل پر پتھر رکھ کر میں نے حاضری کی رپورٹ دی۔ جب روزانہ کی ڈاک میں میری حاضری رپورٹ میڈم کے پاس گئی تو انہوں نے مجھے اپنے کمرہ میں بلا لیا۔ میں نے ڈرتے جھجکتے ہوئے کمرہ میں قدم رکھا تو انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بولیں۔

''ساجد تمہارا نام ہے؟''

''جی......''

''ساجد! میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم میرے ساتھ پہلی مرتبہ ڈیوٹی کر رہے ہو۔ چند ضروری باتیں نوٹ کرلو...... دفتر وقت پر آنا اور وقت پر جانا ہے اور چھٹی کرنے کی صورت میں مجھ سے پیشگی اجازت لینی ضروری ہے۔ میں کبھی انکار نہ کروں گی اور اگر بغیر درخواست کے چھٹی کی تو میں کبھی معاف نہ کروں گی...... پبلک میں سے کسی کو بھی شکایت نہیں ملنی چاہئے۔ رشوت اس دفتر میں عام ہے مگر میں اس کے سخت خلاف ہوں، اگر تم نے ایک روپیہ بھی رشوت لی اور مجھے خبر ہوگئی تو میں تمہاری چھٹی کرا دوں گی...... ہر کام وقت پر ہونا ہے، روزانہ کا کام ہر روز ختم ہونا چاہئے اور کوئی کام التوا میں نہیں پڑنا چاہئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ جھوٹ نہیں بولنا کیونکہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے...... ہاں، اگر تمہیں کسی قسم کی پریشانی یا کوئی مسئلہ درپیش ہو، خواہ وہ گھریلو ہی کیوں نہ ہو تو مجھے بتاؤ، میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔''

میں ان کی ہر بات پر ''جی میڈم'' اور ''یس میڈم'' ہی کہتا رہا...... انہوں نے ایک بار پھر میرا بھرپور جائزہ لیا اور کہنے لگیں کہ اب تم جا سکتے ہو۔ میں ان کے کمرہ سے باہر نکلا تو میرا تمام ڈر اور خوف ختم ہوگیا کیونکہ وہ تو ویسی نہ نکلیں جیسے اسٹاف کے لوگوں نے ان کے بارے میں بتایا تھا۔ میں میڈم ہما کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف خوب سیرت ہی نہ تھیں بلکہ خوبصورت صورت بھی تھی۔ جلد ہی میں اس دفتر کے ماحول میں گھل مل گیا، میڈم ہما کا خوف ختم ہوگیا۔ میں نے میڈم ہما کی ہر بات پر عمل کیا اور انہیں کسی بھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ وہ میرے کام سے بہت خوش تھیں اور میں بھی ان کے کردار کا معترف ہوگیا۔ لوگ کہتے تھے کہ میڈم ہما بہت بدتمیز عورت ہے، اسٹاف کے لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے مگر میرے ساتھ آج تک ایسا نہ ہوا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ لوگ جھوٹ کہتے تھے۔ وہ یقیناً غلط کام کرتے ہوں گے اور اسی وجہ سے میڈم ہما کی ان کے ساتھ نہ بنتی ہوگی اور یہ حقیقت تھی، وہی لوگ میڈم ہما کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے جو رشوت لیتے تھے اور میڈم ہما ان کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھیں۔

میڈم ہما کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے ایک سال ہوگیا۔ میری تبدیلی دوسرے دفتر میں ہوئی میڈم نے میری تبدیلی رکوالی۔ اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ اسٹاف ممبر بھی حیران تھے کہ میں میڈم کے ساتھ کیوں رہنا چاہتا ہوں؟ کچھ نے تو یہ الزام بھی لگا دیا کہ میڈم میں نے آپس میں سمجھوتہ کرلیا ہے اور اب ہم مل کر رشوت لیتے ہوں گے مگر جلد ہی یہ افواہ بھی دم توڑ گئی۔ میڈم کے بارے میں تو اب کم ہی بات ہوتی مگر میرا انداق

جی بھر کر اڑایا جاتا۔ میرا لباس مکمل طور پر دیہاتی ہی تھا، پاؤں میں سستی قسم کی چپل ہوئی تھی جو ہمارے گاؤں کے موچی گلو کے ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ پینٹ شرٹ اور کوٹ خریدنے کی استطاعت ہی نہ رکھتا تھا، مجھے اپنی سادگی اور غربت سے پیار ہوگیا تھا آہستہ آہستہ میں بھی شہری ماحول کا عادی ہونے لگا۔ غریب ہونے کے باوجود میں تمام سیکشن میں کام کرنے والے ساتھیوں سے منفرد تھا۔ میرے پاس مردانہ حسن کی انمول دولت تھی اس لئے میں رب کا ہر وقت شکر ادا کرتا تھا، نماز پابندی سے پڑھتا تھا اور کسی قسم کی برائی کو اپنے اوپر حاوی نے ہونے دیا تھا۔

ایک روز میڈم نے مجھ سے کہا کہ میں فلاں فلاں فائل لے کر ان کے کمرہ میں آجاؤں، میں نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کی اور مطلوبہ فائلیں لے کر ان کے کمرہ میں چلا گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر کہا کہ ان فائلوں میں فلاں فلاں کام کرنا ہے، تم یہاں ہی بیٹھو اور کام ختم کر کے جاؤ۔ میں بھلا کیسے انکار کرسکتا تھا، میں نے کام شروع کر دیا، یہاں تک چھٹی کا وقت ہوگیا۔ میڈم نے مجھے چھٹی دی اور میں گھر چلا آیا...... پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میڈم مجھے روزانہ ہی اپنے کمرے میں بلا کر کام پر لگا دیتیں اور میں زیادہ وقت ان کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے لگا۔ یہ میری مرضی کے خلاف تھا، میں قیدی کی طرح ان کے کمرے میں اور ان کے سامنے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اتنی ہمت نہ تھی جو میں میڈم سے کہہ سکوں کہ میں یہاں بیٹھ کر کام نہیں کرسکتا لہٰذا میں بھی مجبوراً دن گزار رہا تھا۔ میری کسی بھی غلطی پر مجھے میڈم نے نہ ڈانٹا، میڈم مجھے کچھ کہنے کی بجائے ان غلطیوں کو خود ہی درست کر دیتیں اور میں ان کی اس مہربانی اور نرمی پر حیران تھا، ورنہ وہ تو سٹاف میں سے کسی فرد کی املا کی غلطی بھی معاف نہ کرتی تھیں اور کھڑے کھڑے اسے ذلیل کر کے رکھ دیتی تھیں۔ کام کے دوران کئی بار میں جب نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو میڈم کی نگاہیں مجھ پر ہی ہوتی تھیں اور یہ دیکھ کر مجھ پر بھی گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ ایک روز میں نے انجانے میں اپنے ٹانگیں سیدھی کیں تو میرے پاؤں میڈم کے پیروں پر جا لگے۔ میں نے فوراً ٹانگیں پیچھے کھینچیں اور خوفزدہ ہوگیا کہ آج میری خیر نہیں، آج میڈم مجھے معاف نہیں کریں گی، ابھی ڈانٹ اور نہ جانے کیا کچھ سننا پڑے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ میڈم نے صرف اتنا کہا کہ ساجد! اپنی حد میں رہو...... ان کے لہجے میں سختی تھی، ان کے رویہ میں

آدرش

اپنی اس زندگی میں سے
چند صرف چند لمحے
میرے نام کرو
میں ان چند لمحوں میں
خاموش لبوں پہ ترے گلاب سے کھلا دوں گی
رنگ کچھ انوکھے سے تری آنکھوں میں سجادوں گی
محبتیں لینے محبتیں دینے کا ہنر تجھ کو سکھادوں گی
چھوڑ گئے تھے جو تجھے آشفتہ سرجان کے
انہی کا تجھ کو "آدرش" بنادوں گی
پھر ہماری
ان کھوئی کھوئی آنکھوں کے اشک تھم جائیں گے
پھر تمہارے
اس آزردہ چہرے پر دھنک رنگ بکھر جائیں گے
بعد اس کے
پھر تم مجھ سے
نا کوئی تعلق روا رکھنا
نا روکنا نا صدا دینا چاہے مجھے بھلا دینا
بس
چند صرف چند لمحے میرے نام کرو
وہی لمحے میری حاصلِ زیست ہوں گے
دیکھ کے جس لمحے تجھ کو
دُنیا رشک کرے گی
وہی لمحے
میری جیت ہوں گے
(شاعرہ: روبیہ راجہ...... ٹیکسلا)

بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اپنے کام میں مگن ہوگئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران میڈم نے مجھ سے میرے گھریلو حالات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلیں۔ میں نے بھی انہیں سب کچھ بتا دیا، نورین اور خالہ کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ اب مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، میں صرف زندہ رہنے کے لئے سروس کررہا ہوں، امیر بننے کے لئے نہیں کیونکہ امیر لوگوں کو خونی رشتوں سے زیادہ دولت عزیز ہوتی ہے۔ میڈم کو میری باتوں سے اتفاق تھا مگر انہوں نے دولت مندوں کو کبھی برا نہیں کہا تھا۔ میرے گھریلو حالات جان کر انہیں مجھ سے کچھ اور ہمدردی سی ہوگئی تھی، بعض اوقات لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کہہ نہیں پاتیں...... چھ ماہ بعد میری میڈم کے کمرہ میں کام کرنے سے جان چھوٹ گئی، میں آزاد ہوکر کھلی فضا میں آگیا، قید سے رہائی مل گئی۔ اس دوران میڈم میرے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھیں کہ میں ایک سیدھا سادا دیہاتی نوجوان ہوں جو من کا سچا اور کھرا ہے، جسے جھوٹ بولنا نہیں آتا، جسے دولت سے پیار نہیں، انہیں یقین ہوگیا تھا کہ میں نے نہ کبھی رشوت لی ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچا ہے۔ میری سالانہ رپورٹ انہوں نے ان قدر بہتر لکھی کہ میری ترقی ہوگئی۔ میں سینئر کلرک بن گیا مگر پھر بھی میرے رویہ میں تبدیلی نہ آئی۔ میں نے میڈم کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے مجھے منع کردیا اور کہنے لگیں۔

''ساجد! اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اگر تم محنت کرو گے تو ترقی بھی کرو گے۔ محنت کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے اور زندگی کام کرنے کا دوسرا نام ہے، یہ ایک عظیم نعمت بھی ہے اور انسان کو بھی اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔''

میڈم ہما کا رویہ میرے ساتھ دن بدن بہتر ہونے لگا، ان کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا ہوگیا جیسے میں ان کا کوئی عزیز ہوں۔ وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتیں اور گھریلو حالات کے بارے میں بھی استفسار کرتیں اور یہ تو وہ عموماً کہتیں کہ اگر کبھی بھی کسی قسم کی پریشانی ہو تو مجھے ضرور بتانا، میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں کسی پرائیویٹ کالج میں شام کی کلاس میں داخلہ لے لوں اور اپنا مستقبل روشن کروں مگر مجھے مزید پڑھنے کا قطعی شوق نہ رہا تھا۔ پھر بھی میڈم کے اصرار پر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور پڑھائی شروع کردی۔ میڈم نے بھی اس معاملہ میں میری مدد کی، دفتر کے کام کا بوجھ مجھ پر کم کردیا۔ بعض اوقات دفتر میں دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا مگر میڈم نے مجھے اس سے بھی نجات دلا دی۔ میں میڈم کی ان مہربانیوں پر ان کا نہایت ہی ممنون تھا۔ وہ میرے نزدیک انسان نہیں فرشتہ تھیں، دن بدن میں ان کی مہربانیوں اور احسانوں کے بوجھ تلے دبتا جارہا تھا، ان کا احترام میرے دل میں دن بدن بڑھتا گیا اور وہ سب کچھ غلط ثابت ہوگیا جو لوگ کہتے تھے۔ میرے نزدیک میڈم ہما عظمت کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ اخلاق و کردار کی بلندی کی حامل، ان کی باتوں میں شرینی تھی، میں ان کا یوں احترام کرنے لگا جیسے وہ میرے لئے نہایت ہی محترم ہستی ہوں۔

میں ان دنوں فرسٹ ایئر کا امتحان دے رہا تھا کہ میڈم ہما کی تبدیلی اسلام آباد ہوگئی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اسلام آباد آجاؤں مگر میں نے رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ میڈم اسلام آباد چلی گئیں مگر انہوں نے رہائش راولپنڈی میں ہی رکھی۔ میڈم کے چلے جانے سے میں کسی حد تک ان کی کمی محسوس کرتا رہا۔ ایک سال بعد میڈم ہما کی تبدیلی راولپنڈی ہوگئی اور چند ماہ بعد ہما نے بھی پھر میری تبدیلی اپنے پاس کرالی۔ میں لاعلم تھا کہ میڈم ہما کو مجھ سے اتنی دلچسپی ہوگئی ہے، میں ایک غریب سا انسان ہوں اور وہ گریڈ اٹھارہ کی آفیسر ہیں...... ان کی اس دلچسپی اور توجہ سے مجھے بعض اوقات نہ جانے کیوں ایک خوف سا محسوس ہونے لگتا تھا......

میں نے ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو میڈم ہما بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے مجھے مبارک دی اور ایک گفٹ پیک بھی دیا۔ میں اتنا خوش نہ تھا جتنا کہ میڈم ہما میری کامیابی پر خوش تھیں۔ یوں جیسے کامیابی میں نے نہیں، انہوں نے حاصل کی ہو۔ میڈم نے مجھے تاکید کی کہ میں اب بی اے میں داخلہ لے لوں مگر میں نے ابھی تک حتمی فیصلہ نہ کیا تھا کہ میں مزید

پڑھوں گا یا نہیں؟ چھٹی کے بعد جب میں گھر آیا اور میڈم ہما کا دیا ہوا تحفہ کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک قیمتی سوٹ کا کپڑا نکلا۔ اس کے علاوہ ایک بند لفافہ بھی تھا۔ میں نے وہ کھولا تو اس میں ایک ہزار روپے اور ایک خط تھا۔ میں میڈم ہما کی اتنی مہربانی پر بہت حیران ہوا۔ میں نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

ساجد! سلام خلوص

ایف اے کے امتحان میں شاندار کامیابی پر ایک بار پھر میری طرف سے مبارک باد...... ساجد! ہر شخص زندگی میں ایک بار ضرور محبت کرتا ہے جس طرح تم نے نورین کو چاہا، اس کو پوجا، اب یہ علیحدہ بات ہے کہ کہ اسے تم سے محبت نہیں بلکہ وہ کسی اور کو چاہتی ہوگی، مجھے اپنے اور تمہارے عہدے کے لحاظ سے یہ زیب نہیں دیتا مگر کیا کروں، مجبور ہوں اور پھر محبت تو مذہب، اونچ نیچ رنگ و نسل اور عہدوں کی پابند نہیں ہوا کرتی ...... بس یہ ہو جاتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا، جیسے تمہیں بھی خبر نہیں ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں، پرکھا بھی ہے۔ میں نے تمہیں خودغرضی اور نفسانفسی کے اس دور میں دیگر انسانوں سے مختلف پایا ہے۔ تم ایک مخلص، سچے اور بے ضرر انسان ہو اور تمہاری یہی خوبیاں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں۔ تم یقیناً میرے اس اظہار سے حیران اور پریشان ہو گے اور سوچو گے کہ ایک کلرک اور ایک آفیسر کا ملن کیونکر ممکن ہوگا؟ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گی بلکہ تمہیں اس محبت کے سہارے ایک ایسا اعتماد بخشوں گی کہ تم نہ صرف مجھ پر بلکہ اپنے آپ پر فخر کرو گے۔ میری اس محبت کو ترس اور رحم نہ سمجھنا، میری محبت تمہیں احترام دے گی...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید تمہیں یقین آ جائے میں صرف نام کی ہما نہیں بلکہ سچ مچ کی ہما بن کر تمہارے سر پر بیٹھ گئی ہوں۔ تم زمانے والوں کی پروا نہ کرنا، یہ تو سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنا دیتے ہیں۔ بس، یاد رکھنا کہ میں عورت ہو کر پہل کر رہی ہوں، مجھے زمانے کی پروا نہیں ہے اور نہ تم کو کسی قسم کی فکر کرنی ہے، میں حالات کو خود سنبھال لوں گی۔

میڈم ہما کا خط پڑھ کر میرا جسم آندھیوں کی زد میں آ گیا۔ میں نے تو ایسا خواب میں بھی نہ سوچا تھا...... کہیں

نظم

جذبے تو ایک جیسے ہوتے ہیں
بس پیار اپنے اپنے ہوتے ہیں
کچھ دیکھے کچھ ان دیکھے ہوتے ہیں
کبھی بے وفا لوگ بھی تو سچے ہوتے ہیں
کبھی چہرے پر معصوم انا کا خول لیے ہوتے ہیں
سچ ہے کب سب اپنے ہوتے ہیں
سونے جیسی چمک، چاندی جیسا پن
کبھی کھرے اور کبھی کھوٹے ہوتے ہیں
لوگ بھی کیسے کیسے ہوتے ہیں
جذبے تو ایک جیسے ہوتے ہیں
بس پیار اپنے اپنے ہوتے ہیں

(گل بانو...... حسن ابدال)

ہما دیوانی تو نہیں ہو گئیں؟ میں نے سوچا مگر ان کا کھلا خط ان کی محبت کا نقارہ بن گیا تھا...... میں اس قابل کہاں تھا، نورین نے مجھے اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کا باپ دولت مند تھا جب کہ ہما تو خود دولت مند ہے پھر یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا ہے؟...... یہ سوچتے سوچتے میرا جسم کانپنے لگا اور پھر تمام رات میں نے سوچتے اور جاگتے گزار دی۔ صبح بخار کی سی کیفیت ہو گئی تو میں نے دو دن کی چھٹی کی درخواست بھیج دی اور میں اگر تندرست بھی ہوتا تو بھی شاید دفتر نہ ہی جاتا کیونکہ میں میڈم ہما کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔

اسی دن دفتر کے اوقات ختم ہونے کے کچھ دیر بعد ہی میں میڈم ہما کو اپنے مکان پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے ہاتھوں میں پھول اور پھلوں کا لفافہ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے ان کے احترام میں اٹھنا چاہا تو وہ فوراً آگے بڑھیں اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئیں اور بولیں۔

''ساجد!...... کیسے ہو؟''۔

''جی میڈم، پہلے سے کچھ بہتر ہوں۔''

''یہ دفتر نہیں ہے، گھر ہے...... یہاں مجھے میڈم نہ کہو، صرف میرا نام اور میرا نام میڈم نہیں، ہما ہے......''

ان کے لہجے میں شیرینی اور محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا مگر ان کے رعب کی تاب نہ لاسکا۔ وہ بری طرح میرے جذبات اور اعصاب پر اثر انداز ہوگئیں تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگیں کہ ساجد! چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ میں نے انکار کردیا تو وہ ڈاکٹر کو میرے گھر لے آئیں اور ادویات اور ڈاکٹر کی فیس کا خرچ انہوں نے خود برداشت کیا۔ اگلے دن میری طبیعت کچھ سنبھل گئی وہ پھر آگئیں۔ انہوں نے میری حالت میں بہتری دیکھی تو بہت خوش ہوئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ کھل کر باتیں کروں مگر میں شرما رہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کیونکہ مجھے اپنی حیثیت کا احساس تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ محبت صرف پھولوں کی سیج نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی کانٹوں کا بچھونا بھی بن جاتی ہے۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ ہما کی آواز نے چونکادیا۔

''ساجد! لگتا ہے تمہیں میری محبت اور باتوں پر یقین نہیں آیا۔''

''نہیں میڈم! ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو پہلے ہی آپ کے احسانوں تلے دبا ہوا ہوں اور یہ کہنے کو بھی دل چاہ رہا ہے کہ غریب لوگوں کو محبت راس نہیں آتی۔ پھر میرا اور آپ کا ملن ناممکن ہے اور اگر یہ ممکن ہو بھی جائے تو یہ معاشرہ مجھے جینے نہ دے گا...... ایک کلرک اور ایک آفیسر کی محبت دنیا والوں کے دلوں میں آگ لگا دے گی اس لئے جس کام کا انجام پہلے سے معلوم ہو، وہ کام کرنا ہی نہیں چاہئے۔ میں ایک دیہاتی اور سادہ سا شخص ہوں مگر شہری زندگی میں رہ کر جان گیا ہوں کہ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے، سب اپنی غرض اور مفاد کی خاطر زندہ ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ محبت کرنے والے جلتے اور سلگتے رہتے ہیں اس لئے مجھے میرے حیثیت پر ہی رہنے دیں میڈم! اگر ہوسکے تو آپ میری اس شہر سے تبدیلی کرا دیں۔ میں اب آپ کا سامنا نہیں کرسکتا۔''

''ساجد! کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ شاید تم مجھے ابھی تک سمجھ نہیں سکے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اور اب میں جو کچھ کرنے جارہی ہوں، وہ بھی تم پر کوئی احسان نہ ہوگا۔ میں زمانے سے مختلف ہوں اور منفرد ہی رہنا چاہتی ہوں، میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا تعلق ایک بڑے بہت خاندان سے ہے۔ ہماری جائیداد ہے، ابا جان میرے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں چونکہ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں اس لئے ابا جان نے مجھے بہت ہی لاڈ اور پیار دے رکھا تھا، وہ چاہتے تھے کہ میں آفیسر بنوں سو میں نے ان کا خواب پورا کردیا ہے۔ میں آفیسر بن گئی ہوں اور ابھی مزید ترقی کے امکانات بھی موجود ہیں۔ میری ماں زندہ ہے اور میں اسی کی خاطر زندہ ہوں۔ ابا جان کی وفات کے بعد میرے لئے کئی رشتے آتے تھے اور ان میں میرے سوتیلے چچا کے بیٹے سرفہرست تھے لیکن وہ سب میرے نہیں بلکہ اس دولت اور جائیداد کے طلب گار تھے جو مجھ سے شادی کے بعد ان کی ہوجاتی۔ میں بخوبی جانتی اور پہچانتی ہوں کہ یہ اجلے چہرے اندر سے کتنے بھیانک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں برادری میں کسی شادی نہیں کروں گی...... میرے چچازاد نے اس پر مجھے دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر میں سیدھی طرح نہ مانی تو وہ مجھے زبردستی اٹھالے گا مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی کیونکہ میں اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتی ہوں۔ ملازمت کے دوران بھی کئی لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر میں جانتی ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی میری روح نہیں، میرے ظاہری حسن اور میری دولت سے پیار ہے، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اکیلی عورت اس جنگل میں جہاں ہر طرف بھیڑیئے ہوں، جی نہیں سکتی۔ اسے مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے میں کسی ایسے انسان کی تلاش میں بھٹک رہی تھی جو میرے معیار پر پورا اترتا ہو، اسی لئے میں نے جب تمہیں دیکھا تو یوں لگا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس کو میں تلاش کررہی تھی۔ تمہاری سادگی، تمہاری معصومیت، تمہاری بھرپور شخصیت اور تمہاری سچائی مجھے متاثر کرگئی اسی لئے میں نے تمہیں لاکھوں میں سے چن لیا اور اس عہد اور یقین کے ساتھ کہ میں تمہیں اپنی زندگی کا ہم سفر بناؤں گی...... تم جس محبت کے بھیانک انجام کی بات کررہے ہو، وہ محبت نہیں، خودغرضی اور ہوس پرستی ہے جب کہ میری محبت تو اس طوفان کی مانند ہے

جسے روکا نہیں جاسکتا...... رہا مسئلہ کلرک اور آفیسر کا، تو میں تمہیں اس مقام تک لانے کی بھی کوشش کروں گی کہ تم مجھ سے بھی اعلیٰ افسر بن جاؤ اور اگر ایسا نہ ہو سکا، تم مجھ سے آگے نہ بڑھ سکے تو میں صرف تمہاری خاطر ملازمت کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دوں گی، یہ میرا وعدہ ہے جو وقت آنے پر سچ ثابت ہو گا...... اس لئے ساجد! ہمت سے کام لو، میں عورت ہو کر پہل کر رہی ہوں اور تم مرد ہو کر گھبرا رہے ہو۔ فیصلہ کرو تا کہ میں اگلا قدم اٹھا سکوں۔ میں یہ سب کچھ جلدی میں اور رازداری سے ہی کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میرے رشتے داروں کو پتہ چلا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور بات بڑھ جائے گی......"

ہما نے جو کچھ کہا، مجھے وہ حقیقت لگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اس کی بات مان لوں۔ میں نے مزید کچھ نہ سوچا اور اقرار کر لیا کہ میں مرتے دم تک ساتھ دوں گا...... ہما نے اپنی ماں کو پہلے ہی منا رکھا تھا، میں نے اپنی ماں سے بات کی تو انہیں یقین نہ آیا کہ ان کا بیٹا اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ مان گئیں اور میں ان کو ساتھ لے کر شہر آ گیا۔ ہما نے پہلے مجھے ایک ماہ کی چھٹی دی اور پھر خود بھی چھٹی لے لی یوں ہماری شادی ہو گئی اور ہما کو پا کر مجھے یوں لگے کہ جیسے مجھے زمانے بھر کی دولت مل گئی ہو۔ میں محبت کی اس کرشمہ سازی پر حیران تھا اور سوچتا تھا کہ میں احساس کمتری کے حصار سے نکل آیا...... چھٹی کے دوران ہی ہما نے اپنی جائیداد میرے نام کر دی، میرے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھول کر اس نے تمام رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی۔ میں نے ایسا کرنے سے منع کیا تو وہ نہ مانی ، کہنے لگی کہ سب لوگ جائیداد اور دولت کے طلب گار ہیں۔ اس لئے میں اسے تمہارے نام کر رہی ہوں کہ میری شناخت اور پہچان اب تم ہی ہو۔ اب ہم الگ الگ نہیں ہیں، جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہے اور جو کچھ تمہارا ہے وہ میرا ہے۔

ہماری چھٹی ختم ہونے سے قبل ہی دفتر ہی یہ بات پھیل گئی تھی کہ ہما اور ساجد نے شادی کر لی ہے۔ جس روز ہم دفتر گئے تو ہر طرف مبارک باد کا شور اٹھا۔ ہما کو ڈائریکٹر نے طلب کیا۔ وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ دفتر میں تو ہم نے کوئی بات نہ کی مگر گھر جا کر ہما کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ ہما نے مجھے پوری بات تو نہ بتائی البتہ مجھے کہنے لگی کہ تم کل سے دفتر نہیں جاؤ گے بلکہ تمہارا استعفیٰ جائے گا۔ میں جلد ہی تمہیں کوئی اچھا سا بزنس شروع کروا دوں گی۔ میں نے ہما کی بات تسلیم کر لی کیونکہ خود میں بھی یہ چاہتا تھا کہ اب اس دفتر میں کام نہ کروں۔ اگلے روز میں نے استعفیٰ بھیج دیا جب کہ ہما نے دفتر جاری رکھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ہما نے ایک ٹریول ایجنسی کا لائسنس مجھے لے دیا اور مال روڈ پر ایک دفتر بھی لے لیا۔ ابھی کام شروع نہ کیا تھا کہ ہما کی تبدیلی پشاور کر دی گئی۔ یہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی تھی کہ اس نے ایک کلرک کے ساتھ شادی کیوں کی ہے۔ اس کارروائی میں وہ افسر پیش پیش تھے جو ہما کے چاہنے والوں میں سے تھے مگر ہما نے پرواہ نہ کی اس نے کرایہ پر ایک کوٹھی لے کر سامان شفٹ کیا اور مجھے پنڈی چھوڑ کر پشاور چلی گئی۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد جب اس کی ٹرانسفر کراچی کی گئی تو تنگ آ کر ہما نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں خود بھی ملازمت چھوڑ دینا چاہتی تھی کیونکہ یہ صرف اس صورت ہی ممکن تھا کہ جب تم مجھ سے بڑے آفیسر بن جاتے اور اب یہ ناممکن ہے اس لئے میں گھر ہی رہوں گی۔ ہما کے اس فیصلے میں مطمئن ہو گیا۔ ہم نے اس کی برانچ اسلام آباد میں بھی کھول لی۔ مالی طور پر ہم پہلے سے بھی خوشحال ہو گئے، ہمیں کوئی دکھ اور پریشانی نہ تھی، ہماری چھوٹی سی دنیا اور میری اور ہما کی امی بھی ہم دونوں کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ جب ہما کے چچازاد کو اس شادی کی خبر ہوئی تھی تو اس نے بہت واویلا مچایا تھا...... وہ ہمارے گھر بھی آیا اور ہمیں طرح طرح کی دھمکیاں دے کر چلا گیا ہما نے اس کی کسی دھمکی کی پرواہ نہ کی البتہ میں اس طرف سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔

یوں ہی ایک سال بیت گیا۔ ان دنوں میری اور ہما کی امی بہت خوش تھیں کیونکہ وہ دادی اور نانی بننے والی تھیں۔ ہما کو ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا۔ لیبر روم میں کافی دیر لگ گئی تو لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور کہنے لگی۔

"ساجد صاحب! آپ کی بیگم کا کیس کافی پیچیدہ

ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے لیکن پھر بھی کوئی اونچ نیچ ہوسکتی ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحبہ! مجھے بچہ نہیں چاہئے، وہ اوپر والا اور دے دے گا مگر ہما کو کچھ نہ ہونے پائے، اس کو کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گا"۔

میں ڈاکٹر کو لے کر ہما کے پاس چلا گیا۔ اسے بھی تسلی دی۔ ڈاکٹر بھی کہنے لگی کہ آپ دونوں فکر نہ کریں۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں۔ ڈاکٹر عظیمہ کو بھی میں بلا لیتی ہوں۔ ہم مل کر کیس کر لیں گے۔ ڈاکٹر عظیمہ آگئیں تو میں باہر نکل آیا اور سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر بیت گئی جب ڈاکٹر عظیمہ باہر نکلیں۔ ان کو دیکھ کر میں ان کی طرف لپکا تو ان کا چہرہ مایوس سا لگا۔ انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگیں۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم دونوں کو نہیں بچا سکے...... شاید خدا کو یہی منظور تھا ورنہ ہم نے تو اپنی سی ہر ممکن کوشش کی مگر خدا کی رضا کے آگے ہر انسان بے بس ہے۔"

ڈاکٹر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور میں مایوسیوں اور دکھوں کی سلوں تلے سسکتا رہ گیا...... ہما مجھ سے یوں روٹھ جائے گی، مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میں نے دیواروں سے سر ٹکرا کر رونا شروع کر دیا مگر رونے سے جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے جو ہر بشر کو آنی ہے مگر جو درد اور دکھ مجھے ہما دے گئی اس کا کوئی امداد نہ تھا۔

تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ میری امی بھی اس دار فانی سے چل بسیں۔ میں ایک بار پھر ٹوٹ پھوٹ گیا مگر حقیقت کے ساتھ چلنا ضروری تھا۔ میں اب تک ہما کو نہ بھلا سکا تھا، وہ میری یادوں میں زندہ ہی تھی۔ اس کا سراپا ہر لحہ میرے خوابوں اور خیالوں میں بسا رہتا، اسے بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ تو میری محسن تھی، میرے لئے رحمت کا فرشتہ تھی۔ میں مالی لحاظ سے بہت مضبوط ہو گیا تھا مگر ذہنی سکون ناپید ہو گیا۔ امی کی وفات پر نورین سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جب اس کی ماں اور باپ کو علم ہوا کہ میں تو اب لاکھوں کا مالک ہوں تو انہوں نے نورین کے کہنے پر مجھے نورین سے شادی کی پیش کش کی، میں نے انکار کر دیا لیکن میں حیران تھا کہ نورین نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟ میں نے ٹوہ لگائی تو علم ہوا کہ نورین جس بھنورے سے محبت کرتی تھی وہ اس کا رس چوس کر اڑ گیا ہے اور نورین آج تک اس کی بے وفائی کا ماتم کر رہی ہے۔ اس دوران اسے اس محبوب کی بخشی ہوئی ذلت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا پڑا۔ میرے انکار کے بعد نورین ایک روز میرے دفتر چلی آئی اور میں اسے اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یہی یقین تھا کہ میں اس کے ماضی سے بے خبر ہوں گا اور وہ مجھے قائل کرنے آئی تھی......
اسے دیکھ کر مجھے ماضی وہ لحہ یاد آگیا جب نورین نے میرے گھر آکر مجھے ذلیل کیا تھا، محض اس لئے کہ میں غریب تھا۔ وہ لمحے یاد کر کے میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے بھی اسے معاف نہ کیا اور اسے بے غیرت، بے حیا جیسے القابات سے نواز کر دفتر سے نکل جانے کو کہا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ میں اس کے ماضی سے آگاہ ہو چکا ہوں اس لئے تم جیسی گندی عورت کے سایہ سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے دفتر سے نکال دیا۔ ایسا کر کے مجھے جیسے قرار سا آگیا، ایک بوجھ سا دل و دماغ سے اتر گیا۔

ایک روز ایک نوجوان لڑکی میرے دفتر آئی۔ وہ سروس کی تلاش میں تھی۔ ضرورت مند لگ رہی تھی مگر میں بھی مجبور تھا، میرے دفتر میں جگہ نہ تھی۔ اس نے میرا انکار سنا تو رونا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ محرومی اور بے بسی کے سائے تھے جو بتا رہے تھے کہ وہ بہت ہی مجبور اور مظلوم ہے، نہ جانے کیوں جی چاہا کہ میں اس کی مدد کروں، اس کو سہارا دوں، میں اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اس کو ملازمت دے دی۔ اس نے ملازمت ملنے کی خوشخبری سنی تو دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔ میں نے اسے یکم سے ڈیوٹی پر آنے کا کہا اور پھر وہ چلی گئی۔ یکم کو اس نے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ اس نے اپنا نام روزینہ بتایا تھا۔ میں نے اسے منیجر کے پاس بھیج دیا کہ وہ تمہیں کام سمجھا اور بتا دے گا۔ ایک ماہ بعد میں نے منیجر سے اس کی کارکردگی کی

رپورٹ طلب کی تو بتایا گیا کہ روزینہ بہت ہی محنتی لڑکی ہے، وہ ہمارے دفتر کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ میں مطمئن ہوگیا۔ کئی بار اس سے آمنا سامنا ہوا تو میں نے اس کو نہایت ہی سستے اور معمولی لباس میں ملبوس پایا۔ اس کا چہرہ بھی میک اپ سے بے نیاز ہوتا تھا جب کہ میرے دفتر میں موجود تین اور لڑکیاں اشتہار بن کر آتی تھیں یا جیسے ان کو کسی نمائش میں بھیجا جا رہا ہے۔ مجھے روزینہ کا یہ روپ اچھا لگا مگر اس پر ترس بھی آیا، یہ معلوم ہوگیا کہ نہایت ہی مجبور کے عالم میں ملازمت کر رہی ہے۔ ایک دن میرے اصرار پر اس نے مجھے اپنے ماضی کے متعلق بتایا کہ میں ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے جو مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میں اپنے ہی شہر کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ ہم کالج میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ میں ایف اے کر کے گھر بیٹھ گئی جب کہ پرویز ملازمت کے سلسلہ میں سلہٹ چلا گیا۔ اس دوران ہماری خط و کتابت جاری رہی۔ میں اسے بے حد چاہتی تھی اور وہ بھی میرا دیوانہ تھا۔ اس نے ایک بار مجھے خط لکھا کہ میں اس سے ملنے کے لئے سلہٹ آؤں کہ ہمیں ملتے ہوئے عرصہ بیت گیا ہے۔ میں انکار نہ کر سکی اور گھر والوں سے بہانہ بنا کر میں اکیلی ہی پرویز کو ملنے روانہ ہوگئی۔ میں محبت اور چاہت میں اندھی ہوگئی تھی، کسی بھی بات کا خیال نہ کیا شاید اس لیے کہ محبوب میں یہی تو خوبی ہوتی ہے کہ وہ بے خوف کر دیتا ہے اور جب کوئی خیال نہیں رہتا تو پھر صرف محبت رہ جاتی ہے اور جب محبت نہیں رہتی تو وہ کسک بن جاتی ہے۔ اس دنیا میں پریم روگ کے کتنے جال ہیں، کتنے ڈھونگ ہیں کوئی نہیں جانتا، میں بھی محبوب کے خیال میں کھو کر سب کچھ گنوا بیٹھی...... پہلی رات ہی پرویز نے مجھے دودھ میں کچھ ملا کر پلا دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب کئی گھنٹوں بعد ہوش میں آیا تو میں اپنے ملک میں نہ تھی۔ وہ کوئی غنڈے اور بدمعاش قسم کے لوگ تھے جنہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں خاموش رہوں، اگر شور مچایا تو وہ میری زندگی کا خاتمہ کر دیں گے۔ میں بہت روئی تڑپی مگر میری ایک نہ سنی گئی، میں جان گئی کہ پرویز نے مجھے فروخت کر ڈالا ہے مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا۔ پھر ان لوگوں نے کسی طرح مجھے کراچی پہنچا دیا جہاں ایک بار پھر مجھے فروخت کر دیا گیا۔ یوں میں مختلف ہاتھوں میں کھلونا بنی رہی۔ جس کسی کا مجھ سے کھیل کھیل کر جی بھر جاتا تو وہ مجھے پھینک دیتا۔ اسی دوران ایک دفعہ مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد میں جہاں بھی ملازمت کی تلاش میں گئی، لوگوں کی بھوکی نظروں کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ کراچی سے حیدرآباد، پھر لاہور اور اب تقدیر مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں نے در در کی ٹھوکریں کھائی ہیں، اتنے زخم اس سینے پر کھائے ہیں کہ اب ان سے خون رسنے لگا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے سوائے خدا کے...... میرے باپ اور ماں یقیناً مر گئے ہوں گے، وہ بیٹی کی جدائی برداشت نہ کر پائے ہوں گے۔ اگر وہ زندہ بھی ہوں تو بھی میں کون سا چہرہ لے کر ان کے پاس جاؤں گی؟ یہ سب کہہ کر روزینہ پھر رونے لگی۔ اس کی زخم زخم داستان نے مجھے بھی رلا ڈالا۔ اس نے ظلم و ستم کی ایسی ایسی داستانیں سنائیں کہ میں کانپ اٹھا۔ میں نے روزینہ کو دلاسہ دیا کہ اب تم محفوظ ہاتھوں میں آگئی ہو، اب تمہیں یہاں کوئی پرویز نہ ملے گا، کوئی تمہیں پریشان نہ کرے گا۔

کئی سال بیت گئے ہیں۔ وہی روزینہ اب میری بیوی ہے میں نے اسے صرف تین ماہ اپنے دفتر کام کرنے دیا تھا اور اس کے بعد اس سے شادی کر لی تھی۔ میں نے اس کا ماضی بھلا دیا ہے۔ وہ بہت خوش اور مسرور ہے، اب اسے کوئی غم اور پچھتاوا نہیں ہے۔ جو مشن ہما نے مجھ سے شادی کر کے شروع کیا تھا، میں نے اسے آگے بڑھایا ہے، اس لئے کہ اس کی روح کے سامنے سرخرو ہو سکوں، میں ہما کا جلایا ہوا چراغ بجھنے نہ دوں گا...... ہمارا ایک بچہ ہے اور ہم دونوں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

بھٹکتی آتما

کوثر اسلام

ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لوگوں کے نزدیک وہ ایک قلب دو جان تھے۔ پھر بھی زمانے نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کردیا لیکن وہ مر کر زمانے سے انتقام لینے لگے۔
ایک مسلم نوجوان اور اس کی ہندو محبوبہ کی داستان محبت، وقت نے انہیں سراپا انتقام بنا دیا تھا۔

گوہر شام سے پہلے پہلے گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ راستہ اس کی توقع کے برعکس شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا گیا۔ دوپہر سے آسمان پر کالے بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ جنہوں نے عصر تک پورا آسمان ڈھانپ لیا۔ شام ہوتے ہوتے بارش یوں برسنے لگی جیسے معشوق کی جداء پر عاشق کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگی۔

بارش کی شدت میں رفتہ رفتہ تیزی آنے لگی۔ تیز ہواوں کے جھکڑ چلنے لگے درختوں کی شاخیں جب آپس میں ٹکراتیں تو یوں لگتا جیسے ہزاروں بدروحیں چھنگاڑ رہی ہوں۔

کچے راستے پر اس کے لیے گاڑی چلانا دشوار ہو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر اسے روشنی نظر آئی قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس نے گاڑی گھر کے قریب روک دی۔ وہ گاڑی سے اترا اور زور زور سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شاید گھر والے سر شام ہی سو گئے یا طوفانی بارش کے سبب وہ آواز سن نہ پائے اس خیال سے اس نے اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بری طرح بھیگ رہا تھا چند لمحوں بعد اسے یوں لگا جیسے کوء آ رہا ہے اور پھر چٹخنی کھلنے کی آواز آء۔ اس وقت بادل بہت زور سے گرجے اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔ دروازہ کھلا۔ اور ایک دراز قامت شخص باہر آیا اس نے بارش سے بچنے کے لیے برساتی پہن رکھی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا

"مسافر ہو۔؟"

"جی ہاں۔۔۔۔ میں قریبی گاؤں جا رہا تھا اس طوفانی بارش میں گاڑی چلانا میرے لیے ممکن نہیں اگر آپ کچھ دیر کے لیے اپنے ہاں ٹھرنے کا موقع دیں تو نوازش ہوگی۔ بارش رکتے ہی میں یہاں سے چلا جاوں گا۔" گوہر نے ایک ہی سانس میں کہا

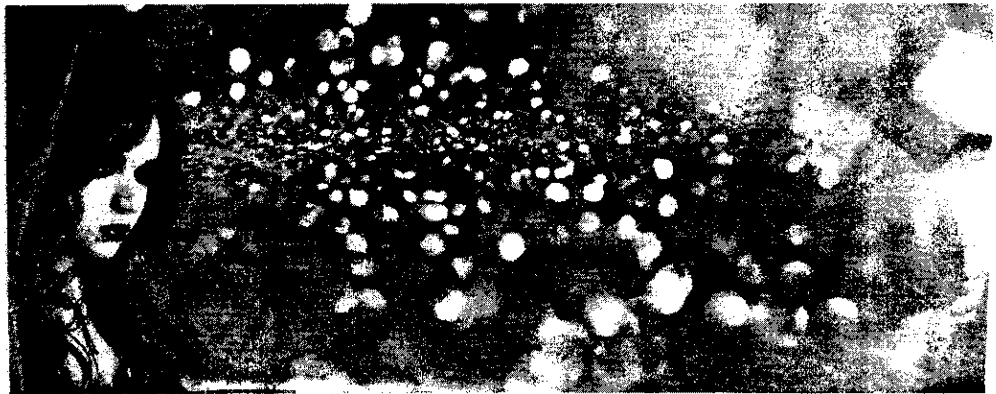
"اندر آجاو تم بہت بھیگ گئے ہو اسے اپنا ہی گھر سمجھو" اس نے شائستگی سے کہا

گوہر اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ سامنے دو کمرے ایک برآمدہ جبکہ صحن میں برگد کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اسے اس روشنی کا منبع کہیں نظر نہ آیا جو اس نے دور سے دیکھی تھی۔ وہ برآمدے میں پہنچ گئے اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا

"یہ رہا تمہارا کمرہ۔ تمہارے کپڑے بھیگ گئے ہیں میں تمہارے لیے کپڑوں اور کھانے کا بندوبست کرتا ہوں کمرے میں آتش دان میں آگ جل رہی ہے تب تک تم خود کو گرم کرلو"

"بہت بہت شکریہ" گوہر نے ممنونیت سے کہا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

آتش دان میں آگ جل رہی تھی گوہر اس کے قریب بیٹھ



گیا چند لمحوں بعد میزبان کپڑے اور کھانا لے آیا کھانا اس نے میز پر رکھا جب کہ کپڑے ملحقہ باتھ روم میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''کپڑے تبدیل کرلیں اور کھانا کھالیں میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں میں ساتھ والے کمرے میں اس کے پاس ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلانا۔''

یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگا۔ گوہر نے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کیا۔ کھانے کی خوشبو سے اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ اٹھا تا کہ کپڑے تبدیل کر کے بھوک کی آگ کو بجھا سکے۔ باتھ روم کی لائیٹ خراب تھی اس نے دروازہ کھلا چھوڑا جس سے تھوڑی سی روشنی ہوء کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ ہاتھ دھونے لگا۔ اسے پانی بہت گاڑھا محسوس ہوا۔ جو اس کے ہاتھوں سے چپک رہا تھا۔ وہ باتھ روم سے باہر آیا تو اس کی چیخ نکل گ ءاس کے ہاتھوں پر گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظر کھانے کی میز پر پڑی۔ ایک پلیٹ میں چاول تھا جس کے اوپر بھنا ہوا انسانی ہاتھ کا پنجہ رکھا تھا دوسرے پلیٹ میں شوربہ تھا جس میں دو انسانی انگلیاں تیر رہی تھیں۔ اسے متلی آنے لگی شدید خوف کی وجہ سے اس کا گلا خشک ہو گیا پانی کے لیے اس نے فریج کا دروازہ کھولا تو اس میں انسانی سر تھا دروازہ کھلتے ہی سر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے فوراً دروازہ بند کیا اور باہر کی طرف دوڑا لیکن کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر میزبان کو بلا رہا تھا اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔ اچانک اسے اپنے پیچھے حرکت محسوس ہوء اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک بلی میز پر بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی اس کے ہاتھ انسانی تھے باقی سارا جسم بلی کا تھا۔ ہاتھوں میں انسانی پنجہ پکڑ کر بھنبھوڑ رہی تھی۔ خوف کے مارے اس کا برا حال تھا وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

''کیوں صاحب۔۔۔ڈر گئے کیا'' دائیں جانب سے آواز آء۔ اس نے اس طرف دیکھا تو اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گ ء۔ باتھ روم سے ایک آدمی نکلا۔ آدمی کی بجائے وہ ایک دھڑ تھا جس نے اپنا سر دائیں ہاتھ میں پکڑا تھا اور وہ سر بول رہا تھا اس دہشت ناک منظر کی وہ تاب نہ لا سکا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔

صبح لوگوں نے کھنڈر کے پاس گاڑی کھڑی دیکھی تو انہیں افسوس ہوا کہ ایک اور آدمی آسیبی کھنڈر کا شکار ہوا

......☆☆......

کوشلیا۔! بس آج رات ہی کی تو بات ہے پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔ بشیر نے دریا میں بہتے ہوئے پتے کو دیکھتے ہوئے کہا

''مجھے ڈر لگ رہا ہے بشیر۔'' کوشلیا نے ٹانگوں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ کھولا اور زمین پر ٹیک لگا کر کہا

''کچھ نہیں ہوگا میری جان۔۔۔میں ہوں نا'' بشیر نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا

دریا کے کنارے جس درخت کے نیچے وہ بیٹھے تھے اس پر ایک چڑیا چہچہانے لگی

''مگر ہمارے دھرم کا کیا ہوگا'' کوشلیا نے پوچھا

''میں نے تمہیں ک ءبار سمجھایا ہے کہ ہمارا دھرم محبت ہے

اس دھرم میں ہندو مسلمان سب ایک ہیں" بشیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

دور کہیں سے ایک چڑا آیا اور درخت پر چڑیا کے ساتھ بیٹھ کر چہچہانے لگا

"اچھا ٹھیک ہے میں جاتی ہوں۔ بابا کھانا کھا رہیں ہیں بڑی مشکل سے آنکھ بچا کر آء ہوں" کوشلیا نے اٹھتے ہوئے کہا

"چلو ٹھیک ہے رات کو تیار رہنا" بشیر نے بھی اٹھ کر کہا اور کوشلیا کو رخصت کیا۔

درخت پر سے چڑا اور چڑیا بھی اکٹھے اڑ گئے۔

شبیر دیر تک کوشلیا کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

......☆☆......

تقسیم ہند سے پہلے خیبر پختون خواہ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ہندو اور مسلمان مل کر رہ رہے تھے۔ ہری لال ایک غریب زمیندار تھا اس کا کوء بیٹا نہیں تھا تین بیٹیوں میں کوشلیا سب سے بڑی تھا اس نے باپ کو کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ وہ اس کے ساتھ کھیت میں کام کرتی ہری لال قبول صورت آدمی تھا لیکن اس کی بیوی شکنتلا بہت خوبصورت تھی۔ کوشلیا ماں پر گء تھی۔ سڈول جسم سفید رنگت کالی بڑی آنکھیں جس میں وہ ہر وقت سرمہ لگائے رکھتی کمانوں جیسے ابرو لمبی پلکیں اندھیری رات جیسے کالے بالوں میں وہ کوء حور ہی معلوم ہوتی۔ جس راستے پر وہ اپنے کھیت جاتی اس پر نذیر چاچا کا کھیت تھا نذیر کا بیٹا بشیر اس کے ساتھ ہی کھیت میں کام کرتا۔ وہ ہر روز کوشلیا کو کھیت سے گزرتے ہوئے دیکھتا کوشلیا جب بھی کھیت سے گزرتی نذیر چاچا کا حال ضرور پوچھتی۔

ایک شام جب وہ کھیت سے واپس آ رہی تھی تو اس کے سر پر لکڑیوں کا ایک بڑا گٹھڑ اتھا بوجھ سے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ بشیر نے لپک کر اس سے گٹھڑ الیا اور اس کے گھر پہنچا آیا اس دن سے وہ بشیر کو ممنونیت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ آپس میں بات چیت کرنے لگے نذیر اس کے چھوٹے موٹے کام کرتا کوشلیا کو بشیر جیسے گبرو جوان بہت پسند تھے۔ جانے کب اور کیسے دونوں نے محبت کی دہلیز پر قدم رکھا محبت کا نو دمیدہ پودا دونوں کی نظر التفات سے بہت جلد تناور درخت بن گیا

......☆☆......

بشیر نے جب اپنی ماں کو کوشلیا کے رشتے کے لیے کہا تو پہلے وہ بہت گڑبڑائی۔ مگر بشیر نے جب قسم کھا کر کہا کہ یا تو وہ کوشلیا سے شادی کرے گا یا عمر بھر کنوارہ رہے گا تو اس کی ماں کا دل نرم ہو گیا بشیر نے اسے سمجھایا کہ شادی کے بعد میں اسے مسلمان کر لوں گا۔ بالآخر ماں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس نے اس کے باپ کو بھی راضی کر لیا۔

چاچا نذیر نے جب ہری لال سے کوشلیا کا رشتہ مانگا تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ ایک ہندو کا مسلمان کے ساتھ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر بشیر اپنا دھرم چھوڑ دے تو اور بات ہے۔

چاچا نذیر کو یہ منظور نہ تھا اس لیے کہ ایک مسلمان کے پاس اس کا سب سے بڑا سرمایہ تو اس کا دھرم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ناکام گھر لوٹا۔

ٹھاکر بلراج کے بیٹے شمبو ناتھ نے جب سے کوشلیا کو دیکھا تھا اپنا دل اسے دے بیٹھا تھا۔ وہ ٹھاکر بلراج کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے ٹھاکر اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔ جب اس نے کوشلیا سے شادی کا کہا تو ٹھاکر نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا۔

ہری لال کی نظر میں کوشلیا کے لیے اس سے اچھا رشتہ ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ اس نے فوراً ہاں کر دی۔ دونوں طرف سے فوراً شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں شمبو ناتھ جلد از جلد شادی کا خواہاں تھا۔

جوں جوں شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی کوشلیا کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی آخر دونوں نے رات کے اندھیرے میں گاؤں سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔

کوشلیا کے ماں باپ جلدی سونے کے عادی تھے جب انہیں سوئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو کوشلیا اٹھی اپنے کپڑے جو اس نے پہلے سے تیار رکھے تھے اٹھائے۔ اور دبے پاؤں گھر سے باہر نکلی۔

موسم کے تیور بہت خراب تھے شاید اسے ان کا بھاگنا پسند نہ تھا ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی بشیر مقررہ جگہ پر کوشلیا کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پہنچ گئی تو دونوں جلد از جلد گاؤں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی تو ہری لال کی آنکھ کھل گئی۔ صحن میں بندھی گائے کو وہ برآمدے میں لانے کے لیے اٹھا تو کوشلیا کا بستر خالی تھا اس نے اسے آوازیں دیں پورے گھر میں ڈھونڈا لیکن کوشلیا کا کہیں پتا نہ تھا دفعتا اس کے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہیں بشیر نے کوشلیا کو اغوا تو نہیں کیا وہ فورا بشیر کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ بشیر بھی غائب ہے ہری لال کی چیخ و پکار سے اڑوس پڑوس کے لوگ بھی جاگ گئے۔ ہوتے ہوتے بات شمبو ناتھ تک پہنچ گئی۔ اس نے چند نوکر اپنے ساتھ لیے اور کوشلیا کی تلاش میں چل پڑا

......☆☆......

سخت اندھیرے اور طوفانی بارش میں ان کے لیے سفر دشوار سے دشوار تر ہو گیا وہ گاؤں سے کافی باہر نکل آئے تو انہیں جوگی رام پال کا کھنڈر نظر آیا

جوگی رام پال گاؤں میں رہتا تھا مگر رات کو وہ عملیات کرتا جس کی وجہ سے اس کے گھر سے عجیب و غریب آوازیں آتیں گاؤں والوں کی نیندیں خراب ہونے لگیں تو گاؤں والوں نے اس سے درخواست کی کہ یا تو عملیات چھوڑ دے یا گاؤں۔۔۔ اس نے گاؤں چھوڑنے کو ترجیح دی اور گاؤں سے باہر اپنے لیے چھوٹا سا گھر بنایا جو اس کے مرنے کے بعد ویران پڑا رہا۔

''چلو یہاں کچھ دیر ٹھہرتے ہیں جیسے ہی بارش کا زور کم ہوگا یہاں سے چلے جائیں گے۔'' بشیر نے کہا

''مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر گاؤں والے ہمارے پیچھے آ گئے تو'' کوشلیا نے اپنی پریشانی ظاہر کی

''اول تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور اگر کسی کو معلوم بھی ہوا تو اس طوفانی بارش میں کون آئے گا۔'' بشیر نے اسے اطمینان دلایا

......☆☆......

شمبو ناتھ غیظ و غضب سے پاگل ہو رہا تھا یہ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھیں کہ بشیر اس کی محبوبہ بھگا کر لے گیا۔

''گاڑی تیز چلاؤ وہ گاؤں سے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے'' اس نے ڈرائیور کو حکم دیا اور ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی وہ جوگی رام پال کے کھنڈر سے گزرے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں وہ یہاں نہ چھپے ہوں اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا اور ساتھیوں سمیت کھنڈر میں داخل ہوا بارش اور ہوا کے شور کی وجہ سے بشیر شمبو ناتھ کی آمد سے بے خبر رہا۔ دروازہ دھماکے کے ساتھ کھلا اور شمبو ناتھ اندر داخل ہوا بشیر اور کوشلیا حیران ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''کمینے تو نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا کر شمبو ناتھ کی عزت پر۔۔۔'' شمبو ناتھ نے بشیر پر بندوق تان کر کہا ''میں تمہیں اس کا مزہ چکھاتا ہوں جاؤ نرک میں جلو۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے گولی چلا دی کوشلیا بشیر کے سامنے آ گئی اور گولی عین اس کے دل پر لگ گئی۔ بشیر اور شمبو ناتھ بیک وقت چیخے ''کوشلیا!''

بشیر نے اسے گود میں اٹھا کر کہا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا کوشی۔''

شمبو ناتھ دوڑتا ہوا آیا اور اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''آنکھیں کھولو کوشلیا۔۔۔ میری کوشلیا کھولو آنکھیں۔''

کوشلیا نے آنکھیں کھولیں اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اس نے رک رک کر کہا۔

''میں بشیر کی تھی۔۔۔ تم نے میری خوشی چھین لی۔ تم بھی جیتے جی خوش نہ رہ سکو گے'' یہ کہہ کر اس کی گردن لڑھک گئی۔

کوشلیا۔۔۔! شمبو ناتھ نے چیخ کر کہا اور بشیر پر اندھا دھند گولیاں برسا دیں۔ بشیر جب گولیاں کھا کر گرا تو شمبو نے صرف اس پر بس نہیں کیا بلکہ اس کا سر بھی لاش سے جدا کر دیا۔

......☆☆......

دو محبت کرنے والے معصوموں کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ جب شمبو ناتھ گاؤں واپس آیا تو اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ ہم گاؤں سے باہر بہت دور تک گئے لیکن ان کا کچھ

پتا نہ چلا۔ گاؤں والوں نے شمبو ناتھ پر یقین کرلیا۔

ہری لال پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کی عزت بھی چلی گئی وہ سنجیدگی سے گاؤں چھوڑنے کا سوچنے لگا۔

اگلی رات کو جوگی رام پال کے کھنڈر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگی۔ اکثر لوگوں نے وہاں ایک سر کٹے آدمی کو دیکھا جس کے ساتھ ایک عورت تھی عورت کے دل کے مقام پر ایک بڑا سوراخ تھا جس سے آر پار سب کچھ نظر آتا تھا جس نے بھی یہ منظر دیکھا بے ہوش ہوگیا۔ گاؤں والوں نے کھنڈر کو آسیبی قرار دے کر اس کے قریب سے بھی گزرنا چھوڑ دیا۔

شمبو ناتھ ایک رات سو رہا تھا کہ چیخوں کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی وہ کمرے سے باہر آیا تو اس کے اوسان خطا ہوگئے اس کے باپ کے کمرے میں آگ لگی تھی کمرے کا دروازہ بند تھا اور اس کا باپ مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ آگ کسی بپھرے ہوئے بھوکے اژدھے کی طرح ہر چیز نگل رہی تھی شمبو ناتھ نے دروازہ توڑنے کی بھرپور کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ملی ملازمین بھی دوڑے دوڑے آئے سب نے مل کر کوشش مگر دروازہ نہ کھل سکا۔ ٹھاکر بلراج کی چیخیں پوری حویلی میں گونج رہی تھیں۔ جب اس کی آخری چیخ نکل گئی تو دروازہ کھلا ٹھاکر بلراج کوئلہ بن چکا تھا۔

رات کی دیوی جب اپنے پر سمیٹ کر واپسی کا ارادہ کر رہی تھی تو شمبو ناتھ کو ملازم نے ایک اور بری خبر دی کہ اس کی تمام کھڑی فصل آگ کی نذر ہوگئی صبح ہوتے ہوتے وہ غم سے نڈھال ہوچکا تھا۔

پورا دن ہنگامہ خیز رہا رات کو تھکا ہارا جب بستر پر لیٹا تو اس کے کانوں میں کوشلیا کے الفاظ گونجنے لگے "تم جیتے جی خوش نہ رہ سکو گے" یہ کوشلیا کا شراپ تھا یا اس کی آتما انتقام لے رہی ہے۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے اس کے بدن میں کسی نے ہزاروں سوئیاں چبھو دی ہیں۔ چبھن بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ چیخنے اور تڑپنے لگا ایک گھنٹے تک اس کی یہ حالت رہی۔

اب ہر رات اس وقت جس وقت اس نے کوشلیا اور بشیر کو مارا تھا اس کے بدن میں سوئیاں چبھتیں۔ اور وہ چیختا تڑپتا۔

اس کے نوکر جو قتل کے وقت اس کے ساتھ تھے ایک ایک کر کے گھر میں مردہ پائے گئے۔ ان کے جسم کالے ہوگئے تھے اور ہاتھ لگانے پر گوشت بدن سے جدا ہوجاتا۔

گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہر شخص دہشت زدہ تھا شمبو ناتھ کا چچا ٹھاکر شمراج اس کی حویلی میں آیا اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے شمبو ناتھ کو بڑے بڑے حکیموں اور ویدوں کو دکھایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ حکیموں نے صاف کہہ دیا کہ یہ کسی حکیم یا وید کے بس کی بات نہیں اسے کسی جوگی کو دکھایئے۔

اگلے دن ٹھاکر شمراج ایک جوگی کو حویلی میں لے آیا۔ اس نے پوری حویلی کا معائنہ کیا۔ وہ شمبو ناتھ کے کمرے میں گیا اور بہت دیر تک وہاں بیٹھ کر کچھ پڑھتا رہا۔ ٹھاکر شمراج اور شمبو ناتھ کمرے سے باہر اس کا انتظار کرتے رہے جب وہ باہر آیا تو اس نے شمبو ناتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس مورکھ نے دو نردوش پریمیوں کی ہتھیا کی ہے ان کی آتمائیں اب انتقام لے رہی ہیں۔ وہ اس خاندان اور اس سے وابستہ کسی بھی فرد کو نہیں چھوڑیں گے"

ٹھاکر شمراج یہ سن کر لرز گیا اس نے نہایت عاجزی سے کہا۔

"جوگی مہاراج۔! ہم پر دیا کریں اس سمسیا کا کچھ اپائے نکالیں"

"اپائے ہے مگر میں اس مورکھ کی کچھ سہائتا نہیں کر سکتا اسے کرموں کا پرائسچت دینا ہوگا۔" جوگی نے گرجدار آواز میں کہا

"دیا کریں مہاراج دیا کریں۔" شمراج نے اس کے پاؤں پکڑ کر کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" جوگی نے شمراج کو اٹھاتے ہوئے کہا "ان آتماؤں کو ختم کرنے کی شکتی مجھ میں نہیں مگر میں ان کو اس کھنڈر میں بند کردوں گا وہ وہاں سے پھر باہر نہیں آسکیں گے"

جوگی نے کھنڈر کے گرد ایک حصار کھینچا اور ایک خاص عمل کے ذریعے ان آتماؤں کو کھنڈر میں مقید کردیا۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا تقسیم ہند کے بعد ہندو گاؤں چھوڑ کر چلے گئے یہ واقعہ وقت کی گرد کی دبیز تہوں میں چھپ گیا۔

جوگی کی موت کے ساتھ اس کا عمل بھی ختم ہوا تو کوشلیا پھر آزاد ہو گئی۔ کھنڈر کے آس پاس سے گزرنے والوں کو وہ نقصان پہنچاتی رہی۔ بہت جلد دوبارہ یہ کھنڈر آسیبی کھنڈر کے نام سے مشہور ہو گیا۔

پے در پے کھنڈر میں کئی مسافروں کی موت نے گاؤں والوں کو پریشان کر دیا۔ وہ جرگے کی صورت میں گاؤں کی سب سے بڑی مسجد کے امام مولوی عبدالحسیب زاہد کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ اس آسیب سے گاؤں والوں کو نجات دلوائے۔

مولوی عبدالحسیب نہایت متقی پرہیزگار اور بہت بڑے عامل تھے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ رات کو جنات اس کے پاس پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ بندگان خدا پر وہ بہت ترس کھانے والے تھے اس لیے فوراً تیار ہو کر اٹھے اور آسیبی کھنڈر کی طرف چلے گئے۔ اس نے گاؤں والوں کو آنے سے منع کیا۔ کھنڈر پہنچ کر اس نے ایک جگہ حصار کھینچا۔ اور اس کے اندر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے آنکھیں بند کر کے اس نے عمل شروع کیا کچھ دیر بعد کوشلیا اور بشیر کی آتما نمودار ہو گئیں بشیر نے اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اس کے کٹے ہوئے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کوشلیا کے دل میں ایک بڑا سوراخ تھا جس کے آر پار سب کچھ نظر آ رہا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف نہایت غصے میں بڑھی مولوی صاحب کے قریب پہنچ کر وہ یوں پیچھے ہٹی جیسے کسی غیر مرئی دیوار سے ٹکرا گئی ہو۔ اس نے مولوی صاحب پر کئی بار حملہ کرنے کی کوشش کی مگر درمیان میں حائل غیر مرئی دیوار کی وجہ سے ہر بار ناکام ہوئی۔ آخر تنگ آ کر اس نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

''تم کیا چاہتے ہو''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بندگان خدا کو نقصان پہنچانا چھوڑ دو'' مولوی صاحب نے جواب دیا

''مگر انہوں نے ہمیں جو نقصان پہنچایا اس کا کیا؟''

کوشلیا نے استفسار کیا

''جس نے تمہیں نقصان پہنچایا تھا تم اس سے انتقام لے چکی ہو۔ باقی ان لوگوں میں اب کوئی نہیں بچا۔ بے گناہ لوگوں کو مار کر تم کون سا انصاف کر رہی ہو'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش رہی پھر اس نے کہا

ہمارے جسموں کا کریا کرم کرو تا کہ ہمیں شانتی ملے نہیں تو ہم یونہی بھٹکتے رہیں گے اور لوگوں سے انتقام لیتے رہیں گے۔

ٹھیک ہے میں آج ہی انتظام کرتا ہوں تم مجھے اپنے اپنے جسم دکھاؤ'' مولوی صاحب نے کہا۔

''میرے پیچھے آؤ تا کہ میں تمہیں دکھا سکوں۔'' کوشلیا نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا مولوی صاحب اس کے پیچھے کمرے میں گئے ایک جگہ وہ رک گئے وہاں دو ڈھانچے پڑے تھے ایک ڈھانچے کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔

''یہ بشیر کا جسم ہے جبکہ دوسرا میرا۔ جاؤ اب اپنا وعدہ پورا کرو۔''

مولوی صاحب نے وہاں سے آ کر لوگوں کو پورا ماجرا سنایا بشیر کی نماز جنازہ اس نے پڑھائی کوشلیا کے کریا کرم کے لیے بونیر (ایک جگہ کا نام ہے) سے ایک پنڈت بلایا گیا۔ اس نے اپنے مذہب کے مطابق اس کا کریا کرم کیا۔

اس کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں نے ترقی کی آبادی بڑھتی گئی گاؤں پھیلتا گیا۔ آسیبی کھنڈر کی جگہ اب ایک خوبصورت پلازہ بن گیا ہے۔

انتہا

مہتاب خان

محبت جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو دیوانگی کی صورت اختیار کرلیتی ہے اس منزل پر پہنچ کر انسان انسان نہیں رہتا بلکہ کوئی اور روپ اختیار کر لیتا ہے۔
الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والی ایک خوب صورت خاتون صحافی کی روداد اس کا شوہر اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔
اس کہانی کی آخری سطور آپ کو چونک جانے پر مجبور کردیں گی۔

رامین فواد اس ملک کے سب سے بڑے نیوز چینل کی مشہور و معروف اینکر تھی۔ یہ بجا طور پر اس کی زندگی کا شاندار دور تھا۔ کامیابیاں اس کی چشم براہ تھیں ان گنت آنکھیں اور دل اس کی راہ میں بچھے رہتے تھے وہ جہاں جاتی محفلوں کی جان قرار پاتی تھی۔ تقریبات اس کی آمد کے ساتھ ہی اہمیت اختیار کرجاتیں تھیں۔ شخصیت کا ظاہری حسن وقت گزرنے کے ساتھ گھٹنے کے بجائے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ خود کو ثابت کرنے کا جنون اسے پہلے بھی تھا مگر اب وہ ایک ضد کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ اس کے ذہنی اور جسمانی معمولات ایسے تھے کہ اسے ذرا فرصت نہیں ملتی تھی البتہ دل ہنوز وہیں کا وہیں تھا۔ اسی دشمن جاں کے قبضے میں۔

اس کی ضد اور وفاداری کا بھی عجیب عالم تھا۔ رنجش اور محبت اپنی جگہ جوں کی توں قائم تھی۔ فواد کو وہ آج بھی اتنا ہی چاہتی تھی جتنا تین سال پہلے۔ اس جزوی علیحدگی کے دور میں اگرچہ کئی مردوں نے اس کے قریب آنے کی بہتری کوشش کیں لیکن اس کے پتھر دل پر تو گویا اسی کی مہر لگی ہوئی تھی وہ نہ جانے کس امید سے بندھی تھی۔ کام سے رامین کی کمٹمنٹ نے جس شخص کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا تھا وہ داؤد پراچہ تھا۔ اس پرائیویٹ نیوز چینل کا مالک۔ اشتہارات کی بھرمار اپنی جگہ مگر اس کے ٹاک شوز نیوز بلیٹن اور اسی نوعیت کے دیگر پروگرامز کسی بھی سیاسی جماعت یا رہنما کو مشہور یا بدنام کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ رامین کا ٹاک شو اس وقت ملک کے طول و عرض کا سب سے مقبول اور مشہور شو تھا۔ کمال شیرازی اس شو کا پروڈیوسر تھا وہ اور اس کی ٹیم کی پیدا کردہ نت نئی تبدیلیوں کی بدولت یہ شو اس وقت ریٹنگ میں سب سے آگے تھا غرض بے تحاشا آمدنی اور بے پناہ اثر و رسوخ وہ جادو تھا جو داؤد پراچہ کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

صبح کے دس بجے تھے وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون ریسیو کیا دوسری طرف ارسلان تھا۔

"رامین تم کہاں ہو؟"

"میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں خیریت؟"

"خیریت نہیں ہے تم جلدی آفس پہنچو کمال شیرازی نے خودکشی کرلی ہے۔"

"کیا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" رامین چلائی یہ جھٹکا اس کے لیے بڑا شدید تھا۔

"تمہیں پتا ہے کمال خودکشی نہیں کرسکتا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے بہرحال تم جلدی آفس پہنچو۔



پولیس انویسٹی گیشن کے لیے یہاں بھی آئے گی۔ باس اس سلسلے میں اسٹاف کو کچھ ہدایات دینا چاہتے ہیں۔''

''اوکے میں آرہی ہوں۔'' اس نے کار کی چابیاں اٹھائیں اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ پھر اسے کچھ پتا نہیں وہ کس طرح ڈرائیو کرکے آفس پہنچی تھی۔ یہ صدمہ اس کے لیے بڑا جانکا تھا۔ کمال شیرازی اس کے شو کا ایک نہایت ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال پروڈیوسر تھا۔ گو کہ کمال کی ذاتی زندگی الیوں سے دوچار تھی اور کچھ عرصے سے وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا مگر وہ مثبت سوچ کا حامل انسان تھا اس سے خودکشی جیسے اقدام کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ آفس پہنچی تو ہر طرف کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ داؤد پراچہ نے اسٹاف کے چیدہ چیدہ افراد کو اپنے روم میں طلب کیا ہوا تھا اسے اپنے درمیان دیکھتے ہی خاص طور پر خواتین اسٹاف میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ وہ کافی دنوں سے اپنے ساتھیوں کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلی محسوس کررہی تھی۔

''سب لوگ آگئے؟'' داؤد پراچہ کی گمبھیر آواز کمرے میں گونجی۔

''جی سر۔'' ارسلان نے مودب انداز میں کہا۔ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر گویا ہوئے کمال شیرازی ہمارے چینل کا ایک اہم اور ٹیلینٹڈ پروڈیوسر تھا۔ اس کی کمی ہمیں ہمیشہ محسوس ہوگی۔ بہرحال یہ بھی سچ ہے کہ وہ پچھلے کئی ماہ سے کچھ پریشان تھا اس کی خودکشی کی خبر کو لے کر ہمارے مخالفین اس کو خوب اچھالیں گے اور بریکنگ نیوز بنا کر تہلکہ مچانے کا یہ موقع ضائع نہیں کریں گے لیکن آپ لوگوں کو میری ہدایت ہے کہ ہمیں اس خبر کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ اس کی اہمیت کم سے کم ہوجائے۔ آپ سب کا تعاون ہمارے ادارے کو بدنامی سے بچا سکتا ہے اور

انفرادی طور پر پولیس اگر آپ لوگوں سے پوچھے تو یہی بتانا ہے کہ کمال ذہنی طور پر پریشان تھا۔''

''لیکن سر ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ خودکشی کرسکتا۔ یہ سراسر قتل ہے۔'' رامین سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑی۔

''ہمیں ادارے کو مشکلات اور بدنامی سے بچانا ہے یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ پتا لگائے کہ یہ قتل ہے یا خودکشی اور رامین کبھی کبھی گھریلو تنازعات ایسی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں کہ ا[illegible]ان کو موت کی وادیوں ہی میں پناہ ملتی ہے۔'' وہ معنی خیز لہجہ میں رامین سے مخاطب تھا۔

''بس مجھے یہی کہنا تھا اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔'' کمال کی چند ماہ پہلے اپنی بیوی سے سپریشن ہوگئی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے جن کی عمریں بالترتیب 11 اور 13 سال تھیں۔ دونوں بچے اس کی بیوی کے پاس تھے۔ ان دونوں کی کسٹڈی کے لیے کمال نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہوا تھا۔ ان دنوں کمال شیرازی کلفٹن کے علاقے میں واقع ایک فلیٹ میں تنہا رہائش پذیر تھا۔ صبح آٹھ بجے حسب معمول اس کی ملازمہ جب فلیٹ پر پہنچی تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر گئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کمال کے بیڈروم میں پہنچی تو وہاں اسے کمال کی لاش چھت کے پنکھے سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔ اس نے فوری طور پر پڑوسیوں سے مدد طلب کی تھی یوں پولیس نے موقع پر پہنچ کر انوسٹی گیشن شروع کردی تھی۔ وہ اپنے روم میں آ گئی تھی اور ریوالونگ چیئر پر سر تھامے بیٹھی تھی۔ اسے کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا کہ کمال اب اس دنیا میں نہیں ہے اس سے وابستہ ایک ایک یاد اس کے ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اور کمال اپنی ٹیم کے ساتھ چند ہفتے پیشتر اپنے شو کی ریکارڈنگ کے لیے اسلام آباد گئے تھے اسلام آباد سے آنے کے بعد دفتر میں اس کا پہلا دن تھا۔

اس کی عدم موجودگی میں داؤد پراچہ نے اس کے روم کی از سر نو تزئین و آرائش کروائی تھی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے اپنے روم کا جائزہ لیا تھا اور ستائشی نظروں سے ان تبدیلیوں کو دیکھا تھا۔

''خوش آمدید محترمہ مبارک ہو آپ کو آپ کا روم بھی آپ کی طرح ترقی کررہا ہے۔'' ارسلان احمد اندر آتے ہوئے بولا تھا۔

ارسلان ایڈیٹنگ کے شعبے کا انچارج تھا وہ اپنی فیلڈ کا جینیس تھا۔ بلا کا منہ پھٹ مگر اس کا دل اتنا ہی صاف اور کھرا تھا اگرچہ اسے چینل جوائن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اپنی بے تکلفانہ فطرت کی وجہ سے وہ ادارے میں سب کا چہیتا تھا اور رامین سے تو اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس نے کرسی کھینچی اور بیٹھنے کے بعد اپنے مخصوص پرمزاح انداز میں بولا۔

''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''تم کب سے اجازت طلب کرنے لگے۔''

''یہ بتاؤ اسلام آباد یاترا کیسی رہی؟'' ارسلان قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''شاندار'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔

''تم دیکھنا ہمارے آئندہ آنے والے شوز ریٹنگ میں سب پر بازی لے جائیں گے۔

''ہاں بھئی ٹیم نے لاکھوں کچھ دیکھ کر ہی لگائے ہیں۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''واقعی حسن کبھی نقصان میں نہیں رہتا اسے تو عقل بھی درکار نہیں ہوتی۔''

''میری محنت کا الزام حسن کو تو نہ دو۔'' رامین نے ہنستے ہوئے کہا پھر کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''یہ بتاؤ کیا پیو گے؟'' وہ اس کا جواب سنے بغیر انٹرکام پر کچھ ہدایتیں دینے لگی۔ کچھ ہی دیر میں پیون چائے کی

ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

''میں اس وقت تم سے بڑی اہم بات کرنے آیا تھا۔'' ملازم کے جاتے ہی وہ بولا۔

''ہاں بولو۔'' چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔

''تمہارے اور کمال شیرازی کے بارے میں اسٹاف میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں پتا چلا ہے کہ کمال اور اس کی وائف کی سپریشن کی وجہ بھی تمہاری کمال سے دوستی ہے۔'' رامین کو جیسے سانپ سونگھ گیا وہ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دیکھنے لگی کچھ دیر وہاں گہرا سکوت چھایا رہا رامین کے ہونٹ اچانک سختی سے بھنچ گئے۔ وہ کاٹ دار لہجہ میں بولی۔

''میرے پاس ان فضول باتوں پر توجہ دینے کی فرصت ہے نہ ضرورت اور تم مجھے بھی اچھی طرح جانتے ہو اور کمال کو بھی۔''

''میں تم دونوں کو غلط کب کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ محتاط رہو۔ ویسے بھی آنٹی کے انتقال کے بعد تم بالکل تنہا رہ گئی ہو اور تنہا عورت پر بہتان لگانا لوگوں کے لیے کتنا آسان ہے تمہیں بخوبی اندازہ ہوگا۔

کچھ عرصے سے اسے بھی دفتر میں کسی ناپسندیدہ تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اسٹاف آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتا اور اسے قریب دیکھ کر بات کرتے کرتے وہ ایک دم خاموش ہو جاتے تاہم وہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی مصروفیات اسے گرد و پیش کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی تھیں۔ پھر وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اسی وقت رامین کے انٹرکام پر بیل ہوئی۔

''جی او کے میں آرہی ہوں۔''

''کمال صاحب اپنے روم میں بلا رہے ہیں کچھ ڈسکشن کرنی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی ارسلان بھی ٹھنڈی سانس لے کر اس کے پیچھے روم سے نکل گیا۔ وہ دونوں باتوں میں اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ باہر رات گہری ہو گئی تھی۔ آفس کا تمام اسٹاف جا چکا تھا۔ رامین کی نظر اچانک وال کلاک پر گئی تو وہ چونکی اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کافی دیر ہو گئی میں چلتی ہوں۔''

کمال شیرازی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں بھی چلتا ہوں۔'' وہ دروازے کی سمت بڑھتا ہوا بولا۔ اسی وقت رامین کا پاؤں راستے میں پڑی ہوئی کرسی سے الجھا اور وہ ڈگمگا گئی اگر کمال اسے آگے بڑھ کر سنبھال نہ لیتا تو وہ منہ کے بل گرتی۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے داؤد پراچہ کھڑا تھا۔

''ارے تم دونوں ابھی تک......''

ان دونوں کو اس حالت میں دیکھنا داؤد کے لیے اچنبھے کا باعث تھا رامین نے تیزی سے خود کو سنبھالا کمال بھی خجل سا نظر آرہا تھا۔ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ان تمام افواہوں پر یقین آگیا تھا جو وقتاً فوقتاً اس نے سنیں تھیں۔ بڑی پارسا بنتی تھی ہونہہ۔'' اس نے سوچا تھا اور جب سے وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ اگلی صبح وہ اٹھی تو ذہن خلاف معمول ہلکا تھا۔ غسل کے بعد اس نے جم کر ناشتہ کیا اور پھر خاصی دیر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنی نوک پلک درست کرتی رہی کار میں بیٹھتے وقت اس کی سج دھج قابل دید تھی۔ چہرے پر کامیاب اور پرآسائش زندگی کی دلکش چمک تھی اور آنکھوں میں وہی للکار جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اس نے گاڑی متوازن رفتار سے روڈ پر ڈال دی رخ چینل کی جانب تھا۔ وہ آفس پہنچی تو سیکرٹری نے بتایا کہ منان حسین کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ رامین کو دیکھ کر پہلے وہ خوش ہوا پھر ایک دم رنجیدہ ہو گیا۔

''بی بی صاحبہ آپ۔'' اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

آنکھوں کے کنارے آن کی آن میں نم ہوگئے۔

''کیسے ہیں منان حسین؟'' رامین کا دل بھی دکھنے لگا۔ تاہم جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔

''زندہ ہوں آپ کی دعا سے۔'' منان سر جھکاتے ہوئے بولا۔

''اور تمہارے صاحب کیسے ہیں؟''

''بس کیا پوچھتی ہیں ان کا حال ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔'' منان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''آئیں میرے کمرے میں۔'' منان مودب انداز میں اس کے پیچھے چل دیا۔ رامین اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ بیٹھیں اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بڑے دن بعد آپ کو میری یاد آئی آپ اور آپ کے صاحب تو شاید مجھے بھول ہی گئے۔''

''یہ کیا بول رہی ہیں بی بی صاحبہ آپ۔'' وہ گھائل لہجے میں بولا۔

''بھلا کون بھلا سکتا ہے آپ کو اور صاحب کا حال تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ دفتر جانا چھوڑ چکے ہیں سارا دن اپنے کمرے میں بند بیٹھے رہتے ہیں دن رات بس نشے میں۔ میں تو جانوں صاحب کو غصہ ہے کسی بات پر۔''

''اچھا۔'' رامین پرسوچ انداز میں بولی۔

''آپ خیال رکھا کریں ان کا۔''

''ان کا خیال نہ ہوتا تو یہاں نہ آتا۔''

''آپ کے علاوہ انہیں کوئی نہ سمجھا سکے ہے۔''

''میں بھلا کون ہوتی ہوں۔''

''دل چھیدنے والی باتیں مت کریں۔'' منان درد ناک لہجے میں بولا۔

''اپنی بیٹا جانتے ہیں آپ کو تو بول رہے ہیں ورنہ نہ یہ اوقات ہے ہماری نہ ہی آپ کو اعتبار آئے گا نوکر ہیں آپ کے۔''

''غلط نہیں کہہ رہی بابا۔'' رامین نے بڑی رسانیت سے اسے مخاطب کیا۔

''آپ کے صاحب نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ مجھ سے ہر ناتہ توڑ لیا۔ کس منہ سے میں انہیں منانے جاؤں۔''

''میں تو یہ مانوں کہ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔''

''بابا آپ نہیں سمجھیں گے۔''

''پیاری بٹیا۔'' منان پدرانہ شفقت سے بولا۔ جنے کتی میرے صاحب پر مرتی تھیں اور کب سے پر قسم ہے اللہ پاک کی صاحب جتی محبت آپ سے کرتے ہیں دکھنے میں نہیں آیا آج تلک۔ یہ معمولی بات نہیں ہے بٹیا اور چشم فلک کے آگے تو خیر ہر آنکھ اندھی پڑ جاوے ہے مگر آپ کی دعا سے اس بڈھے نے کم رنگ نہیں دیکھے دنیا کے۔ آدھی زندگانی کوٹھوں پر بتائی ہے اور کوٹھے بھی اگلے وقتوں کے جدھر جینے کے قرینے ہی نہیں مرنے کی ادا بھی سکھلائی جاوے تھی۔ آنکھ بند کرکے یقین مان لیجئے صاحب آپ کے بغیر جی نہیں پائیں گے۔ میں عدالتی گواہی نہیں دے رہا بٹیا۔ آنکھوں دیکھی بول رہا ہوں۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔

''رامین شرمندہ سی ہوگئی فواد پر جو یقین اسے ہونا چاہئے تھا وہ منان کو تھا۔

''مجھے پتا ہے بابا۔'' وہ منان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''بس یونہی آپ کو چھیڑ رہی تھی۔ آپ کو فواد نے بھیجا ہے۔''

''نہیں جی میں خود آیا ہوں ان کو تو پتا بھی نہ چلے کہ میں ادھر آیا تھا۔ ان ہاتھوں نے انہیں پروان چڑھایا ہے جیسے وہ میرے لیے ہیں ویسے میں آپ کو بھی جانتا ہوں۔'' منان آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ میرے مو میں خاک خدانخواستہ بات نہ بنی تو آپ دونوں کسی اور کے ہونے کے نہیں۔ ایسے

نایاب پھولوں کا بکھرنا کس سے برداشت ہووے گا۔ میں تو کہوں جلدی سے کچھ کر لیجئے ورنہ صاحب..... ٹھیک ہے بٹیا اب میں چلتا ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھے اور اسے گہری سوچوں میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

داؤد پراچہ اپنے روم میں بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامے گلاس کا باقی ماندہ سنہرا سیال حلق میں انڈیلا کمرے کی خنک فضا نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس کے ذہن میں سابقہ شکاروں کی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ وہ ادارے کی ہر قابل ذکر لڑکی پر ہاتھ صاف کر چکا تھا تاہم رامین وہ واحد چوٹی تھی جسے وہ شدید خواہش کے باوجود سر نہیں کر پایا تھا۔ شروع شروع میں وہ اس خوف سے اس پر ہاتھ نہیں ڈال پایا تھا کہ کہیں وہ ادارہ چھوڑ کر نہ چلی جائے بڑے عرصے بعد اسے اتنی خوب صورت اور ذہین اینکر ملی تھی۔ پھر اس نے شادی کر لی اور وہ بھی انتہائی طاقتور اور مشہور و معروف فیملی میں تاہم کچھ ہی سال بعد اس کی علیحدگی ہو گئی تھی ممکن ہے جلد مکمل سپریشن بھی ہو جاتی۔ وہ اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا لیکن کل جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اس نے اسے انتہائی مشتعل کر دیا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس کا منصوبہ ساز ذہن کئی منصوبے بناتا اور رد کرتا رہا۔ اس نے اپنا سر ریوالونگ چیئر کی پشت گاہ سے لگا دیا۔ اس کی موٹی موٹی مخمور آنکھیں بند تھیں۔ شام تک وہ اسی ادھیڑ پن میں رہی کہ فواد کو فون کرے یا نہ کرے۔ آخر اس نے فواد کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔

''ہیلو۔'' فواد کی بھاری آواز گونجی تو بے اختیار اس کا دل دھڑ کا کچھ توقف کے بعد اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہیلو فواد میں رامین۔''

''کیوں فون کیا ہے تم نے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

رامین نے گہری سانس لی اور قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

''کیسے ہو تم؟''

''تمہاری بلا سے تمہیں اس سے کیا دلچسپی کہ میں کیسا ہوں تین سال بعد تم پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ہوں؟ اور مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔''

''تم نے بھی تو اس دوران کوئی رابطہ نہیں رکھا۔''

''خیر یہ بتاؤ کہ فون کیوں کیا ہے تم نے مجھے منانے کے لیے؟''

''روٹھنے اور منانے کا دور پیچھے رہ گیا ہے فواد اب زندگی ہم سے زیادہ ظرف اور زیادہ سنجیدگی کی متقاضی ہے۔ تم خود کو کیوں تباہ کر رہے ہو۔ کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم؟''

''تم نے مجھے کچھ بھی ثابت کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔'' کچھ دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی بالآخر وہ بولا۔

''جس انتہا تک تم پہنچنا چاہتی ہو تم پہنچ گئیں؟ تنہا کھڑی ہونا وہاں...... ہاہاہا...... کوئی ستائش کرنے والا بھی نہیں...... اپنے سوا تمہیں کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہوگا...... ہاہاہا۔'' وہ ہزیانی انداز میں قہقہے لگا رہا تھا رامین کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

''تمہارے خیالات آج بھی ویسے ہی ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ برہم لہجہ میں بولی۔

''اگر میں اتنی ہی بری ہوں تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ دے دو طلاق۔''

''ہرگز نہیں کان کھول کر سن لو میں تمہیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں واپس آنا ہوگا۔ ہر قیمت پر۔ تم'' وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا مگر رامین فون بند کر چکی تھی۔

''یہ چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں۔'' اسی وقت ارسلان اس کے روم میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''اور تم ابھی تک بیٹھی ہو ملک صاحب کے گھر پارٹی میں نہیں جانا کیا؟''

''اوہ میں بھول گئی تھی تم چلو میں آتی ہوں۔'' پورا دن

وہ اتنے جذباتی صدموں سے دوچار ہوئی تھی کہ بالکل بھلا بیٹھی تھی کہ شام میں اسے ملک امتیاز کی پارٹی میں جانا ہے۔ ملک امتیاز ایک نامی گرامی سیاسی لیڈر تھا۔ یہ پارٹی اس نے الیکشن جیتنے کی خوشی میں دی تھی۔ داؤد پراچہ اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست تھا۔ وہ تمام معرکوں میں داؤد پراچہ کا برابر کا شریک تھا۔ الیکشن کمپین میں داؤد پراچہ کے چینل نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو ملک امتیاز نے چینل کے چند اہم افراد کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ ان میں رامین کمال شیرازی اور ارسلان بھی شامل تھے۔ ملک امتیاز اور داؤد پراچہ ایک میز کے گرد بیٹھے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے کچھ ہی فاصلے پر لان کے نیم تاریک گوشے میں کمال شیرازی اور رامین کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ داؤد ایک ٹک رامین کو گھور رہا تھا۔ ملک امتیاز نے اس کی نظروں کے تعاقب میں رامین کو دیکھا اور مسکرایا۔ اس نے داؤد کی خلاف معمول خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔ اسی وقت کمال کی کسی بات پر رامین کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیا بڑبڑا رہے ہو کیسی شادی کس کی شادی؟'' ملک نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''رامین اور کمال کی شادی۔''

''کیا؟'' ملک حیرت زدہ لہجہ میں بولا۔

''رامین کی طلاق ہو گئی؟''

''نہیں لیکن شاید ہونے والی ہے میں نے اڑتی اڑتی خبریں سنی ہیں۔''

''ویسے یہ بات ماننی پڑے گی رامین کے معاملے میں تم بڑے بھوندو ثابت ہوئے ہو۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو کب کا؟''

''میں فواد سے اس کی علیحدگی کا انتظار کرتا رہا لیکن......''

''رہنے دو یار اتنے عرصے میں تم کچھ نہیں کر پائے اور مجھے بھی اس سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

''جب وہ فواد سے ناراض ہو کر آئی تھی تب تمہیں جال پھینک دینا چاہئے تھا لیکن اب تو مچھلی کسی اور کے کانٹے میں پھنس چکی ہے۔'' اس نے کمال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جو اڑنا سکھاتے ہیں وہ پر کترنا بھی جانتے ہیں۔'' داؤد نے زہر خند سے کہا۔

''تم سے کچھ نہیں ہونے والا مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' ملک امتیاز جیسے کچھ ٹھان چکا تھا۔

اور پھر اگلی صبح کمال شیرازی اپنے بیڈروم میں مردہ پایا گیا تھا۔ اگرچہ قاتل نے کمال کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی تھی تاہم پولیس کی انویسٹی گیشن سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اسے قتل کیا گیا تھا اور بعد میں اس کی لاش کو پنکھے سے لٹکایا گیا تھا۔ مگر قتل کا محرک اور قاتل کو تلاش کرنے میں پولیس ناکام رہی تھی۔

کمال کی بیوی نے رامین پر قتل کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اس سے گن گن کر بدلے لے رہی تھی۔ اسی سلسلے میں اسے پولیس اسٹیشن بلوایا گیا تھا جہاں انسپکٹر نے اس سے تند و تیز سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ یہ دن اس کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ اسے چاروں طرف سے پریشانیوں نے گھیر رکھا تھا۔ میڈیا میں اس کے کردار پر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا داؤد پراچہ بھی چینل کے حوالے سے کچھ اہم معاملات کو نمٹانے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ ایسے میں ایک ارسلان ہی تھا جو اس کا سچا ہمدرد اور دوست ثابت ہو رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن آئے اسے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ انسپکٹر کے الٹے سیدھے سوالات کے جواب دیتے دیتے اس کے

حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے ایسے میں ملک امتیاز کی پولیس اسٹیشن میں آمد اس کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اس نے منٹوں میں پولیس سے اس کی جان چھڑوادی تھی۔ بہرحال پولیس کمال شیرازی کے قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔

"ارے آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ پولیس آپ کو تنگ کررہی ہے۔ ورنہ نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔"

"پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"داؤد مجھے فون کر چکا ہے کہ آپ کی مدد کے لیے جاؤں حالانکہ میں پارٹی کی ایک اہم میٹنگ میں بیٹھا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہوں۔"

وہ پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ملک امتیاز کی کار میں بیٹھے تھے جسے ملک خود ڈرائیو کررہا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانی پڑی۔" رامین نے شکر گزاری سے کہا۔

"تکلف سے کام نہ لیں۔" ملک امتیاز نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر مسکرا کر بولا۔

"میں کسی مشکل میں پڑ جاؤں تو آپ دیکھ لیجیے گا۔ دیکھیں گی نا۔"

"وائی ناٹ۔" اس نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کا ذہن ملک امتیاز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو بظاہر خاصا معقول نظر آتا تھا مگر خواتین کے بارے میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ تاہم رامین کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کے ساتھ تو داؤد پراچہ کا رویہ بھی انتہائی شریفانہ تھا جو کہیں سے بھی شریف آدمی نہیں تھا۔ کار اچانک ایک مشہور ومعروف ریسٹورنٹ کے سامنے رکی تو اس نے سوالیہ نظروں سے ملک امتیاز کو دیکھا۔

"اگر پسند کریں تو کھانا کھالیں۔" اس نے انتہائی مہذب انداز میں پوچھا۔ "مجھے فوراً آپ کے پاس پہنچنا تھا مگر اب بالکل برداشت نہیں ہورہا۔"

ریسٹورنٹ کے اندر ماحول بہت پرسکون اور آرام دہ تھا۔ چاروں طرف مدھم موسیقی کی دھن پھیلی ہوئی تھی۔ امتیاز، رامین کو ایک کونے میں واقع ٹیبل پر بیٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پیلے رنگ کی بوتل نکالی جس میں اس کی مرغوب شراب بھری ہوئی تھی۔ مے نوشی سے نمٹ کر وہ کھانے کی میز پر پہنچ گیا۔ کھانے کے دوران گمبھیر خاموشی کو ملک امتیاز کی آواز نے توڑا۔

"رامین میں آج آپ کو ایک آفر دینا چاہتا ہوں۔" رامین جو سر جھکائے کھانے میں مشغول تھی نے چونک کر سر اٹھایا۔

ہماری پارٹی اپنا ٹی وی چینل لاؤنچ کرنا چاہتی ہے۔ آپ ہمیں جوائن کرلیں۔ ایک بات اور یہاں آپ کی حیثیت داؤد کے چینل کی طرح ملازم کی نہیں بلکہ مالکن کی ہوگی۔ آپ اس کی حصے دار ہوں گی آپ اپنی پسند کی ٹیم ہائر کریں اور اپنی مرضی کے مطابق کام شروع کردیں۔ اخراجات تمام پارٹی کی ذمہ داری ہوگی۔"

"آپ کیا کہہ رہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ داؤد صاحب آپ کے دوست ہیں اور آپ۔"

"داؤد کی آپ فکر نہ کریں اسے میں سنبھال لوں گا۔ میں تو صرف آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔"

"ابھی تو میں کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں آپ آرام سے سوچ کر فیصلہ کریں۔" ملک امتیاز اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا ڈٹ کر کھانا کھائیں اور اپنی سب پریشانیاں میرے حوالے کردیں اب ملک امتیاز آپ کے ساتھ ہے۔" رامین خوش خلقی سے

مسکرائی۔

☆......☆

دفتر میں رامین کے لیے حالات ناساز گار تھے۔ اسٹاف کے لوگ پہلے ہی اس سے دور دور رہتے تھے اور اب تو کمال کی بے وقت موت کی وجہ سے اس کی ٹیم بھی ٹوٹ چکی تھی۔ نئے آنے والے پروڈیوسر سے اس کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو پائی تھی۔ داؤد پراچہ کا رویہ بھی اس سے بڑا سرد سا ہو گیا تھا۔ بہر حال حالات اسے ملک امتیاز کی طرف دھکیل رہے تھے آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ملک کی آفر قبول کر لے گی۔ اس نے جب اپنے اس فیصلے سے ارسلان کو آگاہ کیا تو اس نے کہا تھا۔

''سچ پوچھو تو میں عورت کے باہر نکلنے اور کام کرنے کے خلاف ہوں اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو کیا ضرورت ہے خود کو مشکلات میں ڈالنے کی۔ محض وقت گزاری اور اپنی انفرادیت دکھانے کے لیے اپنی ارضی جنت کو جہنم نہیں منانا چاہیے۔'' ارسلان کے ان جملوں نے اسے چونکا دیا۔ فواد بھی یہی کچھ کہا کرتا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے فواد، ارسلان کا روپ دھارے سامنے موجود ہو۔

''تم سب مردوں کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے۔ تم لوگوں سے عورت کی آزادی اور خود مختاری ہضم نہیں ہوتی۔'' وہ طنزیہ لہجہ میں بولی۔ لفظی اعتبار سے عورت کا آزاد رہنا جتنا خوب صورت ہے اس کا عملی تجربہ اتنا ہی بھیانک ثابت ہوتا ہے۔ اللہ نے عورت اور مرد کی تمام ذمہ داریاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ سرخاب کے پر کسی میں نہیں لگے۔ دونوں کی پوزیشن متعین ہیں دونوں قابل احترام ہیں۔ عورت گھر اور خاندان کو مرتب رکھتی ہے تو کمال نہیں کرتی اسی طرح مرد معاشی ضروریات کی فراہمی کا بندوبست کرتا ہے تو احسان نہیں کرتا۔ اللہ کے بنائے گئے قوانین میں ہی عافیت ہے ورنہ جنت کی طرح جہنم کی وسعتیں بھی لامحدود ہیں۔ جہاں چاہو خود کو گم کر دو۔ بہر حال میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ملک امتیاز سے دور رہو۔

رامین کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا جلدی سے اس نے موضوع بدلا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

ارسلان کی جن باتوں کو اس نے بکواس سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ انہوں نے لاشعور میں نقش ہو کر اس کے وجود میں ہل چل سی مچا دی تھی لیکن پھر اس ہل چل پر اس کی فطری ضد اور انا غالب آ گئی۔ دوسری صبح اس نے اپنا ریزائن داؤد پراچہ کو بھجوا دیا تھا۔ اسی سہ پہر وہ ملک امتیاز کے شاندار آفس میں اس کے مقابل بیٹھی آنے والے چینل کے خدو خال پر بات کر رہی تھی۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ داؤد پراچہ آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

''مجھے امید تھی کہ تم یہیں ملوں گی۔'' وہ دانت پیستے ہوئے رامین سے مخاطب ہوا پھر امتیاز ملک کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ اور تم دوست نہیں آستین کا سانپ ہو۔ تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔'' اس کا تھل تھل کرتا وجود غصہ سے کانپ رہا تھا۔

''بزنس میں کوئی دوستی اور دشمنی نہیں ہوتی۔ تم بیٹھو یہ باتیں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہیں۔'' ملک امتیاز ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ رامین نے اس سے پہلے داؤد کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ داؤد مغلظات پر اتر آیا پھر رامین سے کہا۔

''اتنی اونچی اڑان مت بھرو کہ خاک چاٹنی پڑے۔ جو بنانا جانتے ہیں وہ تباہ کرنا بھی جانتے ہیں۔'' رامین بدحواسی سے ملک امتیاز کو دیکھنے لگی۔ ملک تیزی سے داؤد کے قریب آیا اور کہا۔

''تم زیادتی کر رہے ہو داؤد۔''

''آستین کے سانپ تیرا منہ تو میں خود کچلوں گا اور تیری اس......'' اپنے بارے میں ناقابل بیان لفظ سن کر رامین کا

چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہوگیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ داؤد پراچہ مغلظات بکتا ہوا وہاں سے طوفان کی طرح چلا گیا۔

یہ اتوار کا دن تھا۔ وہ دیر تک سوتی رہی تھی۔ بارہ بجے وہ سوکر اٹھی تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ناشتہ کررہی تھی۔ ساتھ ہی اخبار کا مطالعہ بھی۔ شہہ سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے اس کی نظر ایک خبر پر ٹک گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ خبر کے مطابق ملک امتیاز رات اپنے بنگلے کے لان میں مردہ پایا گیا تھا۔ پولیس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کی موت کثرت شراب نوشی کے باعث ہوئی تھی۔ رامین کے ذہن میں داؤد پراچہ کے وہ الفاظ گونجنے لگے تم آستین کا سانپ ہو۔ تمہارا منہ میں میں خود کچلوں گا۔'' رامین نے اپنا موبائل اٹھایا وہ ارسلان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف گھنٹی مسلسل بج رہی تھی کچھ دیر بعد ارسلان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''ہیلو۔''

''ارسلان ملک امتیاز مارا گیا۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''کیا؟'' ''کب؟''

''کل رات مجھے یقین ہے اسے قتل کیا گیا ہے۔ داؤد پراچہ نے میرے سامنے اسے دھمکیاں دی تھیں۔''

''مگر مچھوں کی لڑائی میں یہ تو ہونا تھا بہرحال تم اس معاملے میں خاموش رہنا۔ کسی قسم کا کوئی بیان کسی کو نہیں دینا۔ سمجھ گئیں نا۔''

''ہوں۔'' اس نے فون بند کردیا۔ رامین سے وابستہ افراد میں یہ دوسرا قتل تھا۔

رامین نے شاور بند کیا۔ اس کے بدن پر گرنے والی پھوار کا سلسلہ رک گیا۔ پانی کی ننھی منی بوندیں اس کے سنہرے جسم پر رو پہلے موتیوں کی طرح جھلملا رہی تھیں پھر آنکھوں کے کناروں سے جھڑی سی بہہ نکلی اور رخساروں پر آبی لکیر بناتی نیچے کو ڈھلکنے لگی۔ یکلخت اس کے منہ سے ہچکی سی برآمد ہوئی۔

''میں تھک گئی ہوں میرے معبود میرا حوصلہ ٹوٹ گیا ہے اور برداشت جواب دے چکی ہے۔ الٰہی میری عقل بے مصرف ہوگئی ہے اور اب تیرے سوا میرا کوئی سہارا ہے نہ آسرا کوئی راستہ دکھا دے۔ میرے مالک۔ لب ساکت ہوئے تو دل متحرک ہوگیا۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ واش بیسن کے کناروں پر ٹکے تھے اور ذہن ماضی کی کوتاہیوں کو کھنگال رہا تھا۔

....

وجاہت دولت اور طاقت کے طلسمات فواد بھاگوانی کی شخصیت میں یوں مرکوز تھے کہ اس کے آگے حسینوں مہہ جبینوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ دفتر کا لیڈیز اسٹاف آنے بہانے اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کو بے تاب رہتا تھا مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز تو صرف وہ تھی۔

فواد جس نے دنیا دیکھی تھی مگر رامین جیسا حسن کہیں نہیں دیکھا تھا۔ جب سے اس نے رامین کو دیکھا تھا اس بیچ کوئی ساعت ایسی نہیں تھی جب رامین کا خیال اس کے دل و دماغ سے محو ہوا ہو۔

''میں یہاں صرف تمہاری وجہ سے آتا ہوں مجھے اس دنیا کی چکاچوند یا تمہاری شہرت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں اس بات پر قائل کرنے آیا ہوں کہ آؤ ہم دونوں مل کر اس زندگی کو گلزار بنادیں اور اس سے کہیں بہتر بنادیں جیسی کی یہ ہے۔'' فواد نے کہا تو رامین بھنا گئی تھی اور اس نے فواد کو سخت سست سنادی تھیں۔ اس واقعہ کی اطلاع جب داؤد پراچہ کو ملی تو اس نے رامین کو اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔

''تمہیں خبر نہیں کہ فواد بھاگوانی کس بھوت کا نام ہے۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی ہے۔'' رامین حیرت سے باس کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا مطلب سر وہ بھی ہمارے دوسرے کلائنٹس کی طرح ایک کلائنٹ ہے۔'' داؤد پراچہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں تمسخر کا تاثر نمایاں ہوگیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں تمہاری اس کامیڈی کو انجوائے کرتا۔'' اس نے سگریٹ جلائی اور گہرا کش لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بی بی فواد ہمارے جیسے درجنوں ادارے خرید کر بند کرواسکتا ہے۔ اور اس کا باپ ہارون بھاگوانی جو اس ملک کا سب سے بڑا بینکر ہے۔ وہ ایک دھیلا خرچ کیے بغیر میری پوری پراپرٹی پر قابض ہوسکتا ہے۔'' رامین منہ کھولے اس کی صورت تک رہی تھی۔

''ابھی ایسے اسٹیچو بن کر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرے آگے۔'' داؤد پراچہ اپنی مخمور آنکھیں اس کے وجود پر گاڑتے ہوئے بولا۔

''سر آئی کین سولو دس پرابلم۔'' رامین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ داؤد پہلے چونکا پھر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ویسے کس بات پر تم نے اس سے بدتمیزی کی تھی؟ کوئی اور چکر تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ''صرف مس ہینڈلنگ کا معاملہ ہے مجھے غصہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ معافی مانگ لوں گی میں فواد صاحب سے۔''

داؤد کا شک دور ہوگیا۔ وہ نرمی سے بولا۔

''دیکھو میں فواد کو خالی اس لیے امپورٹنس نہیں دے رہا کہ وہ ایک طاقتور گھرانے کا آدمی ہے بلکہ اس واسطے بھی کہ اس نے صرف چند ماہ میں ہمیں کروڑوں کا بزنس دیا ہے یعنی بچھڑا دودھ دے رہا ہے سمجھ داری سے کام لو ہمیں اس کے نخرے برداشت کرنے پڑیں گے۔''

''یس سر۔'' رامین کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب باس کے کمرے سے نکلی اور کس طور پر اپنے کیبن میں پہنچی۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور دل بوجھل۔ وہ اپنے کیریئر کے اس موڑ پر تھی جہاں وہ محبت یا شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتی تھی مگر اب اس کے پاس فواد کی پرخلوص پیش کش پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ اس کو واقعی یہ ضرورت نہیں تھی کہ یوں کسی کو اپنی محبت اور خلوص کا یقین دلاتا پھرے۔ یوں کہنے کو وہ باس سے کہہ تو آئی تھی کہ آپ فکر نہ کریں میں سنبھال لوں گی مگر اب جو سوچنا شروع کیا تو سلجھاؤ کے راستے میں اس کا اپنا مزاج حائل تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ فواد سے فون پر بات کرے پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ کئی گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے فواد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ فواد کا شاندار بنگلہ اس شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا اور کچھ کہے بغیر اس کے مقابل صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہی تھی۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

''میں تو صرف تمہیں اپنی بے لوث محبت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ مگر تم نے میرا تماشا بنا کر مجھے بہت دکھ دیا۔ تم انکار کرسکتی تھیں میں کبھی تمہارے راستے میں نہ آتا۔'' فواد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''میں اپنی اس بدسلوکی کی معذرت کرنے ہی یہاں آئی ہوں۔ اس ہنگامے کے بعد داؤد صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے۔'' وہ بے ربط انداز میں بولی۔

فواد جواب دینے کے بجائے اسے متاسفانہ انداز میں دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی میں غصے کی سرخی

بھی شامل ہوگئی۔

''آپ داؤد صاحب کے کہنے پر یہاں آئی ہیں؟''
پھر اس کا جواب سنے بغیر اس نے ٹراؤزر کی جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر پنچ کرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد اس کے بھینچے ہوئے لب متحرک ہوئے۔

''ہیلو مسٹر داؤد میں فواد بات کر رہا ہوں۔ جی جی مس رامین کا فون آیا تھا میرے پاس جی ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے دراصل اس دن میں ہی کچھ اپ سیٹ تھا آپ کا کام ڈسٹرب نہیں ہوگا۔ نہیں میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔''

وہ فون بند کر کے واپس مڑا تو اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ کا کام ہوگیا۔'' وہ پتھر کے بت کی طرح جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ اسے اپنا یہاں آنا اور اپنی باتیں بڑی بچکانہ لگ رہی تھیں اور فواد کی پرخلوص محبت کو کھودینے کے قابل ملامت احساس نے اس کے دل میں دیوانہ وار واویلا مچا دیا تھا۔ اس نے اپنی لمبی اور گھنی پلکیں اٹھا کر دیکھا وہ لاتعلق سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے آپ کے خلوص پر شک نہیں کیا تھا۔ دراصل میں آپ سے خوف زدہ تھی۔ بھاگ رہی تھی آپ سے۔ میں جانتی تھی کہ آپ کی شدید محبت کے سامنے میں ہار جاؤں گی۔ لیکن شاید مجھے دیر ہوگئی۔''

یہ کہتے ہی وہ مڑی اور شائستگی کے عالم میں سر جھکائے دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔ فواد پشت پر ہاتھ باندھے اسے جاتا دیکھتا رہا لیکن اس سے قبل کہ وہ باہر نکل جاتی فواد نے جھٹ آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ اس کا رخ نرمی سے اپنی جانب پھیرا اور بولا۔

''تم نے معافی تو مانگی ہی نہیں اور نہ میں نے تم کو معاف کیا ہے۔'' وہ بانہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھا اس کی غلافی آنکھوں میں بھرپور شرارت تھی۔

بانہوں کے حلقے میں قید رامین بری طرح مچلی اور جب کوشش کے باوجود خود کو آزاد نہ کرا پائی تو دونوں ہاتھ فواد کے سینے پر رکھے اور پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلا۔

وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ عقب میں رکھی میز سے الجھا اور دھڑام سے چاروں شانے چت گر گیا۔ میز پر دھرا شیشے کا نازک گلدان اس کے سر پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔ اس کے یوں بری طرح گرنے سے رامین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے سر پر سے گلدان کی باقیات ہٹانے لگی۔ تشویش سے اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ پریشانی سے بولی۔

''آپ کے ماتھے سے تو خون نکل رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں سات خون معاف ہیں تم کو جانم۔''
وہ والہانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''کیا کروں تم سے محبت ہوگئی ہے۔ کرتا رہوں گا ہمیشہ مرتے دم تک۔''

رامین کا سارا لہو سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ محبت کے خدوخال واضح ہوگئے تھے زندگی میں جس شے سے وہ ہمیشہ کتراتی آئی تھی اب وہی اس کے لیے زندگی کا سب سے پرکیف طلسم بن گئی تھی۔ مسرت کا کوئی مست اور سرکش احساس تھا جو بگولے کی مانند اس کے چہار سو پھیلا ہوا تھا۔
فواد بدستور آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ وارفتگی اور سپردگی کا نہ جانے وہ کونسا لمحہ تھا کہ وہ جھکتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے فواد کا چہرہ اس کی زلفوں کی گھٹا میں چھپ چکا تھا۔

یہ شاید ان کی دوسری یا تیسری ملاقات تھی جب فواد نے اس سے کہا تھا۔

''میں اپنے والدین کو تمہاری امی کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں بتاؤ کب بھیجوں؟''

''میرے چند خدشات ہیں انہیں دور کردو پھر......'' وہ جھجکتے ہوئے بولی تھی۔
''خدا کی پناہ تمہیں اب بھی میرے خلوص کا اعتبار نہیں۔'' فواد ششدر رہ گیا۔
''بس اتنا یقین دلا دو کہ مجھے ہمیشہ اہمیت دو گے۔ میری ذات کی نفی نہیں کرو گے اور کبھی میری آزادی اور خود مختاری کو چیلنج نہیں کرو گے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے تم مجھے کبھی جاب سے منع نہیں کرو گے۔'' اس کے احساس عدم تحفظ پر فواد کا دل پگھل گیا اور وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تحمل سے بولا۔
میں تمہارے شوق اور تمہاری خواہشات کی راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔ بس مجھے تمہارا ساتھ تمہاری توجہ اور تمہاری محبت چاہئے۔ رامین ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے بڑی آسودہ مسکراہٹ سے اسے تک رہی تھی۔
''ٹھیک ہے تم اپنے والدین کو بھیج دو ویسے بھی تمہیں بڑی جلدی ہے۔''
''اور تمہیں۔''
''میں۔'' رامین اترائی ''مجھے کوئی جلدی ہے نا خواہش۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔
''تم جانتی ہو میں کل کا کام بھی آج ہی کر ڈالتا ہوں۔'' وہ اس کی طرف بڑھا تو رامین نے اسے پیچھے دھکیلا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔
میمونہ ہارون بیڈ پر لیٹی چھت پر بنے فرانسیسی گلاس ورک کو تک رہی تھیں۔ روشن جبیں پر پڑنے والے بل اس کی گہری سوچ کا پتہ دے رہے تھے ان کی ہموار سانس کبھی کبھار ترتیب ہوکر خواب گاہ کا گہرا سکوت توڑ رہی تھی۔
برابر میں نیم دراز ہارون بھاگوانی نے فائل ایک طرف رکھ کر بیوی کو بغور دیکھا اور فکر مندی سے بولا۔
''کیا بات ہے بنی کیا سوچ رہی ہو۔''
''فواد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' میمونہ شوہر کی طرف کروٹ بدل کر بولی۔
''تمہیں پتا ہے وہ شادی کر رہا ہے۔''
''ہاں وہ مجھے بتا چکا ہے کوئی ٹی وی اینکر ہے۔'' ہارون چشمہ اتارتے ہوئے بولے۔ ''کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''
''کیوں تمہیں اعتراض نہیں؟''
''میرا خیال ہے یہ اس کی لائف ہے جس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اسے اختیار ہونا چاہئے۔ زندگی اسے گزارنی ہے۔''
''مجھے اعتراض ہے تم اس لڑکی کو نہیں جانتے۔ بہت تیز طرار لڑکی ہے اور پھر میڈیا سے تعلق سونے پر سہاگہ۔ اس کی کلاس بھی تو...... میرا خیال ہے۔ فواد کو اپنی کلاس میں شادی کرنی چاہئے۔ وہ اپنے حلقے کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ نسبتاً آسانی سے ایڈجسٹ کرسکتا ہے۔ اس جیسی لڑکیاں گھر نہیں بساتیں۔ کچھ ہی عرصے میں وہ فواد کے لیے ناقابل برداشت ہوجائے گی۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ہارون بھاگوانی نے استفہامیہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ مگر کیا کریں فواد ہمارا اکلوتا بیٹا ہے اور تمہیں پتا ہے کہ وہ کس قدر ضدی ہے جو ٹھان لیتا ہے وہ کرکے چھوڑتا ہے۔ اسے کسی بات پر قائل نہیں کیا جاسکتا۔''
''ہاں وہ کچھ زیادہ ہی ضدی ہوگیا ہے...... میں اسے سمجھانا چاہتی تھی مگر اس سے بات کی تو الٹا یوں لگا جیسے میں اور تم والدین بننے کے اہل ہی نہیں تھے۔''
ہارون نے چونک کر پوچھا۔
''کیا مطلب؟''

''اس کی شکایات عجیب تھیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''اس وقت تو میں ہنس کر ٹال گئی تھی لیکن اب سوچ رہی ہوں تو بہت اسٹرینج فیل ہو رہا ہے وہ کہہ رہا تھا اس کا گھر ہمارے گھر سے مختلف اور مثالی ہوگا جہاں اس کے بچے زندگی کے سچے جذبوں سے آشنا ہوں گے وہ انہیں بہترین شخصیت میں ڈھالے گا انہیں اپنا تمام تر وقت اور محبت دے گا۔ ان کے ساتھ کھیلے گا۔ ہوم ورک کروائے گا۔ ان کا دل کبھی ویران اور اداس نہیں ہونے دے گا ان کی روح کبھی محبت کی پیاسی نہیں ہوگی اور پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ تم سن رہے ہونا۔'' ہارون دم بخود بیٹھا بیوی کا منہ تک رہا تھا۔

''ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے ہارون۔ ہم دونوں اپنی اپنی مصروفیات میں گم رہے۔ ملازمین کے رحم و کرم پر فواد کو چھوڑ کر ہم نے غلط کیا۔'' وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ خیالی اور تصوراتی باتوں پر اس کا یوں متاثر ہونا ہارون کو احمقانہ سا لگا تھا۔ اس نے زور سے گردن جھٹکی اور بیوی کو خود سے قریب کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

''تمہیں شاید لمبے آرام کی ضرورت ہے کہیں گھوم آؤ۔''

''یہ بات نہیں ہارون۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''فواد کے انداز میں کوئی بات ضرور تھی میں بلاوجہ تو ڈسٹرب نہیں ہوں تم سمجھ نہیں رہے اس نے ہم پر الزام لگایا ہے اس کی باتیں بلاوجہ نہیں ہیں۔''

''ہنی ہنی کیا ہو گیا ہے تم کو۔'' ہارون استہزائیہ انداز میں بولا۔

''تم خواہ مخواہ بچی ہو رہی ہو۔ ذرا سوچو وہ مادی عیاشیوں کا متحمل صرف اس سے ہے کہ ہماری اولاد ہے اگر کسی مڈل کلاس یا غریب گھر میں پیدا ہوتا تو یہ سب سوچنے کی بھی اسے مہلت نہیں ملتی روزی روٹی کے ہی چکر میں پڑا ہوتا۔ مادی آسانیوں نے اسے بے لگام کر دیا ہے۔''

''تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟''

''فواد نے اس کی تصویر دکھائی تھی۔ پیاری ہے۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولا۔ ''اس میں فواد کی دلچسپی غیر معمولی ہے۔ اتنی محبت سے اس کا تذکرہ کر رہا تھا کہ کیا بتاؤں۔''

میمونہ نے کڑی نظروں سے انہیں گھورا۔ ریناسے زیادہ خوب صورت ہے۔ حاصل شاہ کی بیٹی رینا کو میں نے فواد کے لیے پسند کیا تھا۔ ہماری ٹکر کا گھرانہ تھا لیکن یہ فواد.....''

''نہیں ریناسے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے۔'' ہارون بھاگوانی گڑبڑا کر بولے۔

....

دوسرے دن رات گئے ہارون اور میمونہ کسی پارٹی سے آئے تھے۔ سیاہ رنگ کی ساڑھی اور ہم رنگ سلیولیس بلاؤز میں میمونہ کی شخصیت کا حسن قابل دید تھا۔ چال میں تمکنت سرخ و سفید چہرے پر بے نیازی کے تاثرات لیے وہ ملکاؤں جیسی شان سے لاؤنج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ لاؤنج میں منان اور فواد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''اب آپ کو کیا بتلائیں صاحب کہ کس قیامت کا نام تھا زہرا بائی آگرہ والی۔'' منان دنیا و مافیہا سے بے نیاز ماضی میں کھوئے ہوئے تھے۔

''چمکتا ہوا مکھڑا اور کندن کی طرح دمکتا بدن نظر کو تاب نہ تھی اس کے سراپے پر ٹھہرنے کی۔ جنے کتے وس کی زلفوں کے اسیر تھے۔ کتے گھر اجاڑے مال زادی نے اور خبر نہیں کتی تجوریاں سونی کر ڈالیں وس نے۔ قیامت تھی قیامت۔ کر ایسی جیسے غریب محلے کی گلی۔ آپ نے تو دیکھی نہیں ہوگی سرکار اور خدا بھلا کرے آپ کا اداؤں میں ایسی مستی

کے طبلے پر ہاتھ رپٹ رپٹ جا رہے تھا۔ ایک نظر میں سوٹکڑے کرتی تھی دل کے۔ ایمان کی بات ہے میاں ناچتے وقت زمین پر پاؤں نہ دھرے تھی۔ یوں لگے تھا اوپر ہی اوپر تیرائی ہے......اور......

دروازے پر کڑے تیوروں کے ساتھ کڑی میمونہ ہارون پرنظر پڑتے ہی منان کی گفتگو کو بریک لگ گیا۔

''آپ کے انہیں جھوٹے سچے قصوں نے اس کا دماغ خراب کیا ہے۔''میمونہ نے اندر آتے ہوئے منان سے کہا۔

منان بدحواس ہو کر کبھی میمونہ اور کبھی فواد کو دیکھے جا رہا تھا۔

''ہاں تو آپ زہرا بائی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔''فواد انہیں نظرانداز کرتا ہوا منان سے مخاطب ہوا۔

''منان آپ اندر جائیں مجھے فواد سے بات کرنی ہے۔''میمونہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو منان اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''آج آپ کو رامین کے گھر جانا تھا۔''فواد نے شکایتی لہجے میں کہا۔ اسی دوران ہارون بھاگوانی لاؤنج میں داخل ہوئے اور بیوی کے برابر میں نشست سنبھالی۔ اور بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''تو تم نے بالآخر شادی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔''

''آپ دونوں کی بھی تو یہی خواہش تھی کیوں ممی!''فواد نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے ہم سے تو تمہیں بہت سی شکایتیں ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ تم دونوں کیسے والدین ثابت ہوتے ہو۔''میمونہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ فواد نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اس کے ذہن میں ان کے ساتھ کی گئی آخری گفتگو تازہ ہو گئی۔ فواد کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اپنے ذاتی گھر کا نقشہ کھینچنے کی دھن میں اس کے منہ سے یقیناً کوئی ایسی بات نکل گئی تھی جو انہیں پسند نہیں آئی تھی آخر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ ماں کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس دن شاید میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔

''اس بارے میں پھر کبھی بات کریں گے۔''میمونہ نے کہا۔

''ابھی کیوں نہیں بتائیں ورنہ مجھے الجھن ہوتی رہے گی۔''وہ کچھ دیر بیٹے کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہیں پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''اس دن تم شاید یہ جتانا چاہ رہے تھے جیسے ہم والدین بننے کے اہل نہیں تھے اور ہم نے تمہیں حالات کے رحم و کرم پر یونہی چھوڑے رکھا۔ جب کہ ایسا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک ہم نے تمہیں زمانے کے سرد و گرم کی ہوا تک لگنے نہیں دی۔ تمہاری ہر خواہش بن مانگے ہی پوری ہوتی رہی۔ اب تم عملی زندگی میں قدم رکھ رہے ہو۔ تمہیں زندگی اور زندگی کے حقائق کا بخوبی علم ہو جائے گا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''فواد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میرا مطلب بس اتنا تھا کہ وسائل کی کمی قابل تلافی ہو سکتی ہے مگر والدین کا قرب اور توجہ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ مجھے جب جب آپ اور پاپا کی ضرورت پڑی آپ دونوں مجھ سے دور تھے اپنی اپنی مصروفیات میں گم۔ یہ شکایت یا طنز نہیں بلکہ ایک ضرورت کا احساس ہے۔''

میمونہ ہنسی۔

''اگر میں تمہیں ہر وقت اپنے پہلو سے لگائے رکھتی تو اس وقت تم کسی اور کا گلہ کر رہے ہوتے۔''

''زندگی کے حقائق کچھ اور ہوتے ہیں اور انسان کی خواہشات کچھ اور زندگی اتنی سہل نہیں جتنی تم اسے سمجھ بیٹھے ہو۔''ہارون نے کہا۔

''میں زندگی کو کسی اور کی نظر سے دیکھنے کا قائل نہیں۔'' فواد نے مخصوص لہجہ میں کہا۔

''میرے لیے حقیقت وہی ہے جس کی گواہی میرا دل دیتا ہے۔''

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں کیوں ہارون۔'' انہوں نے شوہر کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''یہ زندگی تمہاری ہے اور تمہیں ہی گزارنی ہے۔ اگر تم اپنی زندگی کو خود فریبیوں میں ڈھال کر مطمئن ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''یہ زیادتی ہے آپ دونوں کو میری خوشی میں خوش ہونا چاہیئے۔''

''ہم خوش ہیں ہم نے آج تک تمہاری ہر ضد پوری کی ہے۔'' ہارون نے کہا۔

''تم حد سے زیادہ خوش گمان اور سادہ ہو۔'' میمونہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ دنیا اتنی سادہ نہیں اور وہ لڑکی...... بہر حال کل ہم اس کی امی سے تمہارے رشتے کی بات کرنے جارہے ہیں۔'' میمونہ نے کہا

دوسرے دن ہارون بھاگوانی نے فواد کو مبارک باد دی اور ایک فائل اور تین عدد کی چینز اس کی طرف بڑھائیں۔

''یہ کیا ہے ڈیڈی؟'' فواد نے پوچھا۔

''تمہارے لیے گھر خریدا ہے میں نے۔'' ہارون مسکراتے ہوئے بولے۔ ''کاریں البتہ تمہاری مما کی پسند کی ہیں اچھی نہ لگیں تو بتادینا۔''

ناممکن امکان میں اور مکان حقیقت میں ڈھلا تو حیرت اور مسرت نے ان دونوں کے دل میں ایک ناقابل بیان کیفیت پیدا کردی۔ شادی کے بعد رامین اور فواد مہینوں اسی کیفیت میں ڈوبے رہے۔ صبح کے بعد دن پھر رات اور پھر اچانک ایک نئی صبح سامنے کھڑی مسکرادیتی۔ وقت کچھ آگے سرکا تو زندگی کے اسرار سامنے کھڑے تھے۔ فواد نے جلد ہی اپنی معاشی زندگی کو مستحکم کرلیا۔ آبائی زمینوں کی ذمہ داری اس کے پاس تھی تاہم اس نے اپنا بزنس بھی سیٹ کرلیا تھا۔ اس کی محنت رنگ لارہی تھی اور کامیابیاں اس کے قدم چوم رہی تھیں۔

دوسری طرف رامین نے بھی خاصی ترقی کرلی تھی۔ داؤد پراچہ کے نجی چینل میں اس کی حیثیت مستحکم ہوچکی تھی۔ اس کے پروگرام کی ریٹنگ سب سے زیادہ تھی۔ ملک کے طول و عرض میں اس کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اسی حساب سے اس کی مصروفیات بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ یہی وہ نکتہ تھا جس نے دھیرے دھیرے اس گھر کی بنیادیں ہلانا شروع کردیں۔

شادی کو دو برس گزر چکے تھے اور وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ فواد کو یہ کمی اب گراں گزرنے لگی تھی وہ رامین سے بات کرتا تو وہ آسمان کی طرف انگلی اٹھادیتی۔ پریشانی زیادہ بڑھی تو اس نے اپنا اور رامین کا بھی معائنہ کراڈالا مگر سب ٹھیک تھا۔ سو وہ تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ فواد ناشتے کی میز پر بیٹھا رامین کو تک رہا تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اخبار کے میگزین پیج پر شائع ہونے والا اپنا انٹرویو پڑھ رہی تھی۔

''ناشتا تو کرلو ٹھنڈا ہورہا ہے۔'' بالآخر اس نے ٹوک دیا۔

''کرلوں گی تم شروع کرو۔'' پھیلے ہوئے اخبار کے عقب سے رامین کی آواز آئی۔ فواد نے گہری سانس لی اور ناشتا کرنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' کافی دیر بعد رامین نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ فواد اس کے مخاطب کرنے پر چونک گیا۔ پھر محویت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سوچ رہا تھا بچوں کے بغیر ہمارا گھر کس قدر سونا اور ادھورا ہے۔ پتہ ہے میں نے سوچا تھا کہ ہمارے ڈھیر سارے بچے ہوں گے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور ساری زندگی خود کو بہت تنہا محسوس کرتا رہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' رامین کے چہرے پر رنگ سا آ گیا پھر وہ سنبھل گئی اور نظریں چرا کر بولی۔

''بچوں کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن کبھی سوچتی ہوں بچوں کو سنبھالنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کے لیے پورا وقت اور توانائیاں چاہئے۔''

''مگر مشکل کے بعد راحتیں بھی تو بے شمار ہیں۔'' فواد خوابناک لہجے میں بولا۔

''میرا مشورہ مانو تو ابھی سے اپنی توانائیاں جمع کرنا شروع کر دو۔ چھوڑو یہ ملازمت ویسے بھی تم بلاوجہ خود کو تھکا رہی ہو اور کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنا بزنس سنبھالو۔'' رامین چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر بولی۔

''یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ تم اپنے وعدے سے پھر رہے ہو۔''

''تمہیں بھی تو اپنے وعدے یاد نہیں رہے۔ میں اور گھر تمہاری توجہ سے محروم ہے۔''

''میں جانتی تھی ایک نہ ایک دن یہ ہو کر رہے گا۔'' رامین طنزیہ انداز میں بولی۔

''کتنا وقت دیتی ہو تم مجھے اور اس گھر کو۔'' فواد بتھے سے اکھڑ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اندر جانے لگا۔ رامین تیر کی سی تیزی سے سامنے آئی اور اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیئے۔

''مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہے۔ پلیز ناراض نہ ہو۔ اچھا سوری میں خیال رکھوں گی کہ آئندہ تمہیں شکایت نہ ہو۔'' اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔

فواد اُسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ چہرے پر الجھن آمیز کوفت بتدریج زائل ہونے لگی۔ بولا تو لہجہ محبت سے معمور تھا۔

''میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ گھر آؤں تو تم بالکل تازہ دم نکھرے اور شگفتہ چہرے کے ساتھ مسکراتی ہوئی ملو۔ کھانے کے بعد ہم آؤٹنگ پر جائیں اور آخر میں نرم و گرم بستر ہو۔'' اس کا چہرہ جھکا تو رامین کسمسائی۔ اس کی لمبی خمیدہ پلکیں دیکھ کر وہ مسحور ہو گیا۔ اوپری ہونٹ کا نمایاں تل کچھ اور بھی دل آویز لگنے لگا۔ جذبات کے بادل چھٹے تو فواد نے بوجھل آواز میں سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

''میں گھر آتا ہوں تو تم اکثر نہیں ہوتیں اور ہوتی بھی ہو تو اتنی تھکی ماندی۔ کیا ضروری ہے تمہارا جاب کرنا۔''

''میری خوشی اور اطمینان اسی میں ہے۔ کیا تم مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتے۔'' فواد مسکراتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''عورت کی اصل خوشی اس کے شوہر اور بچے ہوتے ہیں۔''

مجھے انکار تو نہیں۔ جب قدرت مہربان ہوگی تو میں یہ بھی کر دوں گی۔'' اس دن ان کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔ رامین نے کہا تھا کہ وہ گھر جلدی آ جائے گی اور شاید وہ باہر کسی ہوٹل میں سیلیبریٹ کریں گے۔ وہ سرِ شام ہی دفتر سے آ گیا تھا۔ شام چھ بجے راین کا فون آ گیا کہ اس کے شو کی ریکارڈنگ ہے اسے دیر ہو جائے گی۔ رات کے دس بج چکے تھے وہ اٹھ کر لان میں چلا آیا تھا۔ چہار سو پھیلی خاموشی نے اس کی اداسی کو کچھ اور گہرا کر دیا تھا۔ خنک ہوا کی سرسراہٹ اور پھولوں کی ملی جلی مہک نے کچھ دیر اس کا دھیان بٹائے رکھا۔ مگر جلد ہی اس کے دل میں پھر وہی تکلیف دہ دھواں سا بھر گیا۔ اسی وقت منان اس کے پاس آ کر بولا۔

''آپ سردی میں کیوں بیٹھے ہیں۔''

''بس یوں ہی۔'' وہ اداسی سے بولا۔

"کھانا تیار ہے اگر کہیں تو لگوا دوں۔" فواد کچھ دیر خالی خالی نظروں سے انہیں یوں دیکھتا رہا جیسے ان کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر منہ دوسری طرف کر کے نرمی سے بولا۔

"نہیں ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گا۔"

منان کے واپس جاتے ہی اس نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر پھیلی پژمردگی کے سبب وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اولاد اس وقت اس کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ یہ دکھ اپنی جگہ مگر رامین بھی تو بہت بدل گئی تھی۔ جوں جوں وہ مقبول ہوتی جا رہی تھی ان کے درمیان سرد مہری حمائل ہوتی جا رہی تھی۔ ہر روز ایک سوالیہ نشان بڑھ جاتا۔ کرسی پر نیم دراز فواد کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ تکلیف دہ سوچوں کا یہ سلسلہ رک جائے۔ مگر جب ایسا نہ ہو سکا تو اس نے ذہن کو بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ کیا واقعی میرے خواب کبھی پورے نہیں ہوں گے۔ میرے سنہرے خواب سراب ثابت ہوں گے۔ میرے چاروں طرف یونہی تنہائیوں اور مایوسیوں کا راج رہے گا۔" اس نے سوچا۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اسے اپنے ذہنی توازن پر شک ہونے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر گھر کے اندر آ گیا اور آتے ہی منان کو آواز دی۔

"کھانا لگوائیں بھوک لگ رہی ہے۔" کھانے کے بعد اس نے کافی بنوائی اور بیڈ روم میں آ گیا۔ کافی پینے کے دوران وہ اپنی پسندیدہ موسیقی سنتا رہا۔ وائلن کی مسحور کن دھن نے اسے بالکل پرسکون کر دیا اور اب اسے رامین کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اسے فون کرے پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور انتظار کرنے لگا۔ انتظار مشکل لگا تو وقت گزاری کے لیے اس نے شادی کے البمز دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ البم اسے الماری کے اوپری خانے میں نہیں ملے۔ جب اس نے سیف کھولا تو تمام البمز ترتیب سے وہاں رکھے تھے۔ وہ الماری کے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تا دیر تصاویر دیکھتا رہا۔ آخری البم کی آخری تصویر دیکھتے ہوئے اس کے لبوں پر موجود مسکراہٹ میں محبت کا رنگ گہرا ہو گیا۔ دلہن کے روپ میں رامین کس قدر خوب صورت لگ رہی تھی۔ تصویر دیکھتے ہوئے وہ قالین پر رکھے دوسرے البمز دھیرے دھیرے واپس سیف میں رکھتا جا رہا تھا کہ کچھ گرنے کی آواز آئی تو دیکھے بغیر اس نے قالین پر ادھر ادھر ہاتھ پھیرا وہ کوئی شیشی تھی۔ جسے اس نے اٹھا کر واپس سیف میں رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آخری البم بھی بند کر دیا اور اسے واپس رکھنے لگا۔ اسی وقت اس کی نظر سامنے رکھی شیشی پر پڑی جو اس نے بے دھیانی میں سامنے رکھ دی تھی۔ لیبل پر درج تفصیل پڑھتے ہی اس کی آنکھیں پہلے مسکرا دیں پھر پھیلتی چلی گئیں۔ شک دور کرنے کے لیے اس نے ایک بار پھر لیبل کو غور سے پڑھا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ مانع حمل گولیوں کی شیشی تھی۔ وہ آدھی خالی تھی صورت حال واضح ہوتے ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہے۔ جوش غضب میں وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی سماعت میں رامین کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بچے کسے اچھے نہیں لگتے فواد مگر یہ ہمارے بس میں تو نہیں..... آر یو میڈ۔ بچے بھی بھلا خواہش سے ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ماں کی آواز آئی۔ تم بہت سادہ ہو فواد دنیا اتنی سادہ نہیں اور وہ لڑکی تو..... حقیقت اپنی تمام تر کڑواہٹوں کے ساتھ مجسم اور ناقابل تردید تھی۔ پھر تو جیسے اس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ جسم میں موجود سارا لہو کھولتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہو گیا اور آنا فانا بائیں ہتھیلی میں سمیٹ آیا۔ گرفت بڑھی تو شیشی چٹ سے ٹوٹ گئی۔ گولیاں نیچے گر گئیں اور کانچ کے کئی ٹکڑے اس کی ہتھیلی میں پیوست ہو گئے۔ مگر وہ تکلیف

سے بے نیاز دور کہیں خلاؤں میں گھور رہا تھا۔
اس نے جھرجھری لے کر دروازے کی سمت دیکھا۔ سامنے رامین کھڑی تھی۔ وہ اسی وقت پہنچی تھی۔ شوہر کے ہاتھ سے بہتا ہوا لہو دیکھ کر وہ بوکھلا گئی اور تیزی سے اس کے نزدیک آئی۔
''کیا ہوا ہاتھ میں دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے۔ چلو اٹھو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' فواد اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔
''کیسے ہوا یہ؟'' رامین نے اس کی سختی سے بند ہتھیلی کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔ ہوا کیا ہے آخر بتاؤنا!'' فواد نے یکلخت اسے پیچھے دھکیلا۔ وہ اکڑوں بیٹھی تھی ہزار کوشش کے باوجود سنبھلنے میں ناکام رہی اور پیچھے گر گئی۔
''یہ کیا ہے؟'' اس نے لہولہان ہتھیلی کھول دی۔
''یہ اور یہ۔'' وہ قالین پر بکھری ہوئی گولیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولا۔
رامین اس چور کی مانند کھڑی تھی جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ اسے ان گولیوں کا پتا چل جائے گا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ موجودہ صورت حال سے کس طور نکلے وہ بت بنی کھڑی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب فواد کھڑا ہوا اور غیر متوقع طور پر ہموار قدموں سے چلتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر وحشت کے بجائے عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ وہ اس کے مقابل آکر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سرد نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں پھر اچانک اس کی بھاری بھرکم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ تم نے عجب بے وقوف بنایا۔ ایک ایسے شخص کو دھوکا دیا جس نے اپنے وجود کی پوری سچائیوں کے ساتھ تم کو اپنایا تھا۔ جس نے اپنے سارے خواب تمہیں سونپ دیئے تھے اور اپنی زندگی کی ایک ایک چیز تم سے عبارت کردی تھی۔ کیوں کیا تم نے ایسا جواب دو۔'' فواد نے اسے جھنجوڑ دیا۔
وہ بولی تو لہجہ پرسکون تھا۔
''اس لیے کہ میں فی الحال اولاد کا جھنجٹ افورڈ نہیں کرسکتی مجھے بہت آگے جانا ہے میری کامیاب زندگی کی مصروفیات یہ اجازت نہیں دیتیں کہ......''
''بند کرو یہ بکواس۔'' فواد پھنکارا تم کیا اور تمہاری مصروفیات کیا ہونہہ۔''
مارے غصے کے رامین کا چہرہ بگڑ گیا۔
''میں کوئی عام عورت نہیں ہوں جسے تم اپنی کنیز بنا کر رکھ سکو۔ میری ترقی کھٹکتی ہے تمہیں میری شہرت تم سے برداشت نہیں ہورہی۔ جلتے ہو مجھ سے۔'' فواد کو یوں لگا جیسے تعلق کی باقی ماندہ رگیں بھی کٹتی جارہی ہوں۔
''تم سے جلوں گا میں......تم سے۔'' اس کے لہجے میں بلا کا تمسخر تھا۔ غور سے دیکھو میری طرف اور پھر اپنے آپ کو ماضی حال اور مستقبل کے حوالے سے دیکھو اور پھر مجھ کو بتاؤ کہ تم میں ایسی کوئی بات تھی کہ تمہیں مجھ جیسا شوہر ملتا۔ یہ حقیر چیزیں میری ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔ میں نے تم سے محبت کی تھی اور یہ اعزاز بخشا کہ میری بیوی کہلاؤ۔''
''میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے اس اعزاز پر۔'' رامین منہ سے کف اڑاتے ہوئے بولی۔
''سمجھ کیا رکھا ہے تم نے مجھ کو تم سے ہزار گنا بہتر رئیس مرد میرے ادنیٰ اشارے کے منتظر تھے اور اب بھی......'' وہ بولتی گئی۔ مگر فواد تو جیسے بہرا ہو گیا تھا۔ کوئی اندھا جوش اچانک ہی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے گھوما اور رامین کو جیسے پر لگ گئے وہ اڑتی ہوئی دور جا گری۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب نوعیت کی نرمی سی پھیلی ہوئی تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ اس کے قریب بیٹھا کہہ رہا تھا۔

''مجھے مارنا نہیں چاہئے تھا۔'' پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔

''تم آج کے بعد اپنے ہر فعل میں آزاد ہو۔ جو مرضی آئے کرو۔ میں اس انتہا کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں تک تم پہنچنا چاہتی ہو۔ مگر اب ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ ابھی اور اسی وقت۔''

رامین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''تم مجھے طلاق دے رہے ہو؟''

''نہیں میں تمہیں کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ میں تمہیں کسی اور کا ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتا۔''

''غصے میں کی گئی باتوں کو اتنا بڑا مسئلہ نہ بناؤ۔ پلیز مجھے ایک موقع دو۔'' رامین کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''میرے صبر کا مزید امتحان نہ لو۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چلی جاؤ۔''

رامین کو اس کی آخری بات سے سخت ٹھیس پہنچی۔ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ قدم آگے بڑھایا تو دل بیٹھ گیا۔ دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے ایک موہوم سی امید دل میں جاگی کہ وہ اسے جانے نہیں دے گا۔ پیچھے سے دبوچ لے گا۔ اور کہے گا چلو جانے دو معاف کیا رونا تو بند کرو۔ اسی خوش گمانی میں چلتے چلتے کاندھے پر لمس کا احساس ہوا تو اس کا دم جھوم اٹھا۔ وہ تیزی سے پلٹی۔ مگر وہ دروازے پر جھولتا پردہ تھا۔ فواد بدستور پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے آنسو صاف کیے اور باہر نکل گئی۔ اس کی فواد سے جزوی علیحدگی کو ایک سال ہوگیا تھا جب ایک اور دل خراش سانحہ ہوا کہ اس کی والدہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ والد پہلے ہی انتقال کر گئے تھے یوں اب وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس عرصے میں فواد نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اسے طلاق دی تھی۔ فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ جھرجھری لے کر چونکی اور جھٹ پٹ کپڑے پہن کر باتھ روم سے باہر آ گئی۔ اس نے ریسور اٹھایا۔

''ہیلو۔''

''ہیلو رامین۔'' دوسری طرف فواد کی بھاری آواز سنائی دی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

''میں تمہیں واپسی کا ایک آخری موقع دینا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا میں تم سے کبھی لاتعلق رہا ہوں۔ تم میری بیوی میری عزت ہو۔ آج تک تم ہمیشہ میرے بندوں کی نگرانی میں رہی ہو۔ چاہے وہ تمہارا گھر ہو یا دفتر۔ تمہاری ایک ایک ایکٹیویٹی پر میری نظر تھی۔''

''کیا؟''

''تمہیں اپنے دفتر کا ساتھی ارسلان تو یاد ہی ہوگا۔ وہ میرا خاص آدمی تھا۔ جس نے میرے ہی کہنے پر وہاں جاب حاصل کی تھی اور ایک بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنی پسندیدہ شے سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا۔ اس لیے جس کسی نے تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کی وہ کمال شیرازی اور ملک امتیاز کی طرح مارا جائے گا۔'' یہ آخری جملہ اس نے انتہائی سفاک لہجے میں کہا تھا۔ رامین نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آ رہی ہوں۔'' رامین نے فون رکھا۔ کار کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل گئی۔ اس کی گاڑی کا رخ فواد کے گھر کی جانب تھا۔ فواد کچھ دیر ساکت کھڑا ماؤتھ پیس کو گھورتا رہا۔ پھر آہستگی سے فون بند کیا اور فاتحانہ مسکراہٹ سے خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

⌘

ذوقِ آگہی

سباس گل

اسلامی معلومات کا خزانہ

سوال: کون سے خلیفہ کے بذریعہ ولی کہنے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے دریائے نیل جاری ہوگیا تھا اور اب تک جاری ہے؟

جواب: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کون سے پیغمبر ہیں جن کا کوئی باپ نہیں؟

جواب: حضرت آدم علیہ السلام۔

سوال: خدائی کا دعویٰ کرنے والے نمرود کا اول نام کیا تھا؟

جواب: ہاحد۔

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کس پہاڑ سے زندہ آسمان پر اٹھایا گیا؟

جواب: کالوری۔

سوال: وہ کون سا مذہب ہے جس کا بانی پیغمبر نہیں فلسفی تھا؟

جواب: کنفیوشس مت۔

سوال: وہ کون سی قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سب سے زیادہ نافرمان قرار دیا ہے؟

جواب: قوم بنی اسرائیل۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

نیک اعمال کا وسیلہ

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الصحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل فرمائی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔

تم سے پہلی امتوں میں سے تین حضرات ایک سفر پر نکلے دوران سفر رات ہوگئی اور بارش بھی ہونے لگی تو ایک غار میں رات گزارنے کے لیے وہ حضرات داخل ہوگئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک بڑا سا پتھر لڑھک کر نیچے آیا اور غار کے دہانے کو بند کر دیا یہ دیکھ کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس آزمائش سے نجات کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ مشورے سے یہی طے ہوا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے نیک عمل کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے چنانچہ وہ اپنے اپنے عمل کے حوالے سے دعائیں کرنے لگے۔

پہلے شخص نے دعا کرتے ہوئے کہا۔ ”یا اللہ تو جانتا ہے کہ میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور شام کو میں سب سے پہلے انہی کو دودھ پلاتا تھا ان سے پہلے اہل وعیال اور غلام و خادم کو نہیں پلاتا تھا ایک دن میں اپنے جانوروں کے چارے کی تلاش میں دور نکل گیا اور جب واپس آیا تو میرے والدین سو چکے تھے میں نے دودھ دوہا اور ان کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ گہری نیند میں ہیں میں نے ان کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور ان سے پہلے اپنے اہل وعیال اور غلاموں کو پلانا بھی گوارا نہیں کیا میں دودھ کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے، ان کے سرہانے کھڑا ان کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا حتیٰ کہ صبح ہوگئی جب وہ خود بیدار ہوئے تو میں نے انہیں ان کے شام کے حصے کا دودھ پلایا، یا اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام صرف تیری رضا اور خوشنودی کے لیے کیا تھا تجھے اس کا واسطہ ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔

دعا کے نتیجے میں وہ چٹان تھوڑی سی سرک گئی لیکن باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔

دوسرے شخص نے دعا کرتے ہوئے کہا۔ ”یا اللہ تو جانتا ہے کہ میری ایک چچا زاد بہن تھی جو مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی حتیٰ کہ وہ محبت اپنے انتہا کو پہنچ چکی تھی ایک مرتبہ میں نے اس سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ آمادہ نہیں ہوئی اور انکار کر دیا حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ قحط سالی نے اسے میرے پاس آنے پر مجبور کر دیا میں نے اسے اس شرط پر ایک سو بیس دینار دیے کہ وہ مجھے اپنے آپ سے نہ روکے وہ آمادہ ہوگئی جب میں تنہائی میں اسے لے گیا اور وہ ہر طرح سے میرے قابو میں آگئی تھی یہاں تک کہ وہ میری مکمل دسترس میں تھی اسی دوران اس نے مجھ سے کہا کہ اللہ سے ڈر اس کے ان الفاظ نے یا اللہ تیرا خوف میرے اوپر طاری کر دیا اور میں اس سے دور ہوگیا حالانکہ وہ عورتوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی اور میں نفسانی خواہشات کو پورا بھی کر سکتا تھا لیکن تیرے خوف

سے میں نے گناہ چھوڑ دیا میں نے سونے کے وہ دینار بھی اس کو دے دیے یا اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا تھا تو ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔

چنانچہ وہ چٹان کچھ اور سرک گئی لیکن باہر نکلنے کا راستہ اب بھی بدستور ناکافی تھا۔

تیسرے شخص نے دعا مانگتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ تجھے میری حقیقت حال اچھی طرح معلوم ہے میں نے اپنے کام کے لیے کچھ مزدوروں کو اجرت پر رکھا تھا سب کی اجرت میں نے ادا کردی۔ صرف ایک مزدور ناراض ہو کر اپنی مزدوری کے لیے بغیر چلا گیا میں نے اس کی مزدوری سے غلہ خریدا، اسے بویا پھر اس سے بتدریج بکری، گائے اور غلام وغیرہ خریدے حتیٰ کہ بہت سارا مال جمع ہوگیا کچھ عرصہ کے بعد وہ آیا اور کہنے لگا کہ اللہ کے بندے مجھے میری اجرت ادا کردے میں نے کہا۔ ''یہ اونٹ، گائے، بکریاں، اور غلام جو تجھے نظر آرہے ہیں یہ سب تیری اجرت کا ثمر ہیں ان سب کے تم مالک ہو اس نے کہا۔ ''اللہ کے بندے مجھ سے مذاق نہ کر۔'' میں نے کہا۔

میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں حقیقت بیان کر رہا ہوں چنانچہ وہ سارے کا سارا مال لے کر چل دیا یا اللہ اگر میں نے یہ کام صرف تیری رضا کی خاطر کیا ہے تو ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما، چنانچہ وہ چٹان بالکل ہٹ گئی اور غار کا منہ کھل گیا اور تینوں باہر نکل آئے۔

مشکلات میں اپنے نیک اعمال کا وسیلہ بھی جائز ہے دعا تو بغیر وسیلے کے بھی قبول ہوتی ہے لیکن وسیلے کے ساتھ جلد قبول ہوجاتی ہے۔

بحوالہ (الصحیح بخاری)

ایس حبیب خان......کراچی

صدقے کی فضیلت

صدقہ قبر کی گرمی سے بچاتا ہے۔

قیامت کے دن مسلمان صدقے کے سائے میں ہوگا۔

رشتہ داروں کی مالی مدد کرنے پر نفلی صدقے کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا اجر بھی ملتا ہے۔

مسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے۔

صدقہ ادا کرنے سے مال میں بھی برکت ہے۔

محمد رفاقت......واہ کینٹ

ایصال ثواب

قل خوانی، سات جمعرات کو ختم دلوانا، دسوے کا ختم، بیسوے کا ختم، چہلم برسی یہ سب کچھ مرنے والے کے ایصال ثواب کے لیے کیا جاتا ہے کیا ہم واقعی مرنے والے کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں یا بطور رسم اپنی ناک بچاتے ہیں لوگ بھی بڑے بڑبولے ہیں کوئی اگر یہ رسم ادا نہ کرے تو جینے نہیں دیتے دیکھو تو باپ مرگیا ہے ختم دلوانے کی توفیق تک نہیں ہوئی اس طرح کے مکالمے سن سن کر مرنے والے کے بیٹے اور رشتے دار تنگ آجاتے ہیں ماں ایک ایسا رشتہ ہے کہ اگر ماں وفات پاجائے تو گھر ویران ہوجاتا ہے کہیں من نہیں لگتا ماں کے ایصال ثواب کے لیے محبت کرنے والے بیٹے اور بیٹیاں بہت کچھ کرتے ہیں لیکن کچھ بیٹے ایسے بھی ہوتے ہیں ماں کے ایصال ثواب کے لیے جیب سے رقم خرچ نہیں کرتے بدنیتی کا مظاہرہ کرتے ہیں فراڈ کر کے دھوکہ کر کے چہلم کا ختم دلواتے ہیں لیکن حقوق العباد ادا نہ کرنے کا گناہ اپنے سر لے لیتے ہیں ان کا مقصد شاید یہ ہو کہ اماں مرحومہ تک ثواب پہنچا چاہیے اپنی خیر ہے قبر میں عذاب بھگت لیں گے تقریباً دس سال قبل کا یہ واقعہ ہے ارشد پرچون والے کے پاس ایک سرکاری ملازم جو کسی افسر کا ڈرائیور تھا آیا اور روہانسی شکل بنا کر منت کرنے لگا کہ اماں جی کا چہلم قریب ہے مجھے دو تین دیگوں کا سامان چاہیے یہ تمام سودا ادھار دے دو چہلم کے بعد ادائیگی کردوں گا۔ ہر آدمی کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ کسی نیک کام کی غرض سے سودا لینے والا ضرور ادائیگی کردے گا اس وقت دل ودماغ یہ بات مانتا ہی نہیں کہ معصوم صورت بنا کر آنے والا یہ شخص فراڈ کرے گا ارشد نے اس ڈرائیور سے کہا۔ ٹھیک ہے بھائی، سامان لے جاؤ۔ ڈرائیور نے سامان کی لسٹ ارشد کو دے دی۔ ارشد نے لسٹ کے مطابق تمام سامان اسے دے دیا۔ ڈرائیور نے ارشد کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی کو چھو کر بولا۔ یار ارشد نے میرا دل موہ لیا ہے اگر دنیا میں تیرے جیسے نیک انسان نہ ہوتے تو دنیا کب کی ختم ہوجاتی اب سمجھ آئی ہے قیامت کیوں نہیں برپا ہو رہی کیونکہ تیرے جیسے نیک لوگ دنیا میں موجود ہیں میرا ایمان ہے اس وقت تک دنیا میں قیامت برپا نہ ہوگی جب تک

اس دنیا میں ایک بھی تیرے جیسا مخلص انسان ہوگا، واہ کیا نظام ہے قدرت کا نیک انسانوں کی وجہ سے یہ دنیا بچی ہوئی ہے اس طرح کی لگی لپٹی خوشامدانہ باتیں کر کے وہ شخص سامان لے کر چلا گیا ایک مہینہ گزر گیا پھر دو مہینے گزر گئے وہ شخص رقم دینے نہیں آیا وہ نو سو روپے سامان لے گیا تھا چھ ماہ بعد سر راہ اس شخص کی ارشد سے ملاقات ہوگئی ارشد نے کہا یار تو والدہ کے چہلم کے لیے نو سو روپے کا سامان لے گیا تھا رقم دینے نہیں آیا اس نے ایک بار پھر ارشد کی تھوڑی کو ہاتھ لگایا اور اپنی مجبوریاں بتانے لگا کہ یار بس کیا بتاؤں میں تو مصیبتوں میں گھر گیا تیرے پاس آنے کا موقع نہیں ملا اس ہم کو ہاتھ جوڑ کر یار کو رقم دے جاؤں گا پھر وہ چلا گیا دس سال ہو گئے ہیں اب وہ شخص ارشد کو نظر بھی نہیں آیا ادھار کا سودا لے کر اس نے چہلم کا ثواب کا والدہ مرحومہ کا پہنچا دیا لیکن رقم ادا نہیں کی کیا اس نے ایصال ثواب کی غرض سے چہلم کا ختم دلوایا یا اپنی ناک بچانے کے لیے سوچنے کی بات ہے کیا اس طرح کا چہلم منانے سے مرنے والے کو ثواب پہنچ گیا ہوگا۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور

باتیں یاد رکھنے کی

❁ ہر انسان اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں۔

❁ سوسائٹی اتنی بگڑ چکی ہے کہ نوٹ کھلے کرانے پر بھی چائے طلب کرتی ہے۔

❁ انسان کو اپنی عزت بچانے کے لیے بے عزت ہونا پڑتا ہے۔

❁ اچھی صحت زندگی کی ضمانت نہیں ہوتی۔

❁ بلدیہ کے ملازم نالیاں صاف کرتے ہیں گلیاں گندی کر دیتے ہیں۔

❁ انسان کی غرضیات اسے پیشہ ور بنا دیتی ہیں۔

❁ مرنا تو ہم نہیں چاہتے لیکن موت ضرور آئے گی۔

❁ جب انسانوں کی تعداد زیادہ اور مکانوں کی تعداد کم ہو تو درندگی پیدا ہوتی ہے۔

❁ معاشرتی برائیاں با اختیار لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔

❁ گند پھیلانے والے دکھائی دیتے ہیں گند اٹھانے والے نہیں۔

احسان اللہ...... کھاریاں

خبروں پر تبصرہ

خبر: ہم اپنے ساتھیوں کو تنہا نہیں چھوڑیں گے، پرویز الٰہی

جس رفتار سے ساتھی آپ کو چھوڑ رہے ہیں لگتا ہے آپ خود تنہا رہ جائیں گے۔

خبر: طالبان اور شریفوں کا نظام ایک جیسا ہے، فواد چوہدری

آپ کو غالباً نیند میں باتیں کرنے کی عادت ہے۔

خبر: عوام کو نواز شریف کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں، فواد چوہدری

میرے خیال میں عوام ان کو سمجھتے ہیں جو عمران خان کی باتوں میں دلچسپی لیں۔

خبر: پارلیمنٹ کو گالیاں دینے والوں کو جوتے ماروں گا، عابد شیر علی

بسم اللہ کریں اللہ برکت دینے والا ہے۔

خبر: فیصلے امپائر کی انگلی نہیں عوام کے ووٹ کرتے ہیں، نواز شریف

بیلٹ پیپرز پر انگوٹھا لگانے والا ہارنے والے کے لیے ٹھینگا ہوتا ہے۔

خبر: حکومت کہیں نظر نہیں آرہی، فواد چوہدری

کمال ہے آپ کو اتنی بڑی حکومت نہیں آرہی آپ فوراً کسی آنکھوں کے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

خبر: فواد چوہدری الیکشن ہارنے کے بعد پارٹی بدل لیتے ہیں اور عمران خان شادی کر لیتے ہیں، کیپٹن صفدر

پارٹی بدلنا فواد چوہدری اور بیوی بدلنا عمران خان کا مشغلہ ہے۔

خبر: مرشد سے کون شادی کرتا ہے، نفیسہ شاہ

عقیدت مند شادی سے پہلے پیرنی کا مرید اور شادی کے بعد رن مرید ہوتا ہے۔

خبر: سیاست غریب اور جمہوریت کے لیے کرتے ہیں، بلاول بھٹو

ظاہر ہے غریب تو سیاست کرنے سے رہا۔

خبر: عائشہ گلالئی نے نئی پارٹی بنالی، ایک خبر

دیکھیں عائشہ گلالئی کی نئی پارٹی کیا گل کھلاتی ہے۔
خبر: گوجرانوالہ نے دھرنے والوں کو بھگا دیا اب تک بھاگ رہے ہیں، مریم نواز
اب صرف فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔
خبر: شہباز شریف سے حسد کے بجائے عمران خان خدمت کا جذبہ پیدا کریں، مریم اورنگزیب
صرف حسد سے حسد کریں۔
زکریا شمسی......ملتان

اجازت نامہ

ایک آدمی میڈیکل اسٹور پر جا کر بولا مجھے زہر چاہیے۔
دکاندار: آپ کے پاس اجازت نامہ ہے؟
آدمی نے نکاح نامہ دکھایا۔
دکاندار: اوئے چھوٹے اسے بڑی بوتل دے دو۔
آنسہ شبیر......ڈوگہ شریف

خوب صورت زندگی

☆فجر کی نماز کو اپنا نصیب بنالو۔
☆ظہر کی نماز کو اپنا مقدر بنالو۔
☆عصر کی نماز کو اپنی تقدیر بنالو۔
☆مغرب کی نماز کو اپنا مستقبل بنالو۔
☆عشا کی نماز کو اپنی امید بنالو۔
☆پھر دیکھو زندگی کتنی خوب صورت لگتی ہے۔
نجم انجم اعوان......کورنگی، کراچی

کچھ باتیں یاد رکھنے کی

خاموشی: ایسا درخت ہے جس پر کڑوا پھل نہیں لگتا۔
حسد: ایسی دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کرتی ہے۔
سچائی: ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔
ذہانت: ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔
خوش اخلاقی: ایسی خوش بو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہوجاتی ہے۔
گناہ: ایسی لعنت ہے جو قلب کو سیاہ کر دیتی ہے۔
ضمیر: ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ حق کی راہ دیکھتا ہے۔
دعا: ایسا عمل ہے جو تقدیر کو مات دے سکتا ہے۔

توبہ: ایسا دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا رہے گا۔
شگفتہ خان......بھلوال

پیار کیا ہے؟

♥ پیار وہ ہے جب میری ماں پیشانی پر بوسہ دیتی ہے۔
♥ جب میں دیر سے گھر آتا ہوں تو بابا میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔
♥ جب میری بہن کام کرتے ہوئے کہتی ہے جب میری شادی ہوجائے گی تو کون کرے گا تمہارے یہ کام۔
♥ جب میرا بڑا بھائی کہتا ہے تجھے یہ شرٹ پسند ہے چل رکھ لے میں اور خرید لوں گا۔
♥ جب میرا دوست کہتا ہے ٹینشن نہ لے یار میں ہوں نا تیرے ساتھ۔
صدیقہ خان......آزاد کشمیر

حجاب

حجاب محض عورت کا پردے میں چھپ جانا اور سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک اپنے آپ کو ڈھانپ لینا ہی نہیں نہ حجاب یہ ہے کہ عورت کو گھر کے کسی کونے میں بند کردیا جائے جہاں سے نکلنے کی اسے اجازت ہی نہ ہو بلکہ حجاب دراصل یہ ہے کہ عورت باعزت طریقے سے خود کو ڈھانپے۔ باوقار اور لباس پہنے اور اپنی عزت خود کرائے اپنی زینت اور زیب وآرائش کو غیر محرموں سے چھپائے۔
ارم وڑائچ......شادیوال، گجرات

تلخ حقائق

۞ اس دنیا میں انسان ہر چیز کے پیچھے بھاگتا ہے مگر دو چیزیں خود انسان کا پیچھا کریں گی ایک اس کا رزق اور دوسرا اس کی موت۔
۞ انسان گناہ کرنے سے جہنم میں نہیں جاتا بلکہ گناہ کرنے کے بعد مطمئن رہنے اور توبہ نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے۔
۞ میں دنیا کو اپنی جوتوں کی نوک پر رکھتا ہوں۔
فائقہ سکندر حیات......لنگڑیال

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

مرے محروم جذبوں کی بتا کب سروری ہوگی
مری فصلِ تمنا اے مسیحا کب ہری ہوگی
کبھی دامن نہ چھوٹے صبر کا تکلیف میں یارو
یہ میرے رب کی حکمت ہے اسی میں بہتری ہوگی
مری تنہائی پر روتی ہے جاناں دشت کی وحشت
تمھارے واسطے یہ بات لیکن سرسری ہوگی
بہت مغموم ہوں ٹھکرا کے پردہ دار بی بی کو
مجھے کیا علم تھا پردے کے پیچھے گل پری ہوگی
ہوس کی اشتہا میں پل پڑے معصوم پر وحشی
مگر پھر بھی عزازیلوں کی نیت کب بھری ہوگی
بہت ہی کم ہے یہ اُجرت مرے ہاتھوں کے چھالوں کی
اگر کچھ دام بڑھ جائیں تو بندہ پروری ہوگی
جو دیکھا حضرتِ اقبال نے اک خوبصورت خواب
کسے معلوم تھا تعبیر کی عصمت دری ہوگی
رقیبوں کے جو چہرے لال پیلے ہوگئے سن کر
یقیناً بات میرے حق میں کی تم نے کھری ہوگی
اے مالک یہ بتا مجھ سے گنہ گاروں کا کیا ہوگا
سنا ہے نیک لوگوں سے تری جنت بھری ہوگی
تقابل مت کرو اپنے غموں کا میری آہوں سے
مرے اشعار تولو گے تو میری برتری ہوگی
ہے یہ معمول کا قصہ کہ میرے دل سے تشنہ جی
تعفن اُٹھ رہا ہے جو کوئی خواہش مَری ہوگی

عامر شہزاد تشنہ...... یو ایس اے

غزل

خطراتِ سفر اور نہ ہی حالات کا ڈر ہے
جس دن سے چلی ہوں مری منزل پہ نظر ہے
ہے کس میں یہ طاقت کوئی جرثومہ بنادے
کل دہر مرے رب کی فقط ''کن'' کا اثر ہے
اے گردشِ ایام نہ ٹوٹی نہ جھکوں گی
پختہ یہ مرا حوصلہ ہی میری سپر ہے
مت چھیڑ مجھے خود کو ابھی ڈھونڈ رہی ہوں
چلنا مرا اوروں سے یہ اندازِ دگر ہے
گھبرا نہ اندھیروں سے نہ مایوس ہو اے دل
انجام اندھیروں کا نئی ایک سحر ہے
ہوں فاختہ اک مشت سہی پر مرے لیکن
پرواز مری حدِ افق پار اِدھر ہے
گرداب سا پیروں میں لیے پھرتی ہوں مینا
دن رات مسلسل یہی اندازِ سفر ہے

ذکیہ شیخ مینا......

غزل

سرسری سی بات کا
کیا مزا ہے رات کا؟
ڈھل گیا ہے دھوپ سے
جسم پات پات کا
فقر نے عطا کیا
علم شش جہات کا
پڑ گیا ہے کان میں
شور ممکنات کا
موت نے مجھے دیا
راستہ حیات کا
غیب سے عطا ہوا
شعر مجھ کو نعت کا
کوستا ہے خود کو آب
آج تک فرات کا
زندگی سے کم نہیں
لمس تیرے ہات کا

مبشر سعید......

غزل

سیلاب کو اِک ہائے کا سایا ہی بہت تھا
بستی نے تیری مجھ کو رُلایا ہی بہت تھا
ویراں ہوئے آہ کے اثرات سے مسکن
لوگوں نے مجھے مل کے ستایا ہی بہت تھا
ہونا تھا کبھی روز ہمیں یوں بھی تو پسپا
پلکوں پہ تجھے ہم نے بٹھایا ہی بہت تھا

اِک روز تو ملنا تھا جفاکش کو صلہ بھی
پیغام وفا ہم نے سنایا ہی بہت تھا
گرنا تھا کسی روز بلندی سے ہمیں بھی
خوابوں کا نشہ آنکھ پہ چھایا ہی بہت تھا
خندہ جو میں دیتی بھی تو پھر قرض کہاں تک
ان دوستوں پہ پہلے بقایا ہی بہت تھا
فرخندہ رضوی...... برطانیہ

غزل

یہ بھی اچھا ہے تم نہیں سمجھے
آسماں کو فقط زمیں سمجھے
میں سمجھتی تھی تم سمجھتے ہو
اور تم کچھ بھی تو نہیں سمجھے
لوگ پتھر اُسے سمجھتے ہیں
آستاں بس مری جبیں سمجھے
صاف آتا ہے سب نظر مجھ کو
تم جہاں تھے تمہیں وہیں سمجھے
کتنی مدت سے تھا سنبھالا ہوا
ایک پتھر کو ہم نگیں سمجھے
کتنی آسان تھی مگر دلشاد
لوگ جا کر مجھے کہیں سمجھے
دلشاد نسیم......

غزل

دل کی اک اک کنی بجھاتی ہوں
رات بھر روشنی بجھاتی ہوں
شاید آج آئے وہ مجھے ملنے
صحن میں چاندنی بچھاتی ہوں
دیکھیے ڈوبتا ہوا سورج
بیٹھیے اوڑھنی بچھاتی ہوں
اوڑھ لیتی ہوں ہجر، بستر پر
اپنی خستہ تنی بچھاتی ہوں
خود تو رہتی ہوں دھوپ میں جاناں
اس پہ چھاؤں گھنی بچھاتی ہوں
جاناں ملک......راولپنڈی

ہجر

دشتِ ویراں میں ہجر کے مارے ہوئے
عشق کے آغاز میں خوشبو کی طرح ہوتے ہیں
جس پہ بس چلتا ہے اسے مار کے رکھ دیتا ہے
عشق کا وار بھی جاناں جادو کی طرح ہوتا ہے
جس پہ یہ وار اک بار چل جائے
کب پھر رہائی پاتا ہے
پھر کہاں اپنے بس میں اختیار ہوتا ہے
رات ہوتی ہے تو جگنو کی طرح جگتے ہیں
ان نگاہوں میں کبھی ڈوب کے دیکھا جائے
جن کا ہر وار زندگی کی طرح ہوتا ہے
اشک پیتے ہوئے یہ یاد آیا مجھے جاناں
تیرے لمس کا ذائقہ بھی آنسو کی طرح ہے
انابیہ رحمٰن......ڈیرہ غازی خان

غزل

لاکھ اس دل کو ہم نے سمجھایا
یہ مگر پیار سے نہ باز آیا
جوش، جذبہ، جنون و جی داری
بس یہی ہے ہمارا سرمایہ
تیر و تلوار بے اثر ٹھہرے
تیرے طعنوں نے دل کو زخمایا
عشق کی راہ میں لہو میرا
ہر نئے امتحاں نے گرمایا
تیری یادوں نے آبیاری کی
گلشنِ فکر جب بھی مرجھایا
آس دل کو دلا کے فردا کی
ہم نے دل کو یوں آج بہلایا
راہِ حق میں جو ڈٹ گئے عاکف!
رحمتِ حق کا ان پہ ہے سایہ
عاکف غنی......فرانس

غزل

چونچ میں پانی بھر کر لایا جاسکتا ہے
چڑیا جتنا قرض چکایا جاسکتا ہے
یادوں میں محفوظ اگر ہو گاتا لمحہ
بھولا بسرا گیت سنایا جاسکتا ہے
دل میں گر احساس و عزم کی لو ہو باقی
خود سے کیا ہر عہد نبھایا جاسکتا ہے

دردِ دل کو نوکِ قلم سے لکھ دینے سے
دل کا تو کچھ بوجھ اٹھایا جاسکتا ہے
موسمِ گل کی آمد ہے اور پھول کھلے ہیں
اِن پھولوں سے گھر مہکایا جاسکتا ہے
شام کا سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے گل
صبح کا اک رنگ چرایا جا سکتا ہے
سباس گل......رحیم یار خان

غزل

دل دکھایا ہے آشناؤں نے
جسم جھلسا دیا ہے چھاؤں نے
خود بھنور نے بچایا کشتی کو
ہاتھ چھوڑا جو ناخداؤں نے
آزمایا وفا کے پتلوں کو
بے وفائی سے بے وفاؤں نے
بھول جاتا ہے شہر کی کلفت
وہ سکون بخشا ہے گاؤں نے
قافلے ہم سے دور جا نکلے
ہم کو دھوکا دیا ہے پاؤں نے
مے پرستی سے ہم نے توبہ کی
پھر سے بہکا دیا گھٹاؤں نے
بند ڈبو کے دودھ پر پالا
چھوٹے بچے کو ان کی ماؤں نے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

نظم

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے
اک بارہ تیرہ سالہ چہرہ
جھانکا
وہ چہرہ
بہار کے پھولوں کے طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف
لیکن اس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور
ان لکیروں میں
برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی
اس کے ہاتھ
اس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے
شاعر: محسن نقوی
انتخاب: ملک جواد نواز......ڈی آئی خان

نظم

بالآخر میں نے جلا دیے تیرے خط
پانی میں بہا دیے تیرے خط
گونج گونج کے فریاد کناں ہوتے تھے
اک شب سلا دیے تیرے خط
شاعر: محمد فرقان رومان......چکوال

محبت

کسی حرف
کسی رنگ
کسی اظہار
کی محتاج نہیں
محبت
بس محبت ہے
جو خود ہی ہو جاتی ہے
اور
کھل کر سامنے آ جاتی ہے
اقرا جٹ......منچن آباد

غزل

برسوں سے تیرے شہر سے گزرا نہیں ہوں میں
لیکن تیرے خیال سے بچھڑا نہیں ہوں میں
مجھ کو قدم قدم پر ملی ہار کی سوغات
یہ میرا حوصلہ ہے کہ ٹوٹا نہیں ہوں میں
دیتا ہوں میں جہاں کو محبت کی روشنی
نفرت کی آندھیوں میں بجھتا نہیں ہوں میں
میرا ہے آسماں کی وسعت سے واسطہ
دھرتی کی پستیوں میں گرتا نہیں ہوں میں
شبنم کو دیکھنا ہے تو دل کی نظر سے دیکھ
میں ایک تلخ سچ ہوں دھوکہ نہیں ہوں میں
شاعرہ: شبنم اعوان
انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

سفر یادوں کا دل سے بھلایا نہیں جاتا
دکھ اپنا کسی کو پھر سنایا نہیں جاتا
جا کے پھر کوئی آتا نہیں ہے زمانے میں
اندھیری راہوں میں یوں چراغ جلایا نہیں جاتا
گریزی تھے جو میری وفاؤں سے یوں بھی
بند آنکھوں میں پھر خواب سجایا نہیں جاتا
شام کے گہرے سائے تھے ساتھ تیرا کوئی نہیں
داغ دل سے یوں چاہتوں کا مٹایا نہیں جاتا
کھو کے کسی کو زندگی پھر دشوار ہو گئی جاوید
ہنسی ہنسی کے یوں دل کسی سے لگایا نہیں جاتا

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

قطعہ

ایک لمحے کو تیرا یاد آنا
زندگی کو حسین کر جانا
سامنے دیکھ کر تجھے یکدم
وہ ہمارا خوشی سے مر جانا

راؤ تہذیب حسین تہذیب......رحیم یار خان

غزل

ہم اپنے خوابوں کا رستہ تلاش کرتے ہیں
غموں کی دھوپ میں سایہ تلاش کرتے ہیں
ہم اپنے آپ کو جب ڈھونڈنے نکلتے ہیں
دل و نظر میں ارادہ تلاش کرتے ہیں
کہاں ملے گی گلابوں کی سر زمیں ہم کو
چمن کو چھوڑیے صحرا تلاش کرتے ہیں
عجب ارادے عجب مستقل مزاجی ہے
ہر ایک موج میں دریا تلاش کرتے ہیں
وہ چشم حور وہ رخسار و لب وہ زلفیں دراز
وہی حسین سراپا تلاش کرتے ہیں
زمانہ سمجھے گا نیر نہ دل کی مجبوری
کہ اپنے جیسا ہی تنہا تلاش کرتے ہیں

نیر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

غزل

میں اب خود کو بدلنا چاہتا ہوں
انا کا سر کچلنا چاہتا ہوں
محبت اک اذیت بن گئی ہے
اذیت سے نکلنا چاہتا ہوں
کسی گہرے سمندر میں ہوں غرقاں
میں اب اوپر ابھرنا چاہتا ہوں
زمیں والوں سے عاجز آگیا ہوں
زمیں والوں سے لڑنا چاہتا ہوں
گناہوں کا بہت ہے بوجھ مجھ پر
اسد میں اب سنبھلنا چاہتا ہوں

علی اسد لاشاری

حق کی ابتدا

محبت عشق کا کلمہ
محبت دل کا سجدہ ہے
محبت رمز ہے دل کی
یہ حق کی ابتداء ہے
بنیں رہبر ہوائیں بھی
جہاں پرواز ہو اس کی
سمجھ لے یہ حقیقت ہے
دعا بھی ہے دوا بھی ہے
ہاں جینے کی وجہ بھی ہے
بہاروں جیسی کھلتی ہے
گلابوں سی مہکتی ہے
یہ خوشبو، تتلی، اَمبر سی
گگن سے چھلکے بارش سی
دکھی دل کی بنے راحت
محبت ہی عبادت ہے
ریاضت ہے صداقت ہے
یہ حق کی سچی منزل ہے
خدا کے گھر کی واحد لو
یہ دل کی شمع جیسی ہے

صائمہ جبین مہک......

مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر 13

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بد معاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر...... وہ کسی کا مرید ہوگیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بد معاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی





دھوپ کی تپش نے اس کے خال وخد میں حدت جگا رکھی تھی۔ کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔کل سے اب تک وہ بھوکا بھی تھا اور پیاسا بھی لیکن اسے کس تکلیف یا ضرورت کا احساس نہیں تھا۔اس کے پردہ تصور پر کبھی شبیرے کا خون آلودہ سینہ ابھر آتا تھا تو کبھی فرش پر تڑپتا پھڑکتا مراد کا وجود۔اسے یقین تھا کہ جعفر کا انجام بھی شبیرے اور مراد سے مختلف نہیں ہوا ہوگا۔ان تینوں کے ساتھ ساتھ حجاب کا تصور بھی بار بار اپنی جھلک دکھاتا تھا۔رہ رہ کر اس کے ذہن کو زخماتا تھا۔دل میں ایک ناقابل بیان ٹیس جگاتا تھا۔

کچھ دیر مزید گزری ہوگی کہ باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی پھر ہارن بجایا گیا۔تاش کی بازی میں مصروف تینوں افراد چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ایک رائفل سنبھالتا ہوا تیزی سے کمروں کی طرف لپکا۔دوسرا فوراً اس پھاٹک کی طرف بڑھا جو لکڑی کے چوکھٹے پر لوہے کی چادر ٹھونک کر بنایا گیا تھا۔تیسرا چارپائی سے اٹھ کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

پھاٹک کھلا تو آگے پیچھے تین گاڑیاں صحن میں داخل ہو آئیں۔ایک جیپ تھی۔ایک نئے ماڈل کی چمچماتی کار اور تیسری ایک پجارو تھی۔تینوں گاڑیاں ایک طرف رکیں، انکے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازوں پر مرشد نے نظریں گھما کر دیکھا۔رانا سرفراز کو اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔اس نے ہلکے آسمانی کی رنگ کی شلوار قمیض پر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔دوسرے بتیس پینتیس سالہ شخص کے وجود پر سفید بوسکی کی دھوتی اور کرتا تھا۔بھاری اور چوڑے چہرے پر رعونت اور درشتی کے تاثرات جیسے ثبت تھے۔اس کے نقوش اور حلیے سے مرشد کو خیال آیا کہ اب سے پہلے وہ اس شخص کا غائبانہ ذکر سنتا رہا ہے اور اسکے باپ سے مل چکا ہے۔وہ یقیناً چوہدری اکبر کا پتر فرزند علی ہی تھا۔ اسکے چہرے مہرے میں باپ کی جھلک دیکھی جاسکتی تھی۔ تیسرا شخص ایک سڈول اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔اس نے جینز کی پینٹ پر دھاری دار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگر تھے۔چال میں غیر محسوس سی لنگڑاہٹ، جبڑے کی ہڈیاں قدرے باہر کو نکلی ہوئیں، سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور ایک دو روز کی بڑھی ہوئی شیو۔ان تین افراد کے عقب میں چھ سات افراد اور تھے اور وہ سبھی مسلح تھے۔پھر وہ تو گاڑیوں کے قریب ہی ٹھہر گئے جبکہ باقی تینوں افراد آگے بڑھ آئے۔اسی وقت ایک کمرے سے ملنگی بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکلا، وہ کالی شلوار اور بنیان میں تھا۔واضح نظر آرہا تھا کہ وہ ابھی نیند سے جاگا ہے۔

''کس نسل کا کتا ہے یہ؟''

چوہدری فرزند نے رانا سرفراز کو مخاطب کیا۔وہ تینوں مرشد کے سامنے آرکے تھے۔

''آوارہ نسل کا ہے۔ ہیرا منڈی کی گلیوں ،نالیوں میں منہ مارتا پھرتا رہا ہے۔ملنگی پٹا ڈال کر گھسیٹ لایا۔''

''پکی بات ہے ناکہ وہی ہے یہ؟''

''ایک دم پکی ہے چوہدری صاحب!اس کے ساتھ دو تین کتورے اور بھی تھے۔وہ کتوں ہی کی موت مارے گئے''

ملنگی اطمینان سے کہتا ہوا ہینڈ پمپ کی طرف بڑھ گیا۔ مرشد کے کلیجے پر ضرب پڑی۔اس کی آنکھوں کے سامنے مراد،جعفر اور شبیرے کے چہرے گھوم گئے۔

''بہت پریشان کیا ہے اس کتے نے۔اسے گھسیٹ کر لاؤ ذرا اندر۔''

چوہدری اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ جب کہ وہ جینز پوش آدمی اپنے بائیں پاؤں پر وزن بڑھاتا ہوا مرشد کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔اس نے دائیں ہاتھ میں مرشد کی ٹھوڑی دبوچی اور اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''تجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی مرشد یاؤ! پتا ہے کیا غلطی ہوئی ہے..... یہ کہ تو زندہ ہے۔ تجھے اب تک مر جانا چاہئے تھا۔مر گیا ہوتا تو اچھا رہتا۔''

اس کی آواز سے مرشد نے اسے بھی پہچان لیا۔یہ ملنگی کا ساتھی، فوجی تھا۔مرشد بغیر کچھ کہے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔چند لمحے بعد فوجی اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے پلٹ کر کسی کو آواز دی تو دو رائفل بردار فوراً آگے بڑھ آئے۔

''اس کی زنجیر کھولو اور اندر لے چلو۔''

فوجی کی ہدایت پر وہ دونوں مرشد کے قریب چلے

آئے۔ان میں سے ایک تو کل تھانے میں ملنگی کے ساتھ بھی موجود تھا، جبکہ دوسرے مکروہ صورت رائفل بردار کی صورت اس کے لئے نظر آشنا نہیں تھی۔اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور ایک آنکھ کے ڈیلے کی جگہ نیلگوں سفید پتھر دکھائی دے رہا تھا، جو اس کے چہرے کی خوف ناکی میں اضافہ کرتا تھا۔

ان میں سے ایک نے کھونٹے کے ساتھ بندھی زنجیر کھولی، پھر دونوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور گھسیٹتے ہوئے اندر ایک کمرے میں لے آئے۔یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا۔یہاں تین چارپائیوں کے علاوہ ایک دیوار کے ساتھ تین چار کرسیاں بھی دھری تھیں۔ایک کونے میں غالباً گندم بھری بوریوں کی داکیں لگی ہوئی تھیں اور کمرے میں گندم کی مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔چارپائیوں کے دائیں بائیں دو فرشی پنکھے رکھے ہوئے تھے اور دونوں ہوا دے رہے تھے۔فرزند علی اور رانا سرفراز برابر پڑی دو الگ الگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔دونوں رائفل برداروں نے مرشد کو چوہدری فرزند کے سامنے لا ڈالا اور خود چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔فوجی دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔مرشد کہنی زمین پر رکاتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا تو رانا چوہدری فرزند سے مخاطب ہوا۔

''دیکھ لیں چوہدری صاحب! میں نے کہا تھا نا کہ چند ہی روز میں یہ آپ کے قدموں میں پڑا ہوگا......میں نے اپنا کہا پورا کر دیا، آپ نے بے وجہ ہی اسے توپ چیز سمجھ رکھا تھا۔''

میں نے کچھ نہیں سمجھ رکھا تھا......ابا اب بوڑھا ہو چکا ہے، ایسے بے بات ہاتھ پیر پھولنے لگ جاتے ہیں اس کے، اسی کی حیا میں خود سامنے نہیں آیا، ورنہ اس کو تو ہیرا منڈی کی گلیوں میں ہی گھسیٹ گھسیٹ کر کتے کی موت مار دیتا۔'' چوہدری کے لہجے میں شدید نفرت اور حقارت تھی۔ پھر وہ مرشد کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیوں اوئے! کون سا کیڑا تھا جس نے تجھے سکون سے جینے نہیں دیا۔اپنی اوقات سے بڑی جگہ پنگا لیتے ہوئے ڈر بھی نہیں لگا تجھے......زندگی سے اتنا ہی تنگ تھا تو کسی اچھے طریقے سے خودکشی کر لیتا، یوں......(ناقابل اشاعت)......کی کیا لوڑ تھی؟''

چوہدری نے اپنے اندر کی غلاظت اگلتے ہوئے کہا۔مرشد خاموش رہا۔بس چوہدری کی آنکھوں میں دیکھتا گیا۔اسے اندازہ تھا کہ یہ لوگ اس کے متعلق کیا فیصلہ کئے بیٹھے ہیں۔رات جس دیدہ دلیری اور سفاکی سے اس کے سامنے، اس کے ساتھیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا، اس سب کے بعد یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ اسے زندہ چھوڑنے کی حماقت کرتے۔وہاں......پولیس اسٹیشن میں اس کے ساتھیوں کے قتل کے حوالے سے جو بھی کہانی گھڑی گئی ہو، اسے یوں بے بس کر کے یہاں لے آنے میں ان لوگوں کا مقصد یقینی طور پر یہی تھا کہ اسے خوب اذیتیں دے دے کر ایک ذلت آمیز موت سے دوچار کیا جائے۔

مرشد کو موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔بس دل میں ایک خواہش تھی کہ اگر کسی طرح، کچھ دیر کیلئے اس کے ہاتھوں پیروں کی بندشیں کھل جائیں تو کم از کم مرنے سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کی دردناک موت کا بدلہ لیتے ہوئے، ان میں سے دو چار کو تو اپنے ساتھ لے مرے۔خصوصاً حجاب سرکار کے اس بدترین دشمن کو جو اس وقت بالکل اس کے سامنے موجود تھا۔

''یہ کہیں گونگا تو نہیں؟'' مرشد کی گہری چپ پر چوہدری فرزند ایک نظر فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جب سے یہ کتے کا پٹا اس کی گردن میں فٹ ہوا ہے تب سے بولتی بند ہے۔اس سے پہلے تک تو کافی بھونکتا رہا ہے۔''

فوجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔چوہدری دوبارہ مرشد کی طرف متوجہ ہوا۔

''ایسے کیا گھور رہا ہے۔کاٹ کھائے گا کیا؟'' اس نے اپنا پاؤں مرشد کے چہرے کے قریب کر دیا۔

''لے......کاٹ لے۔اپنی خواہش پوری کر لے۔'' ساتھ ہی اس نے مرشد کے عقب میں کھڑے رائفل بردار کو مخاطب کیا۔

''حکم داد! اس کے گلے سے پٹا اتار دے۔شاید بے

چارے کو منہ کھولنے میں مشکل ہو رہی ہے۔"

"جی چوہدری صیب!" حکم داد نے فوراً چوہدری کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پٹا کھول کر مرشد کی گردن سے علیحدہ کردیا۔

"لے بھئی! اب سہولت سے کاٹ لے۔" چوہدری نے اپنا پاؤں مرشد کے بائیں کندھے پر رکھ دیا۔ اس کے پیروں میں براؤن کلر کی بھاری کھیڑی تھی جو مرشد کے گال کو چھونے لگی تھی۔

"سرکار کہاں ہیں چوہدری؟"

مرشد کے ہونٹوں کو پہلی بار جنبش ہوئی تو زبان پر حجاب بی بی ہی کے حوالے سے سوال آیا۔ دل نے اسی کے متعلق جاننا چاہا تھا۔

چوہدری فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولا۔

"تو نے ٹھیک کہا تھا۔ پٹا کھلتے ہی بند بولتی بھی کھل گئی۔" پھر وہ مرشد سے سوال انداز ہوا۔

"کس سرکار کی بات کر رہا ہے تو..... کون سرکار؟"

"سید صلاح الدین سرکار کی صاحب زادی، حجاب سرکار کہاں ہیں؟"

چوہدری اس کے کندھے سے پاؤں ہٹاتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔ اسی وقت ملنگی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازے کے ساتھ موجود کیل پر سے قمیض اتاری اور تیسری چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

"صلاح الدین سرکار..... حجاب سرکار! ماں کی...... تیری سرکاروں کی، ساتھ تجھ دلے کی بھی۔ تو......"

"چوہدری......" مرشد کی گرج دار دھاڑ اتنی بلند اور دہشت ناک تھی کہ چوہدری اپنا جملہ بھول گیا۔

"اپنی زبان کو لگام ڈال، سوچ سمجھ کر بول"

سید سرکاروں کے متعلق چوہدری کے منہ سے گالی سن کر مرشد کے خون نے اچھالا مارا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہ ہوتے تو ان لمحوں وہ ہر خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے چوہدری کا ٹینٹوا دبوچتا اور اس کے حلق سے زبان کھینچ کر اکھاڑ لیتا۔ اس کے چہرہ تمتا اٹھا تھا اور آنکھوں میں آتشیں سرخی اتر آئی تھی۔

اس کے عقب میں کھڑے چوہدری فرزند کے خاص گرگے حکم داد نے اچانک اس کی کمر میں لات رسید کی تو وہ منہ کے بل چوہدری کے قدموں میں گر گیا۔

"چوہدری فرزند علی پر بھونکتا ہے...... تیری اس کنجری ماں نے تجھے ذرا بھی تمیز نہیں سکھائی۔ تجھے بتایا نہیں ہم لوگوں کے متعلق..... میرے متعلق، میرے باپ کے متعلق؟"

چوہدری نے اپنی کھیڑی سے اس کی گردن پر ٹھوکر ماری تو وہ فرش پر پلٹیاں کھاتا ہوا اس سے دو قدم دور ہٹ کر دوبارہ کہنی کی مدد سے اٹھ بیٹھا۔

"کسی نے کیا بتانا تھا چوہدری!"

مرشد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔

"میں خود جانتا ہوں کہ تو ہیجڑوں کے خانوادے سے تعلق رکھتا ہے...... تم سب حرام زادے ایک ٹکے کا کلیجہ نہیں رکھتے اتنے لوگ ہو کر بھی اپنی بہنوں کے اس یار کے ہاتھ پیر باندھ کر اپنے آپ میں شیر بنے بیٹھے ہو۔ دم کٹے کتے ہو تم سب..... گیدڑ کی اولادیں ہو۔"

اس نے باقاعدہ چوہدری پر تھوک دیا۔ اس کا تھوک چوہدری کی قمیض پر گرا تو چوہدری لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سوائے ملنگی کے، کمرے میں موجود سبھی افراد کے چہرے تمتا اٹھے تھے۔ حکم داد نے تو باقاعدہ اس کی طرف رائفل سیدھی کرلی تھی۔

اس کے وجود کو چھلنی کردینے کے لئے وہ اپنے چوہدری کے ایک ادنیٰ سے اشارے کا منتظر تھا، لیکن چوہدری نے اس کو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ اس نے خود آگے بڑھ کر مرشد کے چہرے پر ٹھوکر رسید کی، مرشد پہلو کے بل گرا اور چوہدری نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

"تو ایک کنجری کا کنجر کتا ہے...... کتے ہی کی موت مرے گا تو۔"

مرشد ٹھوکروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا

ہیجڑے کا پتر، ہیجڑا چوہدری..... ہاتھ پیر کھول میرے ..... تیری...... تیری چوہدراہٹ تیرے پچھواڑے سے

نہ نکال دی تو...... تو مرشد نام نہیں، مرشد کا۔“

چوہدری پر کچھ مزید وحشت سوار ہوگئی۔ وہ اندھا دھند مرشد کو ٹھڈے مارنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ مرشد تھا تو اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ ہونٹوں کے علاوہ اس کے رخسار کی ہڈی پر سے بھی کھال پھٹ گئی تھی۔ چوہدری کی ٹھوکریں بہت وحشیانہ تھیں ۔یہ مرشد کی غیر معمولی قوت برداشت ہی تھی جو وہ برابر ہنس رہا تھا اور چوہدری فرزند پر جملے بھی کس رہا تھا۔

”او کتے کی شکل والے گیدڑ! میرے ہاتھ پیر کھلوا ...... مرد کی اولاد ہے تو..... اپنی ماں کے یار کے ہاتھ پاؤں کھول ایک بار..... سالے ہجڑے چوہدری!“

کمرے میں موجود بھی افراد کے چہروں پر تناؤ پھیلا ہوا تھا۔ صرف ایک ملنگی تھا جو پرسکون بیٹھا تھا، بلکہ اس کے زیر لب ایک خفیف سی مسکراہٹ بھی موجود تھی۔ چند ہی منٹ میں چوہدری بری طرح ہانپ گیا۔ مرشد بھی قدرے نڈھال ہوگیا۔

چوہدری نے آگے بڑھ کر حکم داد کے ہاتھوں سے رائفل جھپٹ لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ پورا میگزین مرشد پر خالی کردے۔ رائفل جھپٹ کر وہ مرشد کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ملنگی اپنی جگہ سے اٹھا، اور کسی چیتے کی طرح زقند بھرتا ہوا چوہدری کے سامنے پہنچ گیا۔ رائفل اس نے مضبوطی سے تھام لی تھی۔

”نہیں چوہدری صاحب! یہ کام نہیں کرنا۔“

”ملنگی تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں ..... میں اس ..... (ناقابل اشاعت)..... کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”بالکل نہیں...... آپ اسکے ساتھ جو مرضی سلوک کریں، مگر اس کی جان نہیں لیں گے آپ!“

”میں کہہ رہا ہوں ہٹ جا تو..... رائفل چھوڑ“

چوہدری کسی بھیڑیئے کی طرح غرایا۔ وہ پورا زور لگا رہا تھا کہ رائفل ملنگی کی گرفت سے چھڑا لے، لیکن ملنگی کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔ حکم داد غصیلے انداز میں ملنگی کی طرف بڑھا تو ملنگی کے ساتھی نے اس کی طرف رائفل سیدھی کرلی۔

”تو رک جا حکم داد!“

رانا سرفراز اور فوجی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ صورت حال اچانک ہی رخ تبدیل کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے..... رک جاؤ۔“ رانا سرفراز فوراً آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے حکم داد اور ملنگی کے ساتھی کو کوئی بھی کروائی کرنے سے روکا تھا۔

”ملنگی! یہ کیا کررہے ہو تم! پیچھے ہٹ جاؤ“

”نہیں رانا صاحب! یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ ہمارے درمیان پہلے طے ہوا تھا کہ اس کا فیصلہ ہم لوگ خود کریں گے۔“

اس کا اشارہ مرشد کی طرف تھا جو کمرے کے بیچ فرش پر نڈھال پڑا تھا۔

”معاہدہ گیا بھاڑ میں۔ اس حرام کے جنے کو میں چھاننی کر کے چھوڑوں گا یہ...... چوہدری فرزند علی پر بھونک رہا ہے۔ میں اس کے منہ میں برسٹ ماروں گا۔ رائفل چھوڑ تو“

”چوہدری صاحب! خود کو سنبھالیں۔ اپنے غصے پر تھوڑا قابو پائیں“

رانا سرفراز نے چوہدری کے کندھے پر ہاتھ رکھا، فوجی بھی آگے بڑھ آیا۔

”چوہدری صاحب! یہ حرامی آپ کو جان بوجھ کر غصہ دلا رہا ہے تاکہ آپ اسے گولی مار کر اس کی مشکل آسان کر دیں۔ آپ خود ہی ایک ذرا سوچیں۔ اتنی آسان موت مار دینا چاہیئے کیا اسے؟“ فوجی کی بات کسی حد تک چوہدری کے دماغ کو لگی۔ چند لمحے کے لئے وہ خاموش ہوگیا۔ رانا سرفراز نے فوراً فوجی کی تائید کی۔

”فوجی ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری صاحب! تھوڑا تحمل سے سوچئے...... اسے اتنی جلدی اور اتنی آسان موت مت مارنا ہے کیا؟“ رائفل پر چوہدری کی گرفت ایک ذرا ڈھیلی ہوئی تو ملنگی نے رائفل اس کے ہاتھوں سے کھینچ لی ۔چوہدری چند لمحے اپنی جگہ کھڑا خون خوار نظروں سے مرشد کو گھورتا رہا۔ اس کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھا اور پہلو کے رخ پڑے مرشد کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بے دردی سے مرشد کے بال مٹھی میں

دبوچے اور زہریلے لہجے میں غرایا۔
"کس غلط فہمی میں مت رہنا تو! مرنا تو ہے تجھے، لیکن اتنی جلدی اور اتنی آسان موت تجھے واقعی نہیں مرنا چاہئے۔ تڑپ تڑپ کر مرے گا تو اور تیری لاش بھی اس ڈیرے سے باہر نہیں جائے گی ..... یہاں کے کتے تیرا مردہ کھائیں گے۔" چوہدری نے انتہائی نفرت سے اس کے خون آلودہ چہرے پر تھوکا اور اٹھ کر دو تین ٹھوکریں مزید اس کی کمر اور پسلیوں میں رسید کردیں۔
"پانی پلاؤ حکم داد!"
چوہدری نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا تو حکم داد فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ رانا سرفراز نے چوہدری کا بازو پکڑ کر اسے واپس چارپائی پر بیٹھادیا۔
"اس دلے پر لعنت بھیجیں چوہدری صاحب! اس کا عبرت ناک انجام تو ملنگی اور فوجی کے ہاتھوں طے ہو چکا ہے۔ آپ اس بڑے کنجر کا سوچیں، اس کا اب کیا کرنا ہے؟"
پتا نہیں رانا کس کی بات کر رہا تھا..... فوجی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ملنگی دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں مرشد کا جائزہ لے رہی تھیں جو فرش پر سر رکھے بے دم سا پڑا تھا۔
"وہ کتے کا پلا اب ہے کدھر؟" چوہدری پھنکارا۔
"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس فون پر ہی دو بار بات ہوئی ہے۔ آج صبح بھی رابطہ ہوا تھا..... وہی ڈیمانڈ ہے اس کی۔"
رانا کی بات سن کر چوہدری نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں ایک موٹی سی گالی نکالی۔
"اس کو بھی موقعے ہی پر پار کر دینا چاہئے تھا۔ بھروسہ کر کے غلطی کی ..... کوئی "سُو" نکالو کسی طرح اس..... (ناقابل اشاعت)... کی!"
"کوشش تو کی ہے مگر آپ جانتے ہو، بہت کایاں بندہ ہے..... گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا ہے۔"
اسی وقت حکم داد ایک جستی جگ گلاس اٹھائے اندر داخل ہوا۔
"اڑن طشتری میں بیٹھ کر آسمانوں کو تو نہیں اڑ گیا..... ہے تو اسی زمین پر، اسی علاقے میں کہیں۔ کوشش کرو گے تو کھرا ابھی مل ہی جائے گا۔ اس کے بعد اٹھوا لو اس..... کو بھی۔ کھال میں بھس بھروا کر، پچھواڑے میں ڈنڈا دے کر کھیتوں میں کھڑا کر دیں گے۔"
حکم داد نے پانی ڈال کر دیا تو چوہدری نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر منہ کو لگا لیا۔ رانا سرفراز مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔
"اس معاملے کو بڑے تحمل اور سمجھ داری سے دیکھنا پڑے گا چوہدری صاحب! جذباتی ہو کر جوش اور غصے سے کام لیا تو سارے کا سارا معاملہ بگڑ جائے گا..... ساری کہانی الٹی پڑ سکتی ہے۔"
"تو پہلے کون سی سیدھی پڑی ہوئی ہے۔ سب کچھ تو پروگرام کے الٹ ہوا ہے۔" چوہدری نے خالی گلاس حکم داد کو تھمایا تو وہ مودبانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔
"نہیں چوہدری صاحب! سب کچھ تو الٹ نہیں ہے..... یہ حرامی تو ہتھے چڑھ ہی گیا ہے ہمارے..... اس کا کانٹا تو نکل چکا نا!"
چوہدری نے زہر ناک نظروں سے مرشد کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر حقارت سے اس کی طرف تھوکا۔
"یہ بدنسل، حرام کا پلا میرے ابے کی رکھیل کا انڈہ ہے..... جوانی میں اس کی ماں حسن آرا بڑی قیامت چیز تھی۔ اس کا عشق ابے کے سر چڑھ کر بولتا تھا، لہٰذا اس کی یہاں موجودگی کی خبر ابے تک نہیں پہنچنی چاہئے..... وہ نہ ہو کہ ابے کے عشق کی چنگاری پھر بھڑک اٹھے..... تڑپا تڑپا اور سسکا سسکا کر مارنا ہے اس کتے کے تخم کو۔"
مرشد نے سر کو حرکت دیتے ہوئے نفرت بھری نگاہوں سے چوہدری فرزند کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں، چوہدری براہ راست اس سے مخاطب ہوا۔
"میری بات لگتا ہے بہت بری لگی ہے تجھے..... شاید تیری اس کنجری ماں نے تجھے بتایا نہیں کہ اس کی میرے باپ سے کتنی پرانی آشنائی ہے۔ جوانی کی کئی راتیں میرے باپ کی گود میں گزاری ہیں اس نے..... وہ تو پھر کسی اور حرام زادے کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ اس کے

بعد میرے باپ نے اس کے منہ پر تھوک دیا...... خارش زدہ کتیا والا سلوک کیا تھا تیری ماں کے ساتھ میرے ابے نے...... وہ چھترول کی تھی کہ آج تک یاد کرتی ہوگی۔"

چوہدری کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح مرشد کے کانوں کے رستے اس کے کلیجے تک اتر رہے تھے مگر وہ پوری طرح بے بس اور مجبور تھا۔ بس اس کی زبان آزاد تھی سو وہ زمین پر خون تھوکتے ہوئے بولا۔

"تیرے منہ میں کسی خصی کتے کی زبان ہے۔ تو اکبر علی کا نہیں...... کسی گدھے کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ گدھے کی اولاد ہے تو چوہدری...... نہیں ہے۔ تو میرے ہاتھ پیر کھلوا کر میرے ساتھ دو دو ہاتھ کر، پتا چلے تجھے تیری اصل اوقات کا۔" ایک لمحے کو چوہدری کا چہرہ پھر پوری شدت سے تمتما اٹھا۔ نتھنے پھڑ پھڑائے، یونہی محسوس ہوا کہ وہ پھر سے اٹھ کر مرشد پر پل پڑے گا، لیکن اسی دوران ملنگی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"تیرا منہ تو بلغم کی...... جیسا ہے مرشدے! کچھ نہ کچھ نکالے جا رہا ہے۔ لیکن پتر جی! جو مرضی بکتا رہ، موت تجھے سوکھے سے ملنے والی نہیں۔ تیری ہڈی جتنی ڈھیٹ ہے، اس کا سرمہ بنانے کا اتنا ہی مزہ آئے گا اور اس سے زیادہ مزہ آئے گا وہ سرمہ مجھے اپنی ان نشیلی کٹیلی آنکھوں میں لگانے سے ...... تو روئے گا...... چلائے گا...... اپنی ناک ہمارے جوتوں پر رگڑ رگڑ کر معافیاں مانگے گا۔ موت مانگے گا، لیکن موت تجھے نہیں ملے گی۔"

مرشد ملنگی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا

"میں دیکھ رہا ہوں ملنگن! سب سے زیادہ ڈھیٹ اور کمینی روح تیرے پنڈے میں ہی پھنسی ہوئی ہے۔ اس بے چاری کو میں آزاد کراؤں گا...... تو ایسے ہی مطمئن رہ...... تیرا اطمینان دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے۔ کلیجے میں ٹھنڈی سی پڑ رہی ہے..... ناقابل اشاعت...... انسان!"

"تسلی رکھ پھر...... آج رات تجھے اور ٹھنڈ پڑے گی۔ تیرے کلیجے کو برف کی ڈلی بنا دوں گا میں، میری جان۔" پھر وہ مرشد کے عقب میں موجود اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"گگو! پٹا ڈال اس کے گلے میں اور لے جا کر باندھ دے وہیں...... ٹونی اور ٹمی کی جگہ ہے۔"

یہ ٹونی اور ٹمی کتوں کی اس جوڑی کا نام تھا، جن کے درمیان مرشد کو رات بھر باندھ کر بٹھائے رکھا گیا تھا۔ گگو نے فوراً ملنگی کے فرمان کی تعمیل کی اور پھر وہ اور حکم داد مرشد کو پہلے ہی کی طرح گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔

......☆☆......

بازار حسن کی نائیکاؤں میں سے نزہت بیگم ایسی دھڑلے کی نائیکہ تھی کہ اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا انجام...... اس کی موت یوں بے کسی کی حالت میں واقع ہوگی۔ اتنی درد ناک اور ایسی عذاب ناک ہوگی۔ ایک تو وقت ایسا تھا اور دوسرا صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنے بچاؤ میں کچھ بھی کر سکنے سے قاصر تھی۔ وہ نہ کسی تک کوئی اطلاع پہنچا سکتی تھی اور نہ کسی کو اپنی مدد اور دادرسی کے لئے پکار سکتی تھی۔

چوہدری اکبر علی ماچس میں سے تیلی نکال چکا تھا۔ آتشیں موت کے جھپٹ پڑنے میں محض لمحہ دو لمحہ کا وقفہ تھا کہ کمرے کے دروازے سے ایک تیز اور بارعب آواز نزہت بیگم کی سماعت سے ٹکرائی۔

"رک جاؤ اکبر علی...... خبردار!" آواز شناسا سی تھی۔ بے اختیار نزہت بیگم کی آنکھیں کھل گئیں۔ اکبر علی کو تنبیہ کرنے والے میر ارشد اللہ تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھے اکبر علی تک پہنچے اور اس کا ماچس والا ہاتھ تھام لیا۔ ان کے پیچھے ہی دروازے سے تین چار باوردی پولیس والے بھی اندر گھس آئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب..... کیا پاگل پن ہے یہ؟" میر صاحب کا سرخ و سپید چہرہ ان لمحوں کچھ مزید سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ چوہدری اکبر سے سوال کرتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ سے ماچس چھینی، پھر فوراً پلنگ پر سے ایک پٹرول آلود چادر اٹھا کر فرش پر پڑی حسن آرا کی طرف لپکے۔ ایک پولیس آفیسر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اکبر علی کے سامنے آ رکا۔

"یہ سب آپ ہی کا کیا دھرا ہے نا؟"

چوہدری نے اسے درخور اعتنا ہی نہیں جانا۔ وہ قہر بار

نظروں سے ارشد اللہ کو گھور رہا تھا، جو حسن آرا کے بے ترتیب وجود پر چادر ڈال رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اسے اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔

''ظاہر ہے انسپکٹر! یہ کوئی پوچھنے والی بات تو نہیں۔''

میر صاحب نے ناگوار نظروں سے اکبر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود نزہت بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے، جو اسی جگہ بیٹھی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس کا رنگ یوں ہلدی ہو رہا تھا جیسے پورے وجود کا لہو نچڑ چکا ہو۔ اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ میر صاحب نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ پڑی ایک کرسی پر بیٹھا دیا۔

''تم نے آج پھر میرے رستے میں ٹانگ اڑائی ہے، یہ ٹھیک نہیں کیا۔''

''اور یہ جو تم کرنے جا رہے تھے، یہ تو جیسے بہت ٹھیک تھا''

چوہدری اکبر کے دھمکی آمیز لہجے پر میر صاحب نے انتہائی خشک انداز میں کہا۔

''ہاں! یہ ٹھیک تھا..... زمین کا گندہ بوجھ کم کر دینا چاہئے۔ یہی کر رہا تھا میں...... اور یہ بوجھ تو ختم ہو کر رہنا ہے اب۔ یہ تم یاد رکھنا''

میر صاحب نے پولیس آفیسر کی طرف دیکھا تو وہ فوراً ناگوار سے لہجے میں چوہدری اکبر سے مخاطب ہوا۔

''چوہدری صاحب! خون کو تھوڑا ٹھنڈا رکھیں اور خود کو قانون کی حراست میں سمجھیں۔'' چوہدری نے پرتپش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''خون مرداروں کا ٹھنڈا ہوتا ہے اور...... حراست کیسی؟ کس جرم میں؟''

''آپ دو عورتوں کو زندہ جلانے والے تھے۔ آپ نے انہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا ہے اور...... باہر بھی آپ کے بندوں نے دو آدمیوں کے ساتھ اچھی خاصی مار پیٹ کی ہے؟''

''تھوڑا عقل کو ہتھ مارو انسپکٹر! اپنے منہ میں اپنی زبان ہی ٹھیک رہتی ہے۔ بندہ کبندہ دیکھ کر بات کرنی چاہئے...... تمہارے سامنے کوئی غنڈہ موالی نہیں۔ نندلی پور کا چوہدری اکبر علی خان کھڑا ہے۔ سمجھ آئی؟''

چوہدری کا لہجہ اور انداز کچھ ایسا تحقیر آمیز تھا کہ انسپکٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''آپ کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں آپ کے سامنے آپ کا کوئی کامایا مزارع نہیں کھڑا...... اور کسی علاقے کا چوہدری یا کسی ریاست کا نواب ہونے سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ جیسا جرم چاہے کر گزرے۔ دو انسانوں پر پٹرول چھڑک کے اور انہیں زندہ جلا دے...... ابھی آپ اس کمرے سے باہر جا کر ٹھہریں۔ میں ان خواتین کا بیان لے لوں پھر آپ ہمارے ساتھ تھانے چلیں گے۔''

''یہ کیڑا تم اپنے دماغ سے نکال دو کہ تم چوہدری اکبر کو تھانے لے جاؤ گے۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ میں نے نہیں، ان دو بندوں نے کیا ہے..... میں نے تو موقع پر پہنچ کر ان کنجریوں کی جان بچائی ہے۔''

چوہدری نے اپنے کیے کرائے کا سارا ملبہ فوراً ہی اپنے دونوں کارندوں کے سر ڈال دیا۔ وہ دونوں، چار سپاہیوں کے گھیرے میں کھڑے تھے۔ سپاہی ان کے کندھوں سے رائفلیں اتروا کر قبضے میں لے چکے تھے۔ پھر فوراً ہی چوہدری نے اپنی نفرت بھری نگاہوں سے نزہت بیگم کی طرف دیکھا۔

''کیوں اے بڑی کنجری! بتا..... تجھے میں نے کچھ کہا ہے کیا؟''

نزہت بیگم سے پہلے میر ارشد اللہ بول پڑے۔

''اس ڈرامے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اکبر علی! انسان جو کرے اس کا بوجھ سہارنے کا حوصلہ بھی رکھے۔''

''چوہدری صاحب! ہمیں چرانے کی کوشش مت کریں۔ کمرے سے باہر ٹھہریں آپ...... ہم اچھی طرح جانتے ہیں سب۔''

انسپکٹر بولا تھا۔

''کوئی گواہ ہے...... کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

چوہدری نے اسے آنکھیں دکھائیں تو میر صاحب بول پڑے۔

''گواہ ہم ہیں......انسپکٹر صاحب ! آپ ہماری طرف سے ہی ایف آئی آر درج کریں ۔ہم خود پیروی کریں گے اس کیس کی۔''

میر صاحب کی بات چوہدری کے کلیجے میں خنجر کی طرح لگی۔وہ میر صاحب کو گھورتے ہوئے زخمی سانپ کی طرح پھنکارا۔

''ایک بازاری عورت کے چکر میں اکبر علی کے ساتھ وَیر ڈال رہے ہو ....اپنے باپ اور اپنے ٹبر ،اپنے خاندان کی عزت و شرافت سے دشمنی کر رہے ہو تم ......بہت پچھتاؤ گے اپنے اس فیصلے پر۔''

''ہماری اور ہمارے خاندان کی چھوڑو،تم اپنی فکر کرو اکبر علی! ہم نے خود تمہیں سب کچھ بتایا،تم سے درخواست کی ہم نے اور تم نے الٹا اثر لیا......سب کچھ جانتے بوجھتے آج یہاں ،یہ سب جو تم نے کیا ہے ،اس کے لئے ہم تمہیں ہرگز بھی معاف نہیں کر سکتے۔''

''تم معاف نہیں کر سکتے ....معاف تو تمہیں میں نہیں کروں گا۔تم نے چوہدری اکبر کی محبت پر ڈاکا ڈالا ہے ۔میرے کلیجے میں خنجر واڑا ہے اور اب کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئے۔تمہیں تو اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم نے اصل میں اپنی بدبختی کا انتظام کر لیا ہے۔''چوہدری اکبر کی کینہ پرور آنکھوں میں نفرت اور دشمنی کی آگ سی دہکنے لگی تھی۔

''اپنی دھمکیوں کو بریک لگائیں چوہدری صاحب !اور خود ہی کمرے سے باہر چلے جائیں۔''

ٹھیک ہے.... تجھے بھی دیکھ لوں گا میں۔تیری وردی ہی تیرے پنڈے کیلئے آگ کا شکنجہ نہ بنا دی تو اکبر علی نام نئیں میرا۔''

پولیس آفیسر کی بات پر چوہدری نے درشت لہجے میں اسے بھی دھمکی سے نوازا اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میر صاحب حسن آرا کی طرف متوجہ ہوئے ،وہ ہوش میں تھی اور یک ٹک انہی کی صورت تکے جا رہی تھی۔ان نم آنکھوں میں عجیب والہانہ شوق چمک رہا تھا۔اس کی ناک سے بہنے والے خون کے چند قطرے پٹرول سے ڈھل کر ہونٹوں کے بالائی حصے پر گلابی رنگ کی صورت پھیل چکے تھے اور چہرہ جیسے دہک رہا تھا۔میر صاحب نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

ان کے ہاتھ کا لمس اور لہجے سے چھلکتی محبت آمیز فکر مندی ایک سکون آور توانائی کی صورت حسن آرا نے اپنی رگ جاں میں اترتی ہوئی محسوس کی۔اس نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''اب فکر نہیں کریں،ہم پہنچ آئے ہیں نا......اب ہم یہیں ہیں۔''

اس کے بعد وہ جلدی سے بیرونی دروازے تک پہنچے۔ دروازے کے باہر ہی دو خوش پوش افراد موجود تھے۔میر صاحب ان میں سے ایک سے مخاطب ہوئے۔

''قریشی صاحب !ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔فوراً انتظام کیجئے۔''

''جی بہتر......'' قریشی صاحب نے فوراً مودبانہ انداز میں سر کو جنبش دی اور پلٹ کر چل پڑے۔اسی وقت عشرت جہاں اور سندس جہاں افتاں وخیزاں نمودار ہوئیں ۔وہ دونوں اور میر صاحب آگے پیچھے ہی کمرے میں واپس داخل ہوئے۔تین سپاہی چوہدری کے دونوں کارندوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔انسپکٹر ایک سپاہی کو ساتھ لے کر زہرت بیگم کا بیان قلم بند کرنے لگا۔

☆☆

وہ ایک کچا کوٹھڑی نما کمرہ تھا۔کمرے کے ایک کونے میں پانی کا مٹکا دھرا تھا اور اس کے برابر زمین پر ہی،ایک میلا کچیلا بستر بچھا ہوا تھا،جس پر مرشد بے سدھ پڑا تھا ۔اس کا وجود سراپا زخم تھا۔اس کی پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے،لیکن وہ آزاد ہرگز نہیں تھا ......اس ہتھکڑی کی ایک کڑی اس کی بائیں کلائی کو جکڑے ہوئے تھی،جب کہ دوسری بائیں ٹانگ کو ٹخنے کے قریب سے گرفت میں لئے ہوئے تھی۔وہاں گرفت سخت تھی۔ٹانگ کی کھال بری طرح چھل بھی چکی تھی اور اس حصے میں مرشد کو مسلسل تکلیف بھی تھی۔اس کے علاوہ ایک دس فٹ لمبی زنجیر،ہتھکڑی کے درمیان بندھی تھی اور اس کا دوسرا سرا دیوار میں موجود سلاخ دار کھڑکی کی ایک موٹی

سلاخ سے منسلک تھا۔ اسے چند گھنٹے پہلے ہی یہاں منتقل کیا گیا تھا۔

چوہدری فرزند سے ملاقات کے اگلے روز شام مغرب کے بعد اسے تین گھنٹے تک ایک کمرے میں الٹا لٹکا کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس تشدد میں کیکر کی باریک سبز شاخیں استعمال کی گئیں...... بجلی کے تار کا ہنٹر بھی اس کے وجود پر سرخ لکیریں کھینچتا رہا...... اس کے بعد نمک مرچ کو یکجا کر کے اس کے وجود کے زخموں پر مساج کیا گیا۔ تشدد تو فوجی اور دیگر کارندوں نے کیا البتہ نمک مرچ کا مساج ملنگی نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ مرشد اس دوران مسلسل ان سب کو گالیاں دیتا رہا اور دو بدو لڑنے کے لئے للکارتا رہا، لیکن وہ سب اس کی اذیت اور بے کسی پر ہنستے رہے، پھر جب اس کے حواس دھندلا گئے تو اسے دوبارہ اسی جگہ، اسی طرح باندھ کر ڈال دیا گیا۔ رات ہی کے کسی پہر اسے بخار ہو گیا۔ آج صبح دس بجے بارش شروع ہوئی۔ وہ اسی جگہ پڑا بارش میں بھیگتا رہا۔ بخار مزید شدت اختیار کر گیا تو وہ با لکل ہی بے سدھ سا ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا بچنا اب مشکل ہے۔ تبھی ملنگی نے اپنے کارندوں سے کہہ کر اسے وہاں سے اٹھوایا اور اس کمرے میں منتقل کر دیا۔ اس کے وجود پر موجود کپڑوں کی گیلی دھجیاں علیحدہ کر کے اسے بالکل برہنہ حالت میں، اس میلے کچیلے بستر پر لٹا کر اوپر ایک کھیس ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر بعد دو افراد نے مل کر اسے چائے کے ساتھ بمشکل چند پاپے کھلائے اور واپس چلے گئے، پھر ملنگی نے آ کر اسے دو انجکشن لگائے اور وہ بھی چلا گیا۔

مرشد کے ساتھ یہ ساری نرمی اور مہربانی کسی ہم دردی کے تحت نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ یہ سب اس لئے تھا کہ وہ اذیت اور تشدد پسند درندے اتنی جلدی تشدد پسندی کے اپنے مشغلے سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ ابھی بہت سے روز اسے زندہ رکھنا چاہتے تھے...... اسے تختہ مشق بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ تقریباً چھ گھنٹے بعد دوبارہ یہی عمل دوہرایا گیا۔ اسے پھر سے چند لقمے کھلائے گئے۔ اور ملنگی دوبارہ اسے انجکشن لگا کر لوٹ گیا۔ صبح کے قریب مرشد کے حواس قدرے بحال ہوئے تو اسے اپنی برہنگی اور اس نئے قید خانے کا اندازہ ہوا۔ پورا وجود پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ زخموں میں جلن تھی اور ہلکا ہلکا بخار بھی ابھی تک باقی تھا۔ ہاں یہ ہوا تھا کہ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہو آیا تھا۔

اس نے ہتھکڑی کے نئے انداز بندش کو محسوس کیا، وہ نہ تو سیدھا ہو کر لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔ کوٹھڑی مکمل طور پر خالی تھی۔ مخالف دیواروں میں لکڑی کے دو دروازے تھے اور تیسری دیوار میں موٹی سلاخوں والی ایک کھڑکی، جس کی ایک سلاخ کے ساتھ زنجیر بندھی تھی۔ کھڑکی سے باہر ملگجا سا اجالا تھا۔ آسمان ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔ فضا گدلی تھی البتہ بارش رات کے کسی پہر رک گئی تھی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی لہٰذا مٹکے پر نظر پڑتے ہی اس نے اٹھ کر مٹکے کے اوپر دھرے کٹورے سے بدقت پانی پیا اور تین کٹورے حلق میں انڈیلنے کے بعد دوبارہ کھیس اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اتنی سی مشقت ہی سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ تین روز کی بھوک پیاس، وحشیانہ تشدد اور پھر شدید بخار نے اس کے وجود کی ساری توانائیوں کو جیسے نچوڑ لیا تھا۔ دن دس بجے کے قریب اس کی پائنتی والی دیوار میں موجود دروازے پر آہٹ ہوئی دروازہ کھلا اور منظوراں ایک ٹرے اٹھائے جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو آئی۔ اس کے عقب میں ایک ناٹے قد کا سیاہ صورت رائفل بردار تھا، جو دروازے میں ہی جم کر کھڑا ہو گیا۔

گزشتہ تین دنوں میں وقتاً فوقتاً مرشد، منظوراں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ فربہی مائل بدن کی پختہ عمر عورت تھی۔ صبح شام تنور پر وہی روٹیاں لگاتی تھی اور یہاں موجود تمام جنگلی جانور نما انسانوں کے لئے ہانڈی سالن کرتی تھی۔ ان کے جھوٹے برتن اور گندے کپڑے دھوتی تھی۔ مرشد نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ جب بھی اس کی نظر مرشد پر پڑتی تھی، اس کی آنکھوں میں ایک خوف اور عجیب سی ہم دردی کسمسا کر رہ جاتی تھی۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس بدنصیب گھبرو جوان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

"بس ٹرے یہاں...... اس کے پاس رکھ دے"
منظوراں کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے رائفل

برادار نے کھردرے انداز میں کہا، پھر مرشد کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے بولا۔

''اٹھ کر کچھ زہر مار کر لے، تیرے لئے ملنگی استاد نے خاص انتظام کروایا ہے۔''

منظوراں نے دو قدم کے فاصلے پر ٹرے رکھی اور جلدی سے واپس پلٹ گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

مرشد نے سر اٹھا کر دیکھا، ٹرے میں تام چینی کا ایک بھاپ اڑاتا پیالہ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ چند سیب تھے اور کچھ اخباری کاغذ کی پڑیاں۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ٹرے کھسکا کر ذرا اپنے قریب کی، سب سے پہلے ان پڑیوں کو کھول کر دیکھا۔ ان میں ایک ایک کیپسول اور تین تین ٹیبلٹس تھیں۔ یہ یقیناً اس کے بخار وغیرہ کے لئے چند خوراکیں تھیں۔ تام چینی کے پیالے میں غالباً دیسی چوزے کی گرما گرم یخنی تھی۔ مرشد کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کی بائیں آنکھ اور رخسار ورم کی زد میں تھا۔ چوہدری کی کھیڑی کی ضرب سے رخسار کی پھٹنے والی آدھ پون انچ کھال سوکھ کر سیاہ پیپڑی سی کی صورت اس کے رخسار سے چپٹی ہوئی تھی۔ پھلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے یخنی کا پیالا اٹھایا اور دس منٹ میں خالی کر دیا۔ خالی معدے میں ایک حرارت آمیز توانائی بے دار ہو اٹھی تھی۔ چند منٹ کا وقفہ دے کر اس نے ایک پڑیا اٹھائی اور پہلی خوارک حلق سے اتار کر دوبارہ لیٹ گیا۔ پتا نہیں یہ ان ٹیبلٹس کا اثر تھا۔ یخنی کا، یا پھر دونوں کا، کچھ ہی دیر بعد اسے یوں کھل کر پسینہ آنا شروع ہوا کہ پندرہ بیس منٹ میں ہی اس کا سارا وجود ایسے بھیگ گیا جیسے وہ نہا کر آیا ہو۔

ایک گھنٹے بعد اس کا بخار مکمل طور پر اتر چکا تھا اور جسمانی نقاہت میں بھی بہت حد تک کمی واقع ہو آئی تھی۔ کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد وہ کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے باہر ابھی تک ملگجا اجالا تھا۔ یعنی بادل بدستور موجود تھے۔ وہ جھکے جھکے انداز میں اٹھ کر کھڑکی تک پہنچا۔ زنجیر کو ایک سلاخ کے ساتھ لپیٹ کر تالا لگا دیا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ غالباً اس ڈیرے کا عقبی حصہ تھا سامنے...... پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر احاطے کی کچی دیوار تھی اور درمیانی حصے میں خودرو گھاس اور آک کے پودے اگے ہوئے تھے، جو بارش میں دھل کر نکھرے نکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ فضا میں گیلی مٹی اور پانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ادھر سے ہٹ کر دوسری طرف موجود دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کی زنجیر اندر ہی سے چڑھی ہوئی تھی۔ مرشد نے زنجیر ہٹاتے ہوئے دروازہ کھولا، یہ بھی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ چھت کافی اونچی تھی اور اس میں کافی بڑا سوراخ بھی تھا۔ اس حصے سے گرا چھت کا ملبہ اندر ہی پڑا تھا، جو اس وقت کیچڑ بنا ہوا تھا۔ اس کوٹھڑی کا اصل مصرف تو پتا نہیں کیا تھا۔ مرشد نے اسے بیت الخلا کے طور پر استعمال کیا اور کسی نہ کسی طرح پرسکون ہو کر باہر نکل آیا۔ دوسرے دروازے کا اسے اندازہ تھا پھر بھی اس نے دروازے کی درزوں سے جھانک کر دیکھا، آدھا صحن دکھائی دیا جو خالی تھا...... مکمل خاموشی تھی۔ یوں جیسے یہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو..... کوٹھڑی کے اندر صرف زنجیر کی کھنکناہٹ تھی۔ وہ واپس اپنی جگہ پہنچ کر بیٹھ گیا۔

اب وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کوٹھڑی میں قدرے حبس کا احساس ہو رہا تھا، پھر بھی اپنی برہنگی چھپانے کیلئے اس نے اپنے زیریں جسم پر کھیس ڈال لیا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ارادہ کیا کہ اب کم از کم اس کا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ پوری طرح آزاد ہے، لہٰذا اب وہ ان لوگوں کو موقع نہیں دے گا کہ وہ پھر سے اسے مکمل طور پر بے بس کر پائیں۔ اس بات کا اسے پورا یقین تھا کہ ایسی حالت میں بھی وہ اپنے قریب آنے والے کو محض چند لمحوں میں ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے دردناک انجام کے حوالے سے اس کے سینے میں مسلسل ایک آگ سی دہک رہی تھی۔ ان کے خون کا قرض چکائے بغیر وہ ختم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ ساتھ اماں کی فکر بھی اسے مسلسل بے چین کئے ہوئے تھی۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کے حالات کیا ہوں گے۔ اسے یہاں پھنسے ہوئے آج چوتھا روز تھا اور اس دوران حجاب کا خیال بھی اسے مسلسل ایک جاں گسل اضطراب میں مبتلا کئے رہا تھا۔ بھوک پیاس کے باوجود..... تشدد، بخار اور نیم غشی کے

باوجود وہ معصوم، من موہنی صورت اس کے پردہ تصور پر جھلملاتی رہی تھی۔ وہ روشن اور پرنور چہرہ ایک سوال کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔ اب بھی وہ چہرہ اس کے ذہن میں چمک رہا تھا اور وہ دانستہ اسے نظر انداز کر رہا تھا...... اپنے ذہن کو اس کے تصور، اس کی یاد سے ہٹا رہا تھا اور ایسا اس لئے تھا کہ اس کے وجود پر کپڑے نہیں تھے۔ اسے ایک جھجک اور شرمندگی کا احساس ستا رہا تھا۔ شاید اسی باعث کوٹھڑی کی فضا حبس زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے زیریں جسم کو کھیس سے ڈھانپ رکھا تھا۔

سارا دن اسی طرح خاموشی اور سکون سے گزرا۔ مغرب سے کچھ پہلے دروازہ ایک بار پھر کھلا اور پہلے ہی کی طرح منظوراں کھانے کے برتن رکھ کر اور صبح والے سمیٹ کر واپس چلی گئی۔ وہی گن مین پہلے کی طرح دروازے میں کھڑا رہا تھا۔ ابھی تنور کی روٹیاں اور مرغی کے گوشت کا سالن تھا۔ اس بار مرشد نے کھانے کے ساتھ تسلی سے انصاف کیا اور پھر دوا کی خوراک نگل لی۔ دن میں سیبوں پر گزارا کیا تھا۔ ہتھکڑی اور زنجیر کے ساتھ بھی وہ زور آزمائی کر کے دیکھ چکا تھا۔ کھڑکی میں موجود سلاخیں بھی انتہائی مضبوط تھیں۔ خلاصی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی اسے ۔کوٹھڑی میں اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ دن بھر پسینے کے نمکیات اس کے بدن کے زخموں میں انگارے دہکاتے رہے تھے۔ مغرب کے بعد ایک بار پھر باہر بوندا باندی شروع ہوگئی اور مرشد بستر پر لیٹ گیا۔ کوٹھڑی میں مکمل تاریکی پھیل گئی۔ اطراف میں ہنوز خاموشی اور سناٹا تھا ۔ملنگی اور فوجی لوگ شاید کہیں نکلے ہوئے تھے۔ کسی نئے مشن پر..... کسی نئی کاروائی کیلئے ..... شاید وہ اس ’’کایاں‘‘ آدمی کا کانٹا نکالنے گئے تھے، جس کے متعلق رانا سرفراز اور چوہدری فرزند علی کے درمیان بات چیت ہوئی تھی۔ اس نامعلوم شخص کے حوالے سے وہ دونوں ہی خاصے پریشان دکھائی دیئے تھے۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی گئی۔ بارش کبھی رک جاتی اور کبھی زور پکڑ جاتی۔ مرشد بستر پر لیٹا مختلف سوچوں اور خیالوں میں الجھا رہا۔ نصف شب سے اوپر ہی وقت رہا ہوگا، جب اسے ہلکی ہلکی غنودگی محسوس ہونا شروع ہوئی ۔شاید کچھ دیر میں وہ سو جاتا، مگر ایک پراسراری آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ آہٹ کی وہ آواز کھڑکی کی سمت سے بلند ہوئی تھی..... یقیناً کھڑکی کی دوسری طرف کوئی موجود تھا!

مرشد نے ایک ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ اندھیرے کے باوجود اسے محسوس ہوا کہ کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان کچھ ہے۔ ایک عجیب سی سرسراہٹ کی آواز بھی تھی۔ اگلے ہی لمحے کوئی چیز مدھم سی دھپ کی آواز کے ساتھ سلاخوں سے کوٹھڑی کے اندر آ گری۔ کسی انجانے احساس کے تحت اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھا تو کوٹھڑی کے اندھیرے میں زنجیر کی کھنکھناہٹ گونج اٹھی۔ ٹھیک اسی وقت کھڑکی کی طرف سے ایک سرسراہٹ اڑتی ہوئی آئی اور اس کے کندھے سے ٹکرا کر بستر پر گر پڑی۔ وہ شاپر میں لپٹی کوئی سخت چیز تھی۔ مرشد نے ٹٹول کر شاپر پکڑا اور اس کے اندر موجود چیز کی حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس نے بہ عجلت شاپر میں سے وہ چیز نکالی۔ وہ ایک مخصوص طرز کی چابی تھی۔ ایسی چوڑی دار گول چابی جس سے ہتھکڑیوں کو کھولا اور بند کیا جاتا ہے مرشد نے بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ ٹٹول کر چابی کو ہتھکڑی کے سوراخ تک پہنچایا اور اگلے چند ہی لمحوں میں اس منحوس ہتھکڑی کا شکنجہ کھل گیا۔ اس کی کلائی اور ٹانگ اس آہنی گرفت سے آزاد ہو چکی تھیں ۔ایک مسرت انگیز تحیر اس کے دل و دماغ میں گھلتا چلا گیا۔ اس نے چند لمحے اپنی ٹانگ اور کلائی کو سہلایا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک قدرے بڑے سائز کا شاپر موجود تھا۔ مرشد نے اسے ٹٹولتے ہوئے کھولا اور ہاتھوں اور انگلیوں کی مدد سے اس کے اندر موجود سامان کا جائزہ لینے لگا۔ کپڑے تھے..... ایک کاپی سائز کاغذ کا ٹکڑا تھا اور..... اور ایک انتہائی کارآمد ہتھیار تھا..... ہاں کپڑوں کے اندر لپٹا ہوا ایک پستول بھی تھا!

مرشد نے اٹھ کر فوراً کھڑکی سے دوسری سمت جھانکا مگر ادھر اندھیرے اور سناٹے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گویا یہ سب کوئی غیبی مدد تھی...... یہ بات آسانی سے سمجھ آنے والی تو تھی نہیں، کہ یہاں کون اس کا ہمدرد اور مددگار پیدا ہو گیا ہے۔ کون کے حوالے سے تو اندازہ ممکن نہ تھا البتہ فی

الوقت ان حالات میں اتنا ہی کافی تھا کہ کوئی نہ کوئی ہے ضرور.....

اس نے فوراً کپڑوں کا جائزہ لیا۔ وہ ایک شلوار سوٹ تھا۔ مرشد نے اسے زیب تن کیا پھر کچھ سوچ کر شلوار کے علاوہ بنیان اور قمیض اتار کر بستر پر، تکیے کے نیچے چھپا دی ۔کاغذ کا ٹکڑا بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بس قیاس کیا جاسکتا تھا کہ ہو نہ ہو اس کاغذ پر کوئی پیغام درج ہوگا۔ کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا قمیض کی جیب میں ڈالا اور پستول کے میگزین کے بھرے ہونے کی تسلی کر کے پستول ڈب میں لگا لیا۔ اس کے بعد اٹھ کر "بیت الخلا" والی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ کوٹھڑی کی دیواریں کچی سہی مگر مضبوط تھیں اور چھت کم از کم بھی چودہ پندرہ فٹ بلندی پر تھی۔ بنا کسی آسرے سہارے کے وہاں تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کوٹھڑی سے نکل کر وہ صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کے قریب آ رکا دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور باہر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی باہر ہنوز وہی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس کسی کسی وقت کتوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ غالباً وسیع صحن میں کھلے پھر رہے تھے۔ مرشد پیچھے ہٹ کر اس مختصر جگہ پر ٹہلنے لگا۔

ذہن بار بار اس اجنبی مددگار کی طرف چلا جاتا جس نے رات کی اس تاریکی میں اس کی مدد کرتے ہوئے اس قدر سہولت پیدا کر دی تھی کہ اب وہ مرتا مرتا بھی دو چار کو تو بہ آسانی اپنے ساتھ لے مرتا۔ وہ سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کبھی مراد، جعفر اور شبیرے کا خیال اس کی نسوں میں لاوا دوڑا جاتا، کبھی ساون اکو اور دیگر ساتھیوں کی فکر ہونے لگتی۔ اسے یقین تھا کہ لالا رستم بھی اپنے طور پر حرکت میں آچکا ہوگا اور سب سے پہلے اس نے اماں کی حفاظت اور سلامتی کا انتظام کیا ہوگا۔ حجاب کا خیال تو اسے مسلسل ہی مضطرب کیے ہوئے تھا۔ وہ سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا، اسی طرح صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ کوٹھڑی میں کچھ روشنی داخل ہوئی تو وہ بستر پر آبیٹھا۔ اس نے بے چینی سے قمیض کی جیب میں سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا، وہ کسی کاپی سے پھاڑا گیا تھا اور اس کی ایک طرف تحریر سے پر تھی۔ مرشد کی نظریں اس تحریر پر پھسلنے لگیں۔ وہ تحریر کسی عورت کی تھی۔

میں جانتی ہوں مرشد کہ تم ابھی تک زندہ سلامت ہو اور خدا کے حضور دعا گو ہوں کہ تم زندہ سلامت ہی رہو۔ تمہاری مدد کی اپنی سی کوشش کرنے جا رہی ہوں۔

پتا نہیں کامیاب بھی ہو پاتی ہوں یا نہیں۔ بس دعا ہے کہ میری مدد تم تک پہنچ سکے اور تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تمہارے پاس کل شام تک کا وقت ہے۔

کل شام تک اس ڈیرے پر صرف ایک ہی آدمی موجود رہے گا۔ شام کے بعد اس کے باقی سارے ساتھی بھی لوٹ آئیں گے۔ اس کے بعد تمہارے لئے یہاں سے نکل پانا قریباً ناممکن ہی ہوگا۔

میرا اندازہ ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جو چوہدریوں کی فرعونیت کو لگام ڈالنے کا حوصلہ رکھے ہو۔ حجاب بی بی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس کی کسی کو خبر نہیں کہ فی الوقت وہ کہاں ہے۔ اس کے بھائی اسرار احمد کا بھی کچھ اتا پتا نہیں۔ البتہ حجاب بی بی کی والدہ سردار بی بی زندہ سلامت ہیں اور محفوظ ہیں۔ اگر تم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو میں کسی نہ کسی طرح تم تک ان کا ایڈریس پہنچا دوں گی۔ فی الحال ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔

خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔

والسلام

تمہاری ایک خیر خواہ.....

مرشد نے دو تین بار وہ تحریر پڑھی اور کتنی ہی دیر پر سوچ انداز میں بیٹھا رہا۔ اس خط کے حوالے سے سب سے پہلے اس کا ذہن منظوراں کی طرف گیا، مگر اس نے فوراً ہی ذہن سے یہ خیال جھٹک دیا۔ منظوراں مکمل طور پر ایک گنوار دیہاتن تھی، جبکہ یہ تحریر انتہائی پختہ اور نپی تلی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ لکھنے والی اچھی خاصی ذہن اور تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ تحریر سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ حجاب بی بی کے گھرانے پر گزرنے والی ساری قیامت سے لے کر اب تک کے تمام واقعات سے باخبر ہے۔ اور تو اور شاید وہ خود مرشد کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی۔ یہ بھی واضح تھا کہ وہ حجاب بی بی کی والدہ کے حوالے سے بھی

وہ ساری معلومات رکھتی ہے جو کہ اور کسی کے پاس بھی نہیں تھیں.....

مرشد جس قدر سوچتا گیا یہ نامعلوم خاتون اس کے نزدیک اتنی ہی پراسرار حیثیت اختیار کرتی گئی۔ اب تک اس کا اندازہ یہی تھا کہ "ڈپٹی اعوان پر حملہ کروا کر ڈپٹی صاحب اور حجاب سرکار کو اغوا کرانے والے چوہدری اور رانا سرفراز لوگ ہیں۔" لیکن اب اس باخبر اور پراسرار خاتون کے خط سے اس پر ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اس کا اندازہ غلط ہے..... درمیان میں کوئی تیسری پارٹی کوئی تیسری طاقت یہ کام کر گزری تھی اور دو روز پہلے چوہدری اور رانا کے درمیان شاید اسی حوالے سے بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ تیسری پارٹی یا تیسرا شخص کون تھا..... یہ ایک نئی الجھن، نئی پریشانی تھی!

روشنی کچھ مزید پھیلی تو مرشد ہتھکڑی اور زنجیر تھام کر دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ کھیس اس نے پیٹ تک اوڑھ لیا اور پسٹل کو تیار حالت میں کر کے ہاتھ کے نیچے رکھ لیا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ دیر تک منظوراں رائفل بردار کی نگرانی میں کھانا لے کر آئے گی اور یہی وہ بہترین موقع ہوتا جب وہ باآسانی اس رائفل بردار کو نشانہ بناتے ہوئے یہاں سے نکل لیتا۔

وہ کھیس اوڑھے ان کے انتظار میں لیٹا رہا۔ باہر ہنوز جھڑی کا سماں تھا۔ کچھ دیر مزید گزری ہو گی کہ پھر سے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ دو دفعہ اس نے اُٹھ کر دروازے کی درزوں سے جھانکا بھی۔ یہ کوٹھڑی ایک کونے میں کسی بڑے کمرے کے بغلی طرف واقع تھی دروازے کے بائیں ہاتھ اس کمرے کی آٹھ فٹ لمبی دیوار دکھائی دیتی تھی۔ دائیں ہاتھ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر بیرونی دیوار تھی جو سامنے تک چلی گئی تھی۔ یہاں سے مکمل صحن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بس بیرونی گیٹ، ہینڈ پمپ اور صحن کا کچھ حصہ..... تنور بھی یہاں سے سامنے ہی تھا مگر وہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ پورے حصے میں خاموشی تھی۔ کتے بھی غالباً کہیں دبکے بیٹھے تھے۔

کئی گھنٹے یونہی گزر گئے۔ اندازاً دن بارہ بجے کے قریب قریب کا وقت رہا ہو گا، جب دروازے کے باہر کچھ حرکت اور آواز کا احساس ہوا۔ مرشد اس وقت بے زار سا بستر پر بیٹھا تھا۔ باہر کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے یکبارگی اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ فوراً کھیس اوڑھتے ہوئے مخصوص انداز میں دوہرا سا ہو کر لیٹ گیا۔ پسٹل اس نے دائیں ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

چند لمحے بعد دروازے کی زنجیر ہٹنے کی آواز سنائی دی اور توقع کے عین مطابق منظوراں ایک چنگیر اٹھائے اندر داخل ہو آئی۔ رائفل بردار حسب سابق دروازے کے درمیان ہی جم کر کھڑا ہو گیا۔

مرشد نڈھال سے انداز میں پہلو کے بل لیٹا تھا۔ رائفل بردار کا ڈھیلا ڈھالا انداز بتا رہا تھا کہ اسے مرشد کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مرشد اس وقت مکمل طور پر آزاد ہے، نہ صرف آزاد ہے بلکہ ایک لوڈڈ پسٹل بھی کھیس کے نیچے اس کے ہاتھ میں موجود ہے۔ منظوراں چنگیر اٹھائے آگے بڑھی، مرشد کے اعصاب تن گئے۔ پسٹل پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور انگلی آہستہ سے رینگ کر پسٹل کی لبلبی پر جا ٹکی۔

"چل اوئے! بدمعاش کے..... اٹھ کر چر مر لے۔ آج رات تیری..... ہو گی۔"

رائفل بردار نے اپنی مخصوص گندی زبان میں کہا۔ مرشد اس پر فائر کرنے ہی والا تھا، کہ اچانک باہر کہیں سے ایک ساتھ دو فائر کئے گئے اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا رائفل بردار بے اختیار کراہتا ہوا دروازے کے ایک پٹ سے ٹکرایا اور منہ کے بل دروازے سے اندر آ گرا۔ دونوں فائرز رائفل کے تھے۔ ایک گولی رائفل بردار کی کمر میں گھس کر سینہ پھاڑتی ہوئی کوٹھڑی کی کچی دیوار میں دھنس گئی تھی، تو دوسری اس کی پسلیوں سے آر پار ہو گئی تھی۔ منظوراں کے حلق سے بے اختیار دہشت زدہ چیخ خارج ہوئی۔ چنگیز اس کے ہاتھ سے گر گئی اور مرشد کھیس ایک طرف پھینکتے ہوئے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جو ہوا تھا وہ قطعی خلاف توقع تھا۔ کوئی اندزہ نہیں تھا کہ باہر کون ہے..... مرشد اس کے تڑپتے پھڑکتے وجود کو پھلانگتا ہوا

دروازے کی اوٹ میں پہنچا اور وہاں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ گیٹ کے قریب دیوار پر ایک ساتھ اسے تین چار افراد نظر آئے۔ سبھی مسلح تھے اور دیوار پھلانگ کر اندر آرہے تھے۔ ان میں ایک شخص کو تو مرشد نے فوراً ہی شناخت کرلیا۔ ابھی دو روز پہلے ہی وہ اس پتھر کی آنکھ والے شخص کو دیکھ چکا تھا۔ یہ چوہدری فرزند کا کرگا تھا..... غالباً حکم داد نام تھا اس کا۔ مرشد کے دماغ میں فوراً ایک نئی مصیبت، نئے خطرے کے الارم بج اٹھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ لوگ اسی کو اغوا کرنے کی نیت سے یہاں پہنچے تھے۔

چوہدری فرزند اس کی طرف سے اپنی شان میں کی گئی گستاخیوں کو نظرانداز نہیں کر پایا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں اسے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ملنگی نے اسے، اس ارادے پر عمل درآمد نہیں کرنے دیا تھا اس وقت چوہدری نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اب اس کے پالتو کتوں کی یوں آمد چوہدری کی کینہ پروری اور انا پرستی کی ترجمانی کررہی تھی۔

منظوراں مسلسل چیخ رہی تھی۔ پہلے مرشد کو اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا تھا اور اب کوٹھڑی کی مضبوط دیوار سے لگی، رائفل بردار کے خون اگلتے وجود کو تک رہی تھی۔ دہشت اس کی آنکھوں میں جم کررہ گئی تھی مرشد نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن پتا نہیں کیوں اس کی چیخوں سے اسے حجاب کا خیال آگیا۔ صحن کے کسی گوشے سے کتوں نے بھی بھونکنا شروع کردیا تھا۔ آنے والے چاروں افراد دیوار سے صحن میں کود چکے تھے۔ چاروں رائفلوں سے مسلح تھے۔ یہ چوہدری فرزند کے خاص کتے تھے اور یقینی طور پر یہ حجاب سرکار کے باپ بھائیوں کے قاتل تھے..... ان کے قاتلوں میں سے تھے۔ مرشد کے دل و دماغ میں ایک تلخ دھواں سے بھرتا چلا گیا۔ وہ چاروں محتاط انداز میں اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرشد نے ہونٹ بھینچے اور اچانک ان پر پسٹل سے فائر کھول دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے چار فائر کئے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکھڑایا تو دوسرا باقاعدہ تڑپ کر گر پڑا۔ البتہ ایک نے فوراً مرشد کی طرف جوابی برسٹ مارا۔ گولیاں خوفناک آواز کے ساتھ دیوار اور دروازے سے ٹکرائیں لکڑی کے کچھ ٹکڑے اڑ کر جاں بلب رائفل بردار کے وجود پر گرے۔ منظوراں کی چیخوں میں کچھ مزید شدت آگئی۔ مرشد دروازے کے برابر دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے وقفے سے ایک چھوٹا برسٹ مزید چلایا گیا۔ آنے والوں کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ مرشد کا اندازہ تھا کہ اس کی فائرنگ سے دو بندے زخمی ہوئے ہیں، جن میں سے ایک یقیناً جان لیوا طور پر نشانہ بنا تھا۔ یعنی ڈھائی تین افراد اس کے مقابل باقی تھے۔ کچھ دیر بعد چند فائرز مزید سنائی دیئے، لیکن اس بار انکا رخ اس طرف نہیں تھا..... فائرز کے ساتھ کتوں کا بھونکنا کربناک چیخوں میں بدل کر بند ہوگیا۔ ان بے رحم درندوں نے کتوں کو ہلاک کردیا تھا۔

مرشد نے ایک ذرا جھانک کر دیکھا، سامنے کوئی نہیں تھا۔ یعنی ان لوگوں نے بغلی طرف والے بڑے کمرے کی آڑ لے لی تھی۔ صحن کے بھیگے ہوئے گیلے فرش پر خون کے دھبے اسے صاف دکھائی دیئے۔

دشمنوں کے پاس خودکار رائفلیں تھیں اور مرشد کے ہاتھ میں پسٹل تھا، جس میں سے چار گولیاں وہ خرچ بھی کر چکا تھا۔ اس نے دروازے کے سامنے پڑے رائفل بردار کی طرف دیکھا۔ وہ ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی پسلیوں اور سینے سے ابلنے والا خون، کوٹھڑی کے کچے فرش پر پھیل رہا تھا۔ اس سے ایک قدم آگے، اس کی رائفل پڑی تھی..... یہ سیون ایم ایم رائفل تھی اور اس وقت پسٹل کے علاوہ یہی مرشد کے کام آسکتی تھی۔ وہ خاصی نازک پوزیشن میں تھا۔ سامنے والے دروازے کی اوٹ میں وہ خود کھڑا تھا۔ عقبی طرف کھڑکی تھی اور اسکے پٹ بھی نہیں تھے۔ دشمن دو طرف سے اس پر حملہ آور ہوسکتے تھے، مگر وہ بہ یک وقت ان دو محازوں پر نہیں لڑسکتا تھا۔ یہ کوٹھڑی ایک طرح سے اس کے لئے چوہے دان بن گئی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

دھواں

ابراھیم جمالی

وہ مسلمان تھا لیکن اس کی وصیت تھی کہ اسے دفن کی بجائے چتا پر رکھ کر جلایا جائے اس کی راکھ کھیتوں کو سیراب کرتی ندی میں بہا دیا جائے مگر علاقہ کے ہندو اور مسلمان دونوں اس وصیت پر عمل کرنے کو تیار نہ تھے۔

بھارت کے معروف ادیب گلزار کی ہندی کہانی کا ترجمہ

بات سلگی تو بہت دھیرے سے تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پورے قصبے میں دھواں بھر گیا۔ چوہدری کی موت صبح چار بجے ہوئی تھی سات بجے تک چوہدرانی نے رو دھو کر ہوش سنبھالے اور سب سے پہلے مولوی خیر الدین کو بلوایا ساتھ ہی نوکر کو تاکید کی کہ وہ ان سے کوئی ذکر نہ کرے۔ نوکر جب مولوی کو آنگن میں چھوڑ کر چلا گیا تو چوہدرائن انہیں اوپر خواب گاہ میں لے گئی جہاں چوہدری کی لاش بستر سے اتار کر زمین پر بچھادی گئی تھی دو سفید چادروں کے درمیان لیٹا ایک زردی مائل سفید چہرہ سفید بھویں داڑھی اور لمبے سفید بال چوہدری کا چہرہ بڑا نورانی لگ رہا تھا۔

مولوی نے دیکھتے ہی ''انا اللہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا۔ کچھ رسمی سے جملے بھی کہے ابھی وہ ٹھیک سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ چوہدرانی الماری سے وصیت نامہ نکال لائی مولوی کو دکھایا اور پڑھایا بھی چوہدری کی آخری خواہش تھی کہ انہیں دفن کی بجائے چتا پر رکھ کر جلایا جائے۔ پھر ان کی راکھ کو گاؤں کی ندی میں بہا دیا جائے جو ان کی زمین کو سینچتی ہے۔

مولوی خاموش رہا۔ چوہدری نے گاؤں میں دین مذہب کے لیے بڑے کام کیے تھے ہندو مسلمان کو ایک سا دان دیتے تھے۔ گاؤں کی کچی مسجد پختہ کرادی تھی اور تو اور ہندوؤں کے شمشان کی عمارت بھی پکی کروائی تھی اب کئی برسوں سے بیمار پڑے تھے لیکن اس بیماری کے دوران بھی ہر رمضان میں غریب غربا کی افطاری کا انتظام مسجد میں ان ہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ علاقے کے مسلمان انہیں بہت چاہتے تھے۔ ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اب وصیت پڑھ کر مولوی کو بہت حیرت ہوئی اور یہ خدشہ بھی ہوا کہ کہیں جھمیلا نہ کھڑا ہو جائے آج کل ویسے ہی ملک کی فضا خراب ہو رہی تھی ہندو کچھ زیادہ ہی ہندو ہوگئے تھے مسلمان کچھ زیادہ مسلمان۔

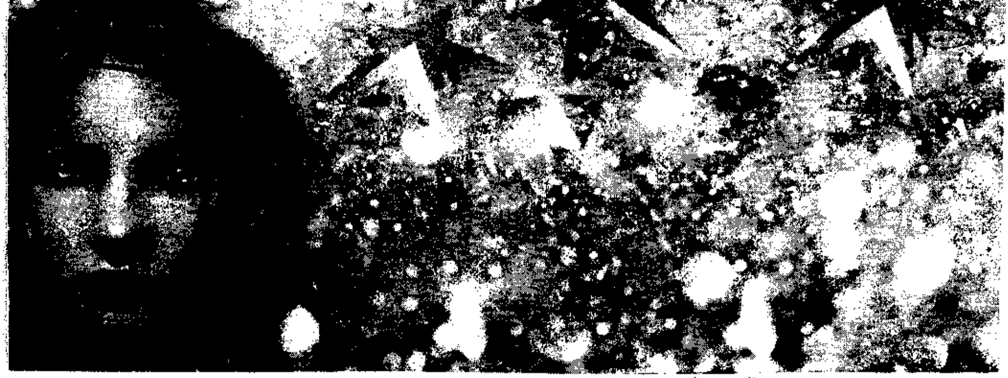
بات بتانے ہی سے بگڑ گئی جب مولوی خیر الدین نے مصلحتاً پنڈت رام چندر کو بلا کر انہیں سمجھایا۔

''تم چوہدری کی لاش کو اپنے شمشان میں جلانے کی اجازت ہرگز نہ دینا۔ ورنہ ہوسکتا ہے علاقے کے مسلمان واویلا کھڑا کردیں آخر چوہدری عام آدمی تو تھا نہیں بہت سے لوگ کئی طرح سے ان سے جڑے ہوئے ہیں۔''

پنڈت رام چندر نے بھی یقین دلایا کہ وہ اپنے علاقے میں کسی طرح کی شرانگیزی نہیں چاہتے اس سے پہلے کہ بات پھیلے وہ بھی اپنی طرف کے مخصوص لوگوں کو سمجھا دیں گے۔ بات جو سلگ گئی تھی دھیرے دھیرے آگ پکڑنے لگی۔ سوال چوہدری اور چوہدرانی کا نہیں تھا سوال عقیدوں کا ہے۔ ساری قوم ساری کمیونٹی اور مذہب کا ہے۔ چوہدرانی کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ اپنے شوہر کو دفن کرنے کی بجائے جلانے پر تیار ہوگئی۔ کیا وہ اسلام کے آئین نہیں جانتی؟''

کچھ لوگوں نے چوہدرانی سے ملنے کی بھی ضد کی چوہدرانی نے بڑے دھیرج سے کہا۔

''بھائیو یہ ان کی آخری خواہش تھی مٹی ہی تو ہے اب جلادو یا دفن کردو۔ جلانے سے ان کی روح کو تسکین ملتی ہے تو اس پر آپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟'' ایک صاحب کچھ زیادہ طیش میں آگئے۔



"انہیں جلا کر آپ کو تسکین ہوگی؟" وہ بولے۔

"جی ہاں۔" چوہدرانی کا جواب بہت مختصر تھا۔ پھر وہ بولیں۔

"ان کی آخری خواہش پوری کرنے سے ہی مجھے تسکین ہوگی۔"

دن چڑھتے چڑھتے چوہدرانی کی بے چینی بڑھنے لگی۔ جس بات کو وہ صلح صفائی سے نپٹانا چاہتی تھیں وہ طول پکڑنے لگی چوہدری صاحب کی اس خواہش کے پیچھے کوئی پیچیدہ پلاٹ کہانی یا راز کی بات نہیں تھی نہ ہی کوئی ایسا فلسفہ تھا جو کسی دین مذہب یا عقیدے سے جڑتا ہوا ایک سیدھی سادی انسانی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد ان کا نام ونشان باقی نہ رہے۔

"جب ہوں تو ہوں جب نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔"

برسوں پہلے یہ بات بیوی سے ہوئی تھی مگر جیتے جی کہاں کوئی ایسی تفصیل میں جھانک کر دیکھتا ہے اور اس بات اس خواہش کو پورا کرنا چوہدرانی کی محبت اور بھروسے کا ثبوت تھا یہ کیا آدمی آنکھوں سے اوجھل ہوا اور آپ تمام عہد و پیمان بھول گئے۔ چوہدرانی نے ایک بار ویرو کو بھیج کر رام چندر پنڈت کو بلانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن پنڈت ملا ہی نہیں اس کے چوکیدار نے کہا۔

"دیکھو بھائی! ہم جلانے سے پہلے منتر پڑھ کر چوہدری کو تلک ضرور لگائیں گے اور بھائی جو مر چکا اس کا دھرم اب کیسے بدلے گا تم زیادہ بحث تو کرو نہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ گیتا کے شلوک پڑھے بغیر کسی کو سکھ اگن دیں۔ ہم ایسا نہ کریں تو آتما ہم سب کو ستائے گی۔ تمہیں بھی ہمیں بھی چوہدری صاحب کے ہم پر بہت احسان ہیں ہم ان کی آتما کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" ویرو لوٹ آیا۔ وہ جب پنڈت کے گھر سے نکل رہا تھا تو پتا نے دیکھ لیا۔ اس نے جا کر مسجد میں خبر کر دی آگ جو گھٹ گھٹ کر ٹھنڈی ہونے لگی تھی پھر سے بھڑک اٹھی چار پانچ معتبر مسلمانوں نے تو اپنا قطعی فیصلہ بھی سنا دیا۔ ان پر چوہدری کے بہت احسان تھے سب نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ ان کی روح کو بھٹکنے نہیں دیں گے مسجد کے پچھواڑے والے قبرستان میں قبر کھودنے کا حکم بھی دے دیا گیا۔ شام ہوتے کچھ لوگ پھر حویلی میں آدھمکے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چوہدرانی کو ڈرا دھمکا کر اس سے چوہدری کا وصیت نامہ حاصل کیا جائے پھر اسے جلا دیا جائے جب وصیت نامہ ہی نہیں رہے گا تو بڑھیا کیا کرے گی۔ چوہدرانی نے بھی شاید بھانپ لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے وصیت نامہ چھپا دیا۔ جب لوگوں نے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو وہ بولی۔

"مولوی خیر الدین سے پوچھ لو۔ انہوں نے وصیت دیکھی اور پوری پڑھی ہے۔"

"اگر وہ انکار کر دیں تو؟"

"قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر انکار کر دیں تو دکھا دوں گی ورنہ......"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ کچہری میں دیکھنا۔"

بات کچہری تک جا سکتی ہے یہ بھی واضح ہو گیا۔ ممکن ہے چوہدرانی شہر سے اپنے وکیل اور پولیس کو بلوا لے۔ وہ پولیس کی موجودگی میں اپنے ارادے پر عمل کر سکتی تھی کیا پتا وہ اب تک انہیں بلوا بھی چکی ہو۔ ورنہ شوہر کی لاش برف کی سلوں پر رکھ کر کوئی کیسے اتنی خود اعتمادی سے بات کر سکتا

ہے۔ رات کے وقت خبریں افواہوں کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ کسی نے کہا

''ایک گھوڑ اسوار ابھی ابھی شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے گھڑ سوار نے سر اور منہ صافے سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ چوہدری کی حویلی سے ہی آ رہا تھا۔''

ایک نے تو اسے چوہدری کے اصطبل سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ کھادو کا کہنا تھا کہ اس نے حویلی کے پچھلے احاطے میں صرف لکڑیاں کٹنے کی آواز ہی نہیں سنی بلکہ پیڑ گرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ چوہدرانی یقیناً پچھلے احاطے میں چتا تیار کرنے کا انتظام کر رہی ہیں۔ کلو کا خون کھول اٹھا۔

''بزدلو! آج رات ایک مسلمان کو چتا پر جلایا جائے گا اور تم سب یہاں بیٹھے آگ کی لپٹیں دیکھو گے۔''

کلو اپنے اڈے سے باہر نکلا۔ خون خرابہ اس کا پیشہ ہے تو کیا ہوا؟ ایمان بھی تو کوئی چیز ہے۔

''ایمان سے عزیز تو ماں بھی نہیں ہوتی یارو۔''

چار پانچ ساتھیوں کو لے کر کلو پچھلی دیوار سے حویلی پر چڑھ گیا۔ بڑھیا اکیلی بیٹھی تھی لاش کے پاس۔ چونکنے سے پہلے ہی کلو کی کلہاڑی سر سے گزر گئی۔ انہوں نے چوہدری کی لاش کو اٹھایا اور مسجد کے پچھواڑے لے گئے جہاں اس کی قبر تیار تھی۔ جاتے جاتے رمضو نے پوچھا۔

''صبح چوہدرانی کی لاش ملے گی تو کیا ہوگا؟''

''بڑھیا مر گئی کیا؟''

''سر تو پھٹ گیا تھا صبح تک کیا بچے گی؟''

کلو نے پلٹ کر چوہدرانی کی خواب گاہ کی طرف دیکھا۔ پنا کلو کی نظروں کی بات سمجھ گیا۔

''تو چل استاد تیرا جگرا کیا سوچ رہا ہے میں جانتا ہوں۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ کلو قبرستان کی طرف نکل گیا۔ رات جب چوہدری کی خواب گاہ سے آسمان کو چھوتی لپٹیں نکل رہی تھیں تو سارا قصبہ دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ زندہ جلا دیئے گئے تھے اور مردے دفن ہو چکے تھے۔

گوشۂ ابن صفی

منظر نگاری اور تجسس کا امام

ڈاکٹر ایثار احمد صفی

ابن صفی کی شخصیت اور فن پر ان کے فرزند ڈاکٹر ایثار احمد صفی اظہار کرتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ان کا مضمون پیش خدمت ہے۔



اردو میں جاسوسی ادب کا طبع زاد ناول نگار ابن صفی کو مانا جاتا ہے۔ ابن صفی نے اس دور میں جاسوسی ادب کے اندر جرت طرازی کے اسلوب کو اپنایا جب کہ اردو میں صرف چند تراجم ہی ملتے ہیں۔ ابن صفی اپریل 1968ء مین آلہ آباد کے قصبہ نارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آلہ آباد میں ہی حاصل کی۔ وہیں پلے بڑھے اور اپنی جدت پسند طبیعت کے باعث اردو کے جاسوسی ادب پر طبع آزمائی کی۔ چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی اس لیے شاعرانہ مزاج نے اس میں چاشنی پیدا کردی اور جاسوسی ادب جیسا خشک مضمون بھی دلکش اور پرتجسس بن گیا۔ ان کے قلم سے نکلنے والی کہانی میں جو روانی ہوتی تھی اس میں وہ منظر کشی اور تجسس کے رنگ بھرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی کہانیوں میں گم ہوجاتا تھا اسی لیے کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ وہ واحد مصنف تھے جن کے ناول ایک نشست میں ختم کیے جاتے ہیں۔ کسی بھی ادیب کو اپنی تحریر میں رنگ بھرنے کے لیے خوبصورت مناظر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ ان میں رنگ بھی وہی بھر سکتا ہے جس کی سوچ شاعرانہ ہو یا خود شاعر ہو۔ ابن صفی چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور بارہ برس کی عمر میں جگر اور داغ کے انداز کی شاعری کر لیتے تھے جس کی مثال یہ قطعی ہے۔

ہمیں تو ہے مئے گل رنگ وگل رکاں سے غرض
بنائے کفر پڑی کس طرح خدا جانے
بس اتنا یاد ہے اسرار وقت مئے نوشی
کسی کی یاد بھی آتی تھی ہم کو سمجھانے

ابن صفی جب اپنی کسی کہانی کا پلاٹ ترتیب دیتے ہیں تو وہ مناظر حالات کا بغور اور باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ جس کو پڑھنے کے بعد قاری واقعات کے پس منظر میں کھو جاتا ہے۔

منظر کشی کے اصول کے تحت ایک تخلیق کار کو اس منظر کی تمام جزیات کا علم ہونا ضروری ہے وہ اس کو اس خوب صورتی سے بیان کرے کہ قاری کا ذہن اسے فوراً قبول کر لے۔ اسی طرح کسی کے مزاج اور

کردار کے بارے میں بیان کرنے لگے تو اس مخصوص طبیعت کے لوگوں کے مزاج کا بغور مشاہدہ کر لے تاکہ کوئی بات متضاد نہ لگے۔ حتیٰ کہ اسے ان کے سوچنے کا انداز بھی پتہ ہو۔ یہ بات اس وقت زیادہ اہم ہوتی ہے جب وہ کسی ایک خاص نقطۂ نگاہ کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہو۔ یا کسی خاص ملک کے لوگوں کا رہن سہن ظاہر کرنا چاہتا ہو۔ اس ضمن میں' میں ذاتی طور پر ایڈلاوا سیریز کا حوالہ دینا ناگزیر سمجھتا ہوں۔ جس میں عمران ایک مشن پر اٹلی جاتا ہے۔ ان ناولوں میں جس خوب صورتی سے اطالوی معاشرے مقامات اور لوگوں کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس میں رہا ہو۔ راقم الحروم کو کیونکہ اٹلی میں تعلیم کے دوران خاصا وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اس لیے وہاں کے مقامات اور معاشرتی معاملات کو بالکل ویسا ہی پایا جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے۔ وہ شارع ویا نومینسیتانا ہو یا تیسرے درجے کا ہوٹل یا بزار یا کوموکی جھیل یا سسلی کے ساحل سمندر۔ کوئی بھی اس قدر عمدہ اور دلکش عکاسی کو دیکھ کر یہ نہیں کرسکتا کہ اس ناول کا تخلیق کار کبھی اس ملک میں نہیں آیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی نے پاکستان بنے کے بعد سوائے ہجرت کے کوئی سفر ملک سے باہر نہیں کیا۔ ان کے اپنے علم کا طلسم تھا کہ وہ نقشہ اس خوبی سے کھینچتے تھے کہ قاری کو احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خود اس ماحول میں ہو۔ چاہے وہ عمران کا لندن کا سفر ہو یا افریقہ کے جنگلوں کا یا برازیل میں دریائے ایمیزن کے کنارے۔

ابن صفی کی تحریروں کی دوسری بڑی خاصیت تجسس ہے۔ وہ کہانی کا جال کچھ اس انداز میں پھیلاتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے جس کا ازالہ وہ اس کو ایک نشست میں پڑھ کر کرتا ہے۔ جس زمانے میں دوسرے ناول کے لیے پڑھنے والے کو ایک ماہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا وہ انتہائی کرب سے گزرتا تھا۔ ابن صفی کے مداح آپس میں بیٹھ کر کرداروں اور واقعات پر بحث کرتے تھے ان کے قلم کے سحر زدہ مداحوں کا انداز بھی کچھ اس طرح ہوتا جیسا کہ آج کل بیٹھ کر سیاست یا حالات حاضرہ پر بحث ہوتی ہے۔ کسی بھی ادیب کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ لوگ اس کی تحریر کے منتظر رہیں۔ لوگ ان کو خطوط لکھ کر اور مل کر اپنی بے چینی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ شائد لوگوں کے علم میں نہ ہو جو مصنف فکشن کے اعلیٰ مقام پر فائز تھا جس کے تخیل پر بہت سی ایجادوں نے جنم لیا۔ جس کی سوچ ہمیشہ آسمانوں سے اونچی اڑتی تھی۔ ان کے تخیل کی پرواز طلسم ہوشربا کی ان جلدوں کے مرہون منت تھی جو سات برس کی عمر میں ان کی گھٹی میں اتر چکا تھا۔ ان کے کردار عمران فریدی سنگت ہی اور تھریسیا انہی کی طرح پر تجسس طور پر کام کرتے نظر آتے ہیں جیسے کہ کوئی طلسم ہوشربا کی داستان کے کردار ہوں۔ ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے طلسم ہوشربا کو دور جدید کے نئے زاویے میں لکھ ڈالا۔ جس نے ان کے کرداروں کو پڑھا وہ انہی کا ہو رہا۔ پھر کچھ دوسرے نقال لکھنے والوں نے بھی انہی خطوط پر لکھنا چاہا لیکن ابن صفی کا قاری اصل اور نقل کی کسوٹی پر پرکھنے لگا۔ وہ چند سطریں پڑھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ تحریر کس کی ہے۔ یہ ابن صفی کے قلم کا کمال تھا کہ انہوں نے تین نسلوں کے ذہن پر حکومت کی۔ ابن صفی کے ناولوں میں تجسس کا ایک ایسا جال بنتا ہے کہ قاری خود کو اس کہانی کا کردار سمجھنے لگتا ہے۔ قاری کو پتہ ہے کہ کرنل فریدی کہانی میں کب داخل ہو گیا۔ اگر فریدی مجرموں سے برسرپیکار بھی ہے اور اس نے کوئی اور روپ دھار رکھا' قاری اس روپ کو پہچانتا اور اس کے کارناموں پر متحیر ہوتا ہے اور آخر میں دوسرے کرداروں پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ اصل میں فریدی تھا قاری

اپنے دل میں خوش ہوتا ہے کہ مجھی تو پہلے ہی معلوم تھا یہ اپنے دام میں حصار کرنے کے لیے وہ گر تھا جو صرف ابن صفی کے یہاں ملتا ہے قاری کرداروں کے ساتھ قلبی رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ جاسوسی ناول زمین کے بادل میں فریدی اور عمران کو یکجا کر کے زیرو لینڈ کیسر کوبی کے لیے بھیجا۔ فریدی پسندوں کی شکایت تھی کہ عمران نے فریدی کے مرتبے کے اعتبار سے گفتگو نہیں کی۔ عمران پسندوں کو اعتراض تھا کہ یہ کیس فریدی صاحب کا نہیں تھا۔ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ وہ ایک دن دنیا کو بتائیں گے کہ زیرو لینڈ کہاں ہے؟ یہی وجہ تھی کہ ابن صفی نے زمین کے بادل کے بعد ان دو کرداروں کو کبھی اکٹھا نہیں کیا۔

عمران کا کردار اپنی نوعیت کا واحد کردار ہے وہ ایسے کھلنڈرے مگر تعلیم یافتہ نوجوان کا کردار ہے جس کا ظاہری رویہ لاپرواہی اور مسخرہ پن کا مظہر ہے۔ جس کو اس کے باپ جو انٹیلی جنس سروس کے ڈائریکٹر جنرل ہیں اس کی حرکتوں کے باعث گھر سے الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن اصل روپ کچھ اور ہے فارن سیکریٹری کے تحت ایک سپر سیکرٹ سروس کا انچارج اور اعلیٰ عہدیدار ہے جس کو اس کے ماتحت ایکس ٹو کے نام سے جانتے ہیں۔



وہ ٹیلی فون پر ان سے رابطہ رکھتا ہے اس بات کا دعویٰ رکھتا ہے کہ اسے اس کے ماتحتوں کی پل پل کی خبر ہے اس آواز کی ہیبت سے ماتحت کانپتے ہیں۔ لیکن یہی عمران جب اپنی تمام تر حماقتوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو کوئی اس کو کاطر میں نہیں لاتا بلکہ اس کو چٹکیوں میں اڑا کر محظوظ ہوتے ہیں۔ اس تمام منظر اور تذبذب کے عالم سے جو اصل میں محظوظ ہوتا ہے وہ ہے عمران کا قاری۔ جو کہ اس کی ذہانت اور باریک بینیوں پر نظر رکھتا ہے اگر عمران کسی مصلحت کے سبب اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں ہوتا تو پھر بھی اپنی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچان لیا تا ہے۔ یہ ابن صفی کا قاری ہے جو غیر ارادی طور پر اس ناول کا حصہ بن جاتا ہے اور اتنی دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے جیسا کہ وہ تمام واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ ایک طرف قاری ابن صفی کا ناول پڑھ رہا ہوتا ہے دوسری طرف اپنے طور پر کیس کو حل کرنے میں مشغول ہوتا ہے لیکن کرداروں اور واقعات کی اونچ نیچ میں اتنا غرق ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ

ناول ایک نشست میں مکمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ابن صفی کے ناولوں میں جہاں سچائی اور قانون کی بالادستی دکھائی گئی ہے وہیں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے ذہنوں میں جھانک کر دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ کیسے سوچتے ہیں؟ان کی مجرمانہ ذہنیت کی ابتداء کیسے ہوتی ہے؟اور وہ لوگوں کو اپنے افکار سے کیسے متاثر کرتے ہیں اور اپنے ہم خیال کس طرح بناتے ہیں اور بین السطور یہ یہ سبق بھی دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی نشاندہی کی جائے اور ان کو قانون کے حوالے کیا جائے تا کہ معاشرہ سے جرائم اور لڑائی ختم ہو سکے۔دوسرے الفاظ میں ابن صفی اپنے قاری کو ہر خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کو ہوش مند شہری بنانا چاہتے ہیں ابن صفی کے قارئین یقیناً علامہ دہشتناک کا کردار نہ بھلا سکیں گے۔اسی طرح کے منفی کردار سنگ ہی اور تھریسیا بھی ہیں۔سنگ ہی ایک چالاک وعیار چینی نسل کا مجرم ہے جو اپنے مارشل آرٹ کی وجہ سے بہت پھرتیلا ہے۔اس کے مخالف کیمپ کی تھریسیا ہے جو تھری بی کہلاتی ہے ایک الگ دنیا رکھتی ہے انہوں نے ایک جزیرہ زیرولینڈ کے نام سے بنایا ہے جہاں وہ مجرموں اور معصوم لوگوں کو قید کر کے جرائم کی تعلیم دیتے ہیں۔زیرولینڈ دنیا والوں کے لیے ناقابل تسخیر ہے جرائم کی دنیا میں بھی اتحاد ہو جاتا ہے کبھی کبھی سنگ ہی اور تھریسیا مل کر بھی کام کرتے ہیں۔مگر ان کا سب سے بڑا مسئلہ عمران ہوتا ہے وہ دنیا کے کسی کونے میں کسی جرم کی ابتداء کرتے ہیں وہاں عمران کو کسی نہ کسی روپ میں اپنا مدمقابل پاتے ہیں۔کیونکہ عمران ہر لمحہ ان کے ارادوں کی خبر رکھتا ہے۔تجسس کے ان تمام مراحل میں قاری عمران کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔اس کا تجسس لمحہ لمحہ بڑھتا جاتا ہے اس کی تمام ہمدردیاں عمران کے ساتھ ہوتی ہیں کیونکہ عمران ایک نصب العین کے لیے کام کر رہا ہوتا ہے لیکن افسوس صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تمام تر کارنامہ عمران کا ہوتا ہے اور اسی کا کوئی ماتحت بحکم ایکس تو اسے جل دیکر نکل جاتا ہے وہاں بھی قاری یہ سوچ کر مطمئن رہتا ہے کہ سارے ماتحت تو نکمے ہیں اگر عمران نہ ہوتا تو یہ کارنامہ انجام پذیر نہ ہوتا۔وہ اپنے تیئں اس محکمے پر مہربانی سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔اب آپ ہی بتائیں جہاں مصنف اپنے قاری کیا عصاب پر اس قدر سوار ہو کیا وہ زندہ تحریریں نہیں ہیں؟ کیا یہ تجسس اور منظر نگاری کی انتہا نہیں ہے۔اگر کوئی اہل علم یا نقاد اسے نہ مانے تو یہ اس کا انفرادی فعل ہوگا۔انہوں نے اپنے مقام کا تعین خود ہی کر لیا تھا ان کا کہنا تھا کہ میری کتابیں بک شیلف پر نہیں بلکہ قاری کے تکیے کے نیچے ملتی ہیں۔"

جہاں بھی اردو زبان بولنے والے یا سمجھنے والے پائے جائیں گے وہاں ابن صفی کے تذکرے کے بغیر اردو زبان کا ذکر نامکمل رہے گا۔

اردو میں جاسوسی ادب کا بلوا آدم

عبدالحئی

آزادی سے قبل جب ترقی پسندی کا دور دورہ تھا اس وقت کے تقریباً تمام لکھنے والوں میں طنز ومزاح صاف دکھائی دے جاتا ہے سعادت حسن منٹو عصمت ......اور کرشن چندر کے علاوہ دوسرے ادیب وافسانہ نگار بھی طنز ومزاح سے بھری تحریروں میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔بعد میں آزادی کی لڑائی کے تیز ہونے کے بعد ادیبوں کو مزید موضوعات مل گئے۔فرقہ وارانہ فسادات انگریز حکومت کا حکم اور دیگر معاشی سیسی اور سماجی مسائل کو قلم کاروں نے اپنا موضوع بنایا۔اسی دوران ابن صفی نے اپنے قلم کا جادو بکھیرا اور



اس مشکل دور میں ابن صفی نے وہ کام کرنے کی ٹھانی جو ناممکن حد تک مشکل تھا۔ انہوں نے طنزیہ ومزاحیہ تحریریں تو لکھیں ساتھ ہی اسی پیرائے میں جاسوسی ناول بھی لکھنے شروع کیے جس کا مقصد قارئین میں اردو زبان وادب پڑھنے کا شوق ذوق پیدا کرنا تھا۔

ابن صفی نے مزاح میں بھی شائستگی اور وقار واحترام کو برقرار رکھا ہے۔ گھٹیا پن یا سستے بازاری جملوں اور فحش نگاری سے اعتراز کیا ہے وہ نہ صرف بلند پایہ مزاح نگار بلکہ صاحب اسلوب ظرافت نگار بھی تھے ان کے اسلوب اور طرز نگار پر اگر بات کی جائے تو ایک بڑا مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح کے الفاظ اور جس طرح کی زبان کا استعمال ان کی تحریریوں میں ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ ہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابن صفی اس معاملے میں اردو زبان کا سب سے بڑا ادیب ہے کہ اس کی تحریروں ارناولوں کے سب سے زیادہ رہے ہیں اردو کے کسی ادیب کے ناولوں اور...... کو اس قدر نہیں دہرایا گیا۔ ایچ اقبال‘ مظہر کلیم‘ ایم اے‘ ابن شفیع اور نہ جانے کتنے ناموں نے ابن صفی کی نقل کی اور ان کے کرداروں پر ناول لکھے لیکن وہ ابن صفی جیسا علم مطالعہ اور تخیل پردازی کہاں سے لاتے۔ ابن صفی جیسا دردمند دل اور اسلامی نظریات پر عمل پیرا دل ودماغ کہاں سے لاتے جو ...... میں صرف اللہ کی بڑائی چاہتا ہے جسے کسی از وزم سے لینا دینا نہیں ہے انہوں نے اصلاح کا مقصد سامنے رکھا مغرب پرستی اور روایت پسندی پر ان کے جملے تلخ وترش تو ہیں انداز کچھ ایسا ہے کہ ہمیں ناگوار نہیں گزرتا۔ زندگی اور اس جہاں ...... میں ایسا مسئلہ اور موضوع ہے جو ان کے ناولوں میں نہیں ملتا۔ آپ ان کے ناول پڑھتے جائیں اور کچھ دنوں بعد یقیناً خود آپ کو خوشگوار اور متاثر کن تبدیلی محسوس ہوگی۔

ابن صفی نے اپنے پرلطف اور چست جملوں سے ایک ایسا سرور مزاح پیدا کیا ہے جس سے پڑھنے والا بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جائے گا۔ گھٹنے گھٹنے سے بوجھل لمحات میں اچانک وہ مزاح کا کوئی نکتہ نکال لیتے ہیں کہ اسرار وتحیر کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں کو ہنسنے اور خالصتاً تفریح کرنے کا ایک موقع مل جاتا ہے۔ ایک ایک کا ذہن ہلکا پھلکا ہو جاتا ہیا اور دوسری طرف اس کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ ناول کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ابن صفی مزاح نگاری کو مزید گہرا کر دینے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ ملاحظہ ہو کے پہلے ہی ناول کا یہ اقتباس۔

”اوہ میری شادی۔“ فریدی نے ہنس کر کہا۔ سنو میاں شوکت میری شادی ہوتی تو تمہاری شادی کی نوبت نہ آتی۔“

”وہ کیسے؟“

”سیدھی سی بات ہے اگر میری شادی ہوگئی ہوتی تو بچوں کو دودھ پلاتا یا سراغ رسانی کرتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی شادی شدہ شخص کامیاب جاسوس نہیں ہوسکتا۔

”تب تو مجھے ابھی سے استعفیٰ دینا ہے۔ میں شادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حمید نے اتنی ...... سے کہا

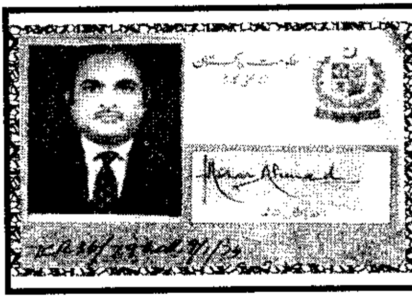
کہ سب ہنسنے لگے۔ دلیر مجرم 86-85۔

ابن صفی عام فہم اور عام بول چال کی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ نئے الفاظ اور نئی اصطلاحوں کی تلاش کرتے تھے اور انہیں مناسب موقع پر بڑے اچھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتے تھے۔ جب ہم عمران یا فریدی کے ہونٹوں سے ایسے جملے سنتے ہیں جو ہماری اپنی گھریلو زبان کا حصہ ہوں تو ہمیں اور بھی زیادہ مزہ آتا ہے۔ ابن صفی کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ پڑھنے والے کو ذہنی تناؤ سے نجات دلائیں۔ ابن صفی کچھ لمحے کے لیے اس کی دل جمعی کرتے ہیں اور اسے تفریح کا ایسا سامان مہیا کرتے ہیں کہ انسان اپنے سارے مسائل بھول کر ان کی جادوئی تحریر کے سحر میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ ابن صفی نے اپنے کرداروں کی تخلیق کرنے در آئی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوشش کریں گے۔ نئے معاشرے کی مجبوری تو یہ نظر آتی ہے کہ دوسروں پر جتنی تنقید کرسکتے ہو کرو مگر اس کے اچھے کاموں کی تعریف کرتے وقت فراخ دلی کا اظہار ہرگز مت کرو۔ کیونکہ ایسا کرنے یا اسے کچھ شہرت میں تخیل کی جس بلند پروازی سے کام لیا ہے وہ صرف ابن صفی ہی کرسکتا تھا۔ فریدی حمید اور عمران کو چھوڑ دیں تو قاسم جوزف اور ظفر الملک جیسے لازوال کردار تخلیق کرنے کا سہرا ابن صفی کے سر جاتا ہے۔ اپنے کرداروں کو جہاں وہ ایک عام انسان کی طرح پیش کرتے ہیں وہیں ان کی ناہموار شخصیت اور تہہ داری کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ گلہری خانم گلرخ یا ثریا سبھی کے کردار کچھ ایسے بن پڑے ہیں کہ وہ اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ مونگ کی دال اور شراب کی کچھ بوتلوں کی بات کریں تو ابن صفی نے ان کو اپنے مزاحیہ پیرائے میں کچھ اس طرح ڈھال دیا ہے کہ قاری بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ابن صفی نے ناولوں میں زیادہ سے زیادہ ایسی زبان استعمال کی جو ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کے دوران کرتے ہیں۔ ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارے یہ تو ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے۔ سرسید کی عام فہم نثر کی تحریک کو سب سے زیادہ جس ادیب نے عام کیا وہ ابن صفی تھے۔ اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ڈپلومیٹ مرغ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح میرا فن نہیں لوگ مذہب کے نام پر بڑی تعداد میں مارے جارہے ہیں اور دوسری جانب بھوک اور پیاس کی شدت انہیں لقمہ اجل بنانے کا سبب بن رہی ہے۔ کیونکہ بلکہ کمزوری ہے۔ کمزوری اس لیے کہ میں صاحب اقتدار نہیں ہوا صاحب اقتدار و اختیار ہوتا تو میرے ہاتھ میں قلم کی بجائے ڈنڈا آتا اور میں طنز کرنے یا مذاق اڑانے کی بجائے ہڈیاں توڑتا دکھ دیتا۔ الحمدللہ کہ میری یہ کمزوری قوم کی عافیت بن گئی اور قوم بلا واہ واہ نہ کرے سائے ہائے ہائے تو نہیں کرنی پڑے گی۔

ڈپٹی نذیر احمد رتن ناتھ سرشار منشی سجاد حسین کرشن' شوکت تھانوی عظیم بیگ چغتائی یا دیگر ناول نگاروں کی تحریریں لیں۔ جس طرح کا مزاحیہ انداز انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ابن صفی کے ناولوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ خوجی ظاہر دار بیگ حاجی مغلول چچا چھکن غفور میاں اور گوہر مرزا کردار آج اگر بے مثال اور لازوال ہیں ابن صفی کے کردار عمران' جوزف قاسم وغیرہ کو جاننے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ کردار بھی آج امر ہوچکے ہیں۔ آپ ابن صفی کی پہلی مزاحیہ تحریر فرار پڑھ لیں۔ کرشن چندر کی تحریر گدھے کی سرگزشت گدھے کی واپسی یاد آجائے گی۔ میں یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں سمجھتا کہ فرار گدھے کی سرگزشت کے مقابلے نہیں رکھا جاسکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے۔ دونوں کا مرکزی

کردار ایک گدھا ہے سماج سے معاشرے سے اکتایا ہوا ہے۔
ابن صفی کے تقریباً تمام ناولوں میں ہمیں طنز ومزاح مل رہا ہے جاسوسی دنیا اور عمران سیریز دونوں کے پلاٹ اور کردار مختلف رہے ہیں اور طنز ومزاح کے موضوعات میں بھی شائبہ نہیں نظر آتا۔ جاسوسی دنیا کے ناول بوڑھا ہولناک ویرانے پاگل خانے کا قیدی شعلہ سیر شیطان کی محبوبہ شادی کا ہنگامہ مونچھ مونڈ نے والی صحرائی دیوانہ گارڈ کا اغوا وغیرہ اور عمران سیریز کے خوفناک عمارت رات کا شہزادہ لاشوں کا بزار گمشدہ شہزادہ حماقت کا جال رائی کا پربت پاگلوں کی انجمن میں طنز ومزاح ظرافت کی ایسی حسین دلکشی اور شگفتگی ملے گی جو کسی دوسرے کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ ان ناولوں کے نام یہاں لکھنے کا ہرگز مقصد نہیں کہ دوسرے ناولوں میں طنز ومزاح نہیں بلکہ ان تمام ناولوں میں طنز ومزاح اور ظرافت کے عناصر واضح طور پر آئیں گے۔ پرنس چلیکا ذکر نہ کیا جائے تو یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا۔ پرنس چلی کو پڑھ کر آپ کو سرشار کے کوجی اور آزاد نذیر کے طاہر دار بیگ رسوا کے گوہر مرزا منشی سجاد حسین کے حاجی بغلول اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کی یاد آ جائے گی۔
ابن صفی نہ صرف جاسوسی ادب کا بلکہ اردو ادب کا ایک اہم نام جس نے ادب کی تمام اہم اسناف میں طبع آزمائی کی۔ ورنہ صرف جاسوسی ادب مزاحیہ ادب بلکہ شاعری میں بھی اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی طنز ومزاح نگاری پر پوری تحقیق ہونے چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل ابن صفی کا مطالعہ کرے اور تحریروں پر تحقیق کر کے نئے گوشوں اور نئے پہلوؤں کو سامنے لائے تبھی ہم اس عظیم ادیب کا قرض ادا کر سکیں گے۔ ادیب کے بڑے بڑے ناقدین ضمنی طور پر ابن صفی کا تذکرہ کر کے اپنا خراج نہیں کر سکتے انہیں جلد یا بدیر ابن صفی پر قلم اٹھانا ہی پڑے گا۔ ابن صفی کی تشریح کرنی ہوگی اور انہیں وہ مقام دینے پر مجبور ہونا پڑے گا جس کا ابن صفی حقدار ہیں۔
ظفر الما لک اور جیمسن سے عمران کی پہلی ملاقات
''ارے اس کی کیا ضرورت ہے میں تو یونہی۔'' ظفر نے جملہ پورا نہیں کیا۔
''نہیں میرے دوست۔'' اجنبی بولا۔ ''انکار کر کے تم ایک پچی کا دل توڑ دو گے۔''
''اچھا اچھا!'' ظفر مسکرایا۔
''ایک بات۔'' جمن بولا۔ ''پاس ذرا میری ایک بات الگ سن لو۔''
جمن نے ظفر کو کمپارٹمنٹ کے دوسرے سرے پر لے جا کر آہستہ سے کہا۔
''رقم نکال کر مجھے دیتے جایئے ورنہ لباس کے ساتھ رقم بھی جائے گی ہم نہیں جانتے کہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔''
''اچھا اچھا۔'' ظفر نے جیب سے پرس نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
''دراصل مجھے ایک کوٹ کی ضرورت ہے سردی بڑھ گئی ہے۔ تمہارے پاس تو اوور کوٹ ہے میں صرف قمیض میں ہوں۔''
پھر دس منٹ کے اندر ہی انہوں نے آپس میں اپنے لباس بدل لئے تھے۔
''بیوٹی فل!'' اجنبی اسے نیچے سے اوپر تک دیکھتا ہوا اچھل پڑا۔

"چار منگ!" جمن داڑھی کھجاتا ہوا بولا۔
"پرنس چار منگ کہو!" ظفر نے قہقہہ لگایا۔
"اب ہم اطمینان سے گفتگو کریں گے۔" اجنبی بیٹھتا ہوا بولا۔
"میں سردار گڑھ جا رہا ہوں۔" ظفر نے کہا اور اپنی کہانی شروع کر دی۔ اجنبی کے چہرے پر کبھی احمقانہ حیرت کے آثار نظر آتے اور کبھی وہ بے حد مغموم دکھائی دینے لگا۔
ظفر کے خاموش ہوتے ہی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
"تمہاری داستان بڑی پر درد ہے۔" ایسے بے درد چچا کو دور سے سلام...... اللہ کی قدرت ہے کہ اجنبی لڑکیاں تو والد صاحب ثابت ہوں اور سگا چچا ایسی نالائق پر اتر آئے۔"



ظفر کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا عجیب دیس ہے۔ دو ہستیوں سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور دونوں ہی عجیب ثابت ہوئیں۔ ایک وہ لڑکی تھی جس نے سر راہ ملازمت کا انتظام کر دیا اور دوسرا یہ جو زبردستی اپنا قیمتی لباس اس کے معمولی قمیض اور پتلون کے عیوض حوالے کر چلا ہے۔

لاہور کراچی اور چراغ حسن حسرت

میم سین بٹ

مجھے شہروں میں سب سے زیادہ لاہور پسند ہے یوں تو مجھے اپنی جنم بھومی سیالکوٹ شہر سے بھی بے حد لگاؤ ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لاہور واقعی لاہور ہے اس کا کوئی متبادل نہیں۔ زندگی بسر کرنے کا مزہ اسی شہر بے مثال مین آتا ہے جو کوئی ایک بار یہاں آ گیا پھر لوٹ کر نہ جا سکا۔ اس شہر کی محبت نے اسے جکڑ لیا اور اپنے آبائی علاقے میں واپس نہ جانے دیا۔ بڑے بڑے ادیب شاعری اور صحافی دانشور و اعلیٰ تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں اپنا اپنا شہر قصبہ یا گاؤں چھوڑ کر لاہور آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ معروف ادیبوں شاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد علامہ اقبال حفیظ جالندھری' فیض احمد فیض سیف الدین سیف احمد ندیم قاسمی ظہیر کاشمیری صوفی تبسم 'احمد راہی' اے حمید 'شہزاد احمد' اشفاق احمد' بانو قدسیہ عارف عبدالمتین 'عبدالعزیز خالد' منیر نیازی' ظفر اقبال' عطاء الحق' قاسمی' مستنصر حسین تارڑ' فکر زمان صحافیوں میں منشی محبوب عالم منشی محمد الدین فوق' مولانا ظفر علی خاں' مولانا چراغ حسن حسرت' مولانا عبدالمجید سالک' مولانا غلام رسول مہر' مولانا مرتضیٰ احمد میکش' بابا وقار انبالوی' حاجی لق لق' میاں محمد شفیع' حمید اختر' احمد بشیر' قمر اجنالوی' حمید نظامی' مجید نظامی' حمید جہلمی' منو بھائی' شفقت تنویر مرزا' ظہور عالم شہید' عبدالقادر حسن الطاف حسن قریشی' مجیب الرحمان شامی' علی سفیان آفاقی' نذیر ناجی' عباس اطہر' اطہر مسعود اظہر جاوید' نذیر حق' اسد اللہ غالب اور جناب ضیاء شاہد جیسے بڑے لوگ لاہور میں پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن لاہور نے انہیں ادب وصحافت میں

شناخت دی اور ان شخصیات کی وجہ سے ہی یہ شہر لاہور کہلاتا ہے۔ لاہور کے بعد مجھے کراچی شہر پسند ہے لیکن اپنی زندگی میں، میں اب تک صرف ایک بار کراچی جاسکا ہوں بلکہ برسوں قبل میں اور میری فیملی لاہور سے سعودی عرب جانے کے لیے کراچی سے گزرے تھے اور اگلے برس واپسی پر کراچی کے راستے لاہور آ گئے تھے۔ سعودیہ جاتے ہوئے تو ہم نے کراچی کے ایک ہوٹل میں رات بسر کی تھی مگر واپسی پر اسی روز کراچی کے نئے ایئرپورٹ سے پرانے ایئرپورٹ پر پہنچ کر لاہور کی فلائٹ پکڑ لی تھی یوں ہم کراچی کی سیر کر سکے نہ مزار قائد پر جاسکے نہ ساحل سمندر کا نظارہ کر سکے۔ صدر بازار کورنگی، ناظم آباد وغیرہ جیسے مشہور علاقے بھی نہ دیکھ پائے۔ البتہ بہت بعد میں ایک عشرہ قبل روزنامہ خبریں لاہور کے نیوز روم میں کراچی ڈیسک پر برسوں نائٹ ڈیوٹی کرنے کی وجہ سے ہمیں روحانی یا خیالی طور پر کراچی بھر میں گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا تھا اور ہم برسوں یہی محسوس کرتے رہے کہ کراچی میں رہ رہے ہیں بلکہ دن کو ہم لاہور اور رات کے وقت کراچی میں رہا کرتے تھے گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے لیا کرتے تھے۔

کراچی سے ہمیں لڑکپن میں ہی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہمارے پسندیدہ جاسوسی ناول نگار ابن صفی کراچی میں رہتے تھے۔ اب ان کے ایک صاحبزادے احمد صفی ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہتے ہیں کراچی سے ہی ابن صفی کے تحریر کردہ عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ناول اسرار پبلی کیشنز کے تحت شائع ہوتے تھے بعد ازاں سلطان محمد ڈوگر نے لاہور میں بیڈن روڈ چوک میکلوڈ روڈ سے اسرار پبلی کیشنز کے تحت ہی ابن صفی کے ناول چھاپنا شروع کر دیئے تھے بلکہ یاد آیا ابن صفی کے شاگرد ڈاکٹر مشتاق احمد قریشی کراچی سے ابن صفی میگزین اور نیا رخ ڈائجسٹ بھی شائع کیا کرتے تھے۔ ابن صفی میگزین میں وہ ہر ماہ عمران سیریز اور نیا رخ ڈائجسٹ میں جاسوسی دنیا یعنی انسپکٹر بعد ازاں اعزازی کرنل فریدی اور سارجنٹ بعد ازاں اعزازی کیپٹن حمید کے پرانے ناول چھاپا کرتے تھے۔ ابن صفی میگزین میں ابن صفی مرحوم سلسلے وار کہانیاں بلدران کی ملکہ اور ملا دو پیازہ بھی لکھا کرتے تھے اس میں وہ اپنے اصل نام اسرار احمد ناروی سے ہر ماہ اپنی ایک غزل بھی شائع کیا کرتے تھے ان کا اکلوتا شعری مجموعہ متاع قلب ونظر ابھی کچھ عرصہ قبل چھپا ہے۔ ابن صفی میگزین کا 1980ء کی دہائی کے آخری برسوں میں نئے افق ڈائجسٹ نام رکھ دیا گیا تھا۔ ابن صفی میگزین بعد ازاں نئے افق ڈائجسٹ اور نیا رخ ڈائجسٹ کے ذریعے میں نے آزادی کے بعد سے لے کر اپنے ہوش سنبھالنے سے پہلے تک شائع ہونے والے ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے تمام پرانے ناول بھی پڑھ لیے تھے بلکہ بعد ازاں لاہور سے سلطان محمد ڈوگر کی جانب سے شائع کردہ ابن صفی کی دونوں سیریز کے تمام ناول بذریعہ ڈاک منگوا کر اپنی ذاتی کا شر لائبریری میں رکھ لیے تھے اور اپنے دوستوں کو مفت پڑھنے کے لیے دیا کرتا تھا میں نے لکھنے لکھانے کا آغاز بھی کراچی کے رسائل سے کیا تھا پہلے تو میں ابن صفی کے شاگرد ڈاکٹر مشتاق احمد قریشی کے نئے افق اور نیا رخ ڈائجسٹ پڑھ کر ہر ماہ تبصرہ نما خطوط لکھا کرتا تھا جو دونوں ڈائجسٹوں میں شائع ہوتے رہتے تھے پھر میں نے ریاض احمد منصوری کے شوبز میگزین ماہنامہ ٹی وی ٹائمز کراچی میں لکھنا شرع کر دیا تھا۔ اس رسالے کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر اسپنسر بلڈنگ میں ہوتا تھا۔ ٹی وی ڈرامہ نگار حسینہ معین ماہنامہ ٹی وی ٹائمز کے چیف ایڈیٹر اور محمود احمد مودی ایڈیٹر رہے تھے ماہنامہ ٹی وی ٹائمز کراچی میں میرے پانچ درجن سے زائد مضامین شائع ہوئے۔

اسلام آباد سے پہلے کراچی وفاقی دارالحکومت ہوا کرتا تھالہذا لاہور کے بہت سے ادیب شاعر صحافی دانشور بسلسلہ ملازمت کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے تھے ان میں مولانا چراغ حسن حسرت مولانا عبدالمجید سالک حفیظ جالندھری فیض احمد فیض ابن انشاء احمد بشیر حبیب جالب قدرت اللہ شہاب الطاف گوہر شفیع عقیل ضیاء الحق قاسمی ضیاء شاہد سجاد میر مجیب الرحمان شامی کے نام ہمیں یاد رہ گئے ہیں۔ عبداللہ علیم کے والد سیالکوٹ سے کراچی گئے تھے۔ اب بھی پنجاب سے تعلق رکھنے والے متعدد ادیب شاعر ڈرامہ نگار اور صحافی دانشور کراچی میں مقیم ہیں ان میں محمود شام محمود احمد مودی اور صابر ظفر بھی شامل ہیں۔ کسی زمانے میں کراچی روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا لاہور کے بعد کراچی ہی ملک کا دوسرا بڑا فلمی مرکز ہوتا تھا وہاں بہت سی یادگار اردو فلمیں بنی تھیں۔ فلمی ہیرو وحید مراد مرحوم کے والد بھی سیالکوٹ سے کراچی منتقل ہوئے تھے بلکہ اداکار جاوید شیخ اور سلیم شیخ کے والد بھی راولپنڈی سے کراچی منتقل ہوئے تھے۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں وی سی آر کی وبا آنے سے فلمی صنعت تباہ ہوگئی تھی۔ اسی دور میں بننے والی ایم کیو ایم نے کراچی سے روشنیاں چھین لی تھیں اور کراچی بھتے بوری بند لاشوں کا شہر بن کر رہ گیا تھا تاہم اب حالات بہت حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت تقسیم ہند کے چند برس بعد بسلسلہ ملازمت لاہور سے کراچی جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے کراچی اور لاہور کے عنوان سے اپنے مضمون میں دونوں شہروں کا خوب موازنہ کیا تھا مولانا چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں ایک زمانے میں دلی اور لاہور حریف سمجھے جاتے تھے۔ اب کراچی اور لاہور حریف اور مد مقابل سمجھے جاتے ہیں۔ کراچی کے مقابلے میں کسی شہر کا نام آتا ہے تو وہ لاہور ہی ہے ہم نہ کراچی کے طرف دار ہیں نہ لاہور کے لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ لاہور میں جو بھاری بھرکم پن ہے وہ کراچی میں نام کو نہیں۔ کراچی عزت اور مرتبہ میں لاہور سے آگے سہی لیکن لاہور کا سا وقار کہاں سے لائے گا۔



کراچی میں مزار قائد ہے تو لاہور میں مزار اقبال ہے۔ کراچی میں سمندر ہے تو لاہور میں دریائے راوی ہے کراچی میں طارق روڈ اور صدر بازار ہے تو لاہور میں مال روڈ اور انارکلی بازار ہے لیکن لاہور جیسے تاریخی مقامات کراچی میں نہیں پائے جاتے کیونکہ کراچی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں جب کہ لاہور صدیوں پرانا شہر ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کے بقول کراچی میں بڑی خوبیاں سہی لیکن شاہی قلعہ شاہی مسجد شالامار باغ نور جہاں و جہانگیر کا مقبرہ کامران کی بارہ دری اور حضوری باغ کہاں سے لائے گا۔ پھر نہ وہاں بھاٹی دروازہ ہے نہ موچی دروازہ نہ کدہ شاہ کا تکیہ نہ داتا دربار نہ وہاں ایسے چلے تن جو چلے کے بارے میں ململ کے کرتے پہنتے ہیں۔ لسی پیتے ہیں اور ہیر وارث شاہ پڑھتے ہیں توبہ کیجئے کہاں کراچی کہاں لاہور؟ صاف ستھری سڑکیں اور سمندر کے قریب سے کوئی شہر سچ مچ شہر نہیں بن جاتا۔ ذرا آپ ہی خدا لگتی کہیے جس شہر میں منڈ پانچ موڑتوں کی آواز سننے میں نہیں آتی وہ بھی

کوئی شہر ہے؟''
لاہور آنے والے لوگ شہر بے مثال اور یہاں کے شہریوں کی تعریف وتوصیف کیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گزشتہ روز کراچی کے لارڈ میئر وسیم اختر نے دورہ لاہور کے دوران لاہوریوں کی مہمان نوازی اور وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کے ترقیاتی کاموں کی تعریف کرتے ہوئے میٹرو بس سروس اور میٹرو اورنج لائن ٹرین منصوبوں کو لاہوریوں کے لیے انمول تحفے قرار دیا ہے اب یقیناً لاہور کے لارڈ میئر مبشر جاوید بھی جلد کراچی کا دورہ کریں گے۔ ملک کے دونوں بڑے شہروں میں بلند یہ عظمیٰ کے پلیٹ فارم سے یہ غالباً پہلا رابطہ قائم ہوا ہے۔ یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہنا چاہئے۔ لاہور صدیوں سے علم وادب اور ثقافت کا مرکز چلا آ رہا ہے اور مزید کئی صدیوں تک اپنی یہ حیثیت برقرار رکھے گا۔ لوگ دور دور سے یہاں آتے رہیں گے اور اس شہر بے مثال کے مکین بنتے رہیں گے۔
مولانا چراغ حسن حسرت لاہور کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں لاہور میں سنجیدگی اور متانت ہے آخر عمر کا فرق بھی کوئی چیز ہے لاہور دواڑھائی ہزار سال پرانا بڈھا کراچی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش کہاں کراچی کہاں لاہور؟ لاہور میں وقار ہے علم ہے اور علم بھی تو ہے یہاں کی ادبی محفلیں یہاں کی لائبریریاں یہاں کے کالج اور اسکول یہاں کے اخبار کراچی میں کہاں؟ یہ چیزیں بھی میسر ہو جائیں تو نوعمر کراچی بڈھے لاہور کی سی شفقت کہاں سے لائے گا؟ لاہور وسط ایشیا کی سب سے بڑی شاہراہ پر کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ مسکراہٹ کے نور سے جگمگا رہا ہے اور آنکھیں کہہ رہی ہیں میاں جھجکتے کیوں ہو آؤ یہاں تم جیسوں کے لیے جگہ موجود ہے۔

جاسوسی ادب کے بانی ابن صفی

مشتاق سہیل

1963ء میں ہم چار دوستوں نے ناظم آباد میں ایک مکان کرائے پر لیا اس سے قبل سی ون ایریا لیاقت آباد میں کرائے کے ایک مکان میں اوپر کی منزل میں جوں توں گزارا کر رہے تھے لیکن مالک مکان نے زندگی اجیرن کر دی عجیب سنکی آدمی تھا چار چھڑوں کو برداشت نہ کرسکا، حالانکہ چاروں ''چھڑے'' اپنی اپنی جگہ شرافت کا مثالی نمونہ تھے مکان خالی کرنے کا نوٹس ملا تو وجہ پوچھی بولا ''کوئی وجہ نہیں لیکن چار افراد کی گنجائش نہیں ہے۔'' دو کمرے چار چار پائیاں بظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی لیکن چاروں میں نسبتاً بزرگ اور سنجیدہ مزاج نعمت اللہ صاحب نے انتہائی شرافت اور متانت سے مکان چھوڑنے کی حامی بھر لی، تھوڑی سی مہلت مانگی، مالک مکان خاموشی سے چلا گیا لیکن بعد کے دنوں میں کبھی اوپر کی منزل کا پانی بند کبھی بجلی غائب، مکان کی تلاش شروع ہوئی ناظم آباد میں ایک اچھا پورشن مل گیا ہمارا سامان زیست ایک صندوق ایک چار پائی چاروں نے اپنا اپنا بوجھ گاڑی میں لادا اور ناظم آباد چلے آئے صاف ستھرا علاقہ مالک مکان ایک بوڑھی خاتون، سخت مزاج، اکھڑ پن کی تصویر بنی رہتی لیکن گزارا کرنا تھا میں نے اپنی کم عمری کا فائدہ اٹھایا اور خالہ کا رشتہ قائم کر لیا دن آرام سے گزرنے لگے سودا سلف ناظم آباد چورنگی سے لاتے تھے واپسی میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک شخص کو لکھنے میں مصروف پاتے تو حیرت ہوتی کہ کیسا شخص ہے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے سے گریزاں ہے ایک روز نعمت اللہ صاحب کے ہمراہ گھر کا

سامان لے کر اِدھر سے گزر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب جاسوسی دنیا کے عظیم ادیب ابن صفی ہیں ہمیں جاسوسی ناولوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی بس سفر کے دوران وقت گزارنے کے لیے کوئی جاسوسی ناول ہاتھ آ جاتا تو اسے پڑھ لیتے تھے ابن صفی سے کوئی تعارف تھا نہ میل ملاقات، لیکن آفس جاتے آتے ریگل چوک پر اوڈین سینما کے سامنے فٹ پاتھ پر دو تین اسٹالوں کے سامنے ہر پندرہ روز بعد لمبی قطاریں اور بے ہنگم ہجوم دیکھتے تھے ایک روز کیفیٹیریا آتے ہوئے نعیم آروی نے بتایا کہ یہ ہجوم ابن صفی کا نئے ناول خریدنے والوں کا ہوتا ہے ہر پندرہ روز بعد ان کا نیا جاسوسی ناول شائع ہو کر مارکیٹ میں آتا ہے تو ہاٹ کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھوں بک جاتا ہے، تجسس فطری تھا کہ آخر ابن صفی میں کون سی خوبی ہے ادبی محاسن اور خوبیوں کا اتنا ادراک نہیں تھا لیکن ادب خصوصاً افسانہ نگاری اور شعر و شاعری سے دلچسپی ضرور تھی، نعمت اللہ صاحب سے فرمائش کی کہ کسی دن ابن صفی سے ملا جائے انہوں نے سر ہلا دیا چند روز بعد ہی ہم دونوں ابن صفی کے کمرے میں تھے تعارف کیا کراتے بس عقیدت کا اظہار کیا متانت کی تصویر بنے ابن صفی نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا، رائٹنگ پیڈ ایک طرف رکھا اور باتیں کرنے لگے چند منٹ کی ملاقات، پوچھا ابن صفی کیا نام ہوا، بولے اصل نام اسرار احمد ہے آگرہ یونیورسٹی سے 1948ء میں بی اے کرنے کے بعد لکھنا شروع کیا تو ابتدا میں ذہن شاعری کی طرف مائل تھا اسرار ناروی تخلص اختیار کیا اور حمد، نعت، مرثیہ، غزل اور نظم سمیت تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن بعد میں اپنے لیے جاسوسی ادب کا انتخاب کیا، مختصر ملاقات میں بس تعارف ہو سکا، اٹھنے لگے تو انہوں نے اپنا ایک جاسوسی ناول دے دیا بولے اسے پڑھو مزہ آئے گا، گھر جا کر پڑھنا شروع کیا تو حیرت ہوئی عام ناولوں کی بجائے ان کے ناول میں مہم جوئی، ہلکے پھلکے تشدد، مزاح اور رومانس کے علاوہ ادب کی بھرپور چاشنی نے اپنے سحر میں جکڑ لیا غالباً عمران سیریز کا ناول تھا منجھے ہوئے مصنف کی طرح ابن صفی نے فریدی، حمید اور عمران وغیرہ کے مرکزی کرداروں کو اس انداز میں آگے بڑھایا کہ ناول ختم ہونے کا احساس ہی نہ ہوا جوزف، صفدر، جولیانہ اور کیپٹن فیاض جیسے کرداروں کے ساتھ کہانی آگے بڑھانے اور تجسس برقرار رکھنے میں ابن صفی کو جو ملکہ حاصل تھا وہ جاسوسی کتابیں لکھنے والے کسی اور ایرے غیرے مصنف کو نصیب نہ ہو سکا ابن صفی سے عقیدت بڑھی تو سر راہے دو چار ملاقاتیں ہو گئیں، طویل گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ دوران گفتگو لگتا تھا کہ مخاطب سے جان چھڑانا چاہتے ہیں، تاکہ اس کے جاتے ہی لکھنا شروع کر دیں لیکن رکھ رکھاؤ اور ان کا مہذب رویہ اس پر سلجھا ہوا انداز، ان سے بات چیت میں عجیب کشش محسوس ہوتی تھی انہوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ کسی کی نقل نہیں کرتے ان کے ناول انگریزی ناولوں کا ترجمہ بھی نہیں ہوتے وہ طبع زاد لکھتے ہیں ان کے بیشتر کردار مقامی اور گلیوں بازاروں میں گھومنے پھرنے والے لوگ ہی ہوتے ہیں ان کا کہنا تھا کہ عمران، فریدی یا حمید کوئی ماورائی کردار نہیں عام انسان ہیں لوگوں کے ملتے جلتے اور رات دن ان کے ساتھ رہنے والے لیکن منفرد صلاحیتوں کے مالک، ان ہی صلاحیتوں سے وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہانی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں ان کا کہنا تھا کہ کم و بیش دو سو سے زائد کردار میرے ارد گرد گھومتے اور میرے ناولوں میں نظر آتے ہیں لیکن عمران، فریدی اور حمید مرکزی کردار ہونے کے ناطے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں عرض کیا آپ کے ناول معاشرے میں مجرمانہ منفی ذہنیت اور رجحانات کو تو پروان نہیں چڑھا رہے، بولے ”میرے کسی ناول میں آپ کو جرم

سے محبت کا احساس نہیں ہوگا بلکہ ناول پڑھنے والے کو ان کرداروں سے محبت اور عقیدت ہوگی جو جرائم کا پردہ چاک اور مجرمانہ کارروائیوں کا قلع قمع کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، ان کا کہنا تھا کہ میرے ناولوں میں بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ہلکا پھلکا مزاح اور رومانس پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتا ہے ریگل چوک پر ان کے ناولوں پر نوجوانوں کے ٹوٹ پڑنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی بعد کے دنوں میں ان کے چند ناول پڑھ کر احساس ہوا کہ ابن صفی نے جاسوسی کی آڑ میں ادب کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے زبان، بیان، ضرب الامثال اور محاورے مزہ دیتے ہیں ان کے کئی کردار تربیت فراہم کرنے اور ادب آداب سکھانے کی لاشعوری کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں ابن صفی نے ہزاروں ناول تخلیق کیے ان کے ذہن میں جاسوسی کہانیوں کی ایک دنیا آباد تھی جس میں معاشرتی برائیوں اور انحطاط کی تصویر کشی نظر آتی ہے ابن صفی نے محمد حسین تالپور المعروف مولانا ہپی کے لیے ایک فلم "دھماکہ" کی کہانی بھی تحریر کی یہ عمران سیریز کے ایک ناول "بے باکوں کی تلاش" پر مبنی تھی لیکن انہوں نے اپنے ہیرو کا نام عمران کی بجائے ظفر الملک رکھا جسے اداکار جاوید شیخ نے ادا کیا تھا لیکن یورپی جاسوسی فلموں 007 اور دیگر سیریز کے برعکس ان کے کردار عمران، حمید، فریدی کو نبھانا کسی کے بس میں نہیں تھا جاسوسی ناول پڑھنے والوں کے ذہن میں ان کے مرکزی کردار آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے فلم میں ان کرداروں میں پھسپھسے پن کا احساس ہوا جس سے نوجوانوں کو ذہنی صدمہ پہنچا حتیٰ کہ فلم میں ایکس ٹو کی پراسرار آواز کو جو پس پردہ خود ابن صفی ہی کی تھی قبول نہ کیا جاسکا جس کی وجہ سے دھماکہ بری طرح فلاپ ہوگئی ابن صفی کو اس فلم کی ناکامی سے زیادہ اپنی ناکامی پر افسوس ہوا آخری عمر میں وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے اور 25 جولائی 1980ء کو صبح 5 بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے انہیں پاپوش نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ابن صفی کے انتقال کے بعد کئی لوگوں نے جاسوسی ادب میں ان کی پیروی کرنے کی کوشش کی مگر "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" اردو جاسوسی ادب کا باب ان کے ساتھ ہی پیوست خاک ہوگیا۔

❁......❁......❁......❁......❁

صفر بنا صفر کی کہانی

شاہد منصور

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ المصلح کے کالم نوادرات کے پچھلے کالموں کا ذائقہ کچھ اور تھا۔ آپ کو یکساں ذائقہ کی بوریت سے بچانے کے لیے اس دفعہ ایک بالکل علیحدہ ذائقہ تلاش کیا گیا ہے جو منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ اگر پسند آئے تو اطلاع ضرور دیجئے گا کیونکہ آپ کی داد ہی ہماری کاوش اور تلاش کا حاصل ہے۔

مگر یہ منفرد ذائقہ والا کالم پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹی سی تمہید تا کہ آپ کا لطف دوبالا ہو جائے۔

بات آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی یعنی 70ء کی دہائی کی ہے جب سارا پس کا تان اچانک اردو ادب کی ایک نئی نئی ایجاد شدہ مصنف سخن نثری نظم سے اس طرح گونج رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر طرف نثری نظم ہی کا دور دورہ تھا۔ ساری دیگر اصناف سخن غزل نظم قطعہ رباعی فری درس بلینک درس سب سہمی ہوئی منہ چھپائے بیٹھی تھیں۔ کراچی سے لے کر لاہور لاہور سے پشاور بلکہ کوئٹہ تک ہر کوئی نثری نظم کا پرچم اٹھائے گھوم رہا تھا۔ سب اپنی اپنی نثری نظموں کے دیوان مرتب کرنے میں لگے

ہوئے تھے بلکہ کچھ تو اپنے دیوان مرتب کر کے چھپوا بھی چکے تھے۔ جن کے سلسلے میں ناقد حضرات زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ کراچی میں اپنے بھائی قمر جمیل مرحوم نثری نظم کا پرچم تھامے للکار رہے تھے کہ یارو نثری نظمیں کہو اور شوق سے کہو مگر یہ نہ بھولو کہ یہ میری ایجاد ہے۔ ادھر سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا نثری نظم کا جھنڈا سر سے بلند کئے اعلان کر رہے تھے کہ غلط بالکل غلط نثری نظم سرتاپا میری ایجاد ہے۔ یقین نہ آئے اوراق کا فلاں شمارہ خود دیکھ لو جس میں صاف لکھا ہے کہ نثری نظم ڈاکٹر وزیر آغا کی ایجاد ہے یار لوگ کچھ تو قمر جمیل کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور کچھ ڈاکٹر وزیر آغا کا ڈھول پیٹ رہے تھے اور جو دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں تھے وہ اپنا دف خود ہی بجا رہے تھے۔

پاکستان میں تو خیر یہ شورش تھی ہی مگر ادھر بھارت میں یہاں سے بھی زیادہ ہنگامہ برپا تھا سارا بھارت نثری نظم کے زمزمے سے گونج رہا تھا۔ باقر مہدی سے لے کر بشیشور دیال شاد تک سب ہی نثری نظم کو اپنی ایجاد قرار دیتے ہوئے آپس میں دست و گریباں تھے موازنہ انیس و دبیر دوہرایا جا رہا تھا۔ کوئی کسی کو مان کر نہیں دے رہا تھا حالانکہ پاکستان ہو یا بھارت۔ اگر واقعی کوئی شخص نثری نظم کی ایجاد کا دعویٰ کرنے کا حق دار تھا وہ بنّے بھائی تھے۔ بنّے بھائی یعنی سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس والے۔ مشہور کمیونسٹ لیڈر اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکریٹری جنرل۔ بنّے بھائی نے پہلی نثری نظم پچاس کی دہائی میں اس وقت لکھی تھی جب وہ راولپنڈی سازش کیس میں بلوچستان کی مچھ جیل میں ایام اسیری گزار رہے تھے اور اپنی سوانح عمری مرتب کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب عصری ادب میں کوئی نثری نظم کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ بہر حال 60ء کی دہائی کے آخر تک ان کا نثری نظموں کا مجموعہ پگھلا نیلم مارکیٹ میں آچکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں انہوں نے اس صنف کی ایجاد کا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ سجائے سکون سے اس ہنگامہ رستا خیز کو دیکھتے رہے جو دنیائے ادب میں برپا تھا۔ لگتا ہے اس معاملے میں وہ یگانہ کے پیروکار تھے۔ بقول یگانہ۔

میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

یہ درست ہے کہ نثری نظم کے شیدائیوں کا حلقہ پورے برصغیر پر محیط تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہزاروں لاکھوں ایسے بھی تھے جنہیں نثری نظم قبول نہیں تھی اور جو بڑے سکون کے ساتھ اس ہنگامے اور دہائیو کیفر د ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے اردو ادب کی تاریخ پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ میر و سودا کے عہد سے ہمارے دور تک نہ جانے کتنے قیامت خیز ہنگامے برپا ہو کر آخر کار موت کی گہری نیند سو چکے ہیں اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ہم سب سکون کے ساتھ انتظار میں تھے اور ان انتظار کرنے والوں میں 'میں بھی تھا اور بھائی ابن صفی بھی تھے۔ ابن صفی کو بے مثال اور صاحب طرز جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے تو سبھی جانتے ہیں مگر یہ بات شاید بہتوں کو معلوم نہ ہوگی کہ وہ اپنے عہد کے بہت اچھے اور خوش گو شاعر بھی تھے اور شعری حلقوں میں اسرار ناروی کے نام سے جانے جاتے تھے کاش ان کا مجموعہ کلام چھپ گیا ہوتا تو ان کے بارے میں لاعلمی تو نہ ہوتی۔ 52ء سے میرا اور ان کا ساتھ تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان کا جیسا پیارا اور دل نواز کوئی دوسرا نصیب نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات اس نہج تک پہنچ گئے کہ میں غزل یا نظم کہتا تو سب سے پہلے انہیں ہی سناتا اور اگر وہ کہتے تو انہیں بھی سب سے پہلے مجھے سنائے بغیر چین نہ آتا۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھر بے وقت پہنچنا اس بات کی دلیل تھی کہ آنے والے

نے کوئی نئی چیز کہہ لی ہے۔ بہر حال یہ تذکرہ تو کود بخود دبیچ میں آ گیا ورنہ بات تو نثری نظم کی ہو رہی تھی۔

سال بالکل ٹھیک ٹھیک تو مجھے اب یاد نہیں رہا مگر یہ 70ء کی دھائی کے بالکل ابتدائی برسوں کی بات ہے کہ افسر آذر اور شمیم نوید ایک دن مجھے ملنے آ گئے۔ یہ دونوں نثری نظموں کے پر جوش مبلغ تھے بلکہ شمیم نوید تو نثری نظموں اور ان کے فارغ سے نہ جانے کیوں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ نثری نظموں کے موضوع پر میرے اور ان کے درمیان پہلے ہی گرما گرم بحثیں ہو چکی تھیں کیونکہ نثری نظم کو میں کسی صورت شاعری تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس دن بھیچائے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی ہم میں یہ لایعنی مگر گرما گرم بحث دوبارہ شروع ہو گئی۔ وہ مجھے قائل کرنے کی ٹھان کر آئے تھے اس لیے نثری نظم کی تعریف وتوصیف میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر میرا کہنا تھا کہ نہیں نثری نظم کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تقسیم ہند سے بھی کوئی تیس برس پہلے برصغیر میں رائج ادب لطیف انشائے لطیف کی بھونڈی سی نقل ہے جو برصغیر کے پہلے نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتان جلی کے اردو ترجموں سے اردو میں رائج ہوئی۔ اور میں مان لینے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ نثر میں جو ترتیب ہوتی ہے تنظیم ہوتی ہے ضابطے ہوتے ہیں اور جملوں کے درمیان جو ایک منطقی ربط ہوتا ہے اس سے تمہاری نثری نظم یکسر محروم ہے اور میں اسے نظم اس لیے نہیں مانتا کہ اس میں وزن نہیں ہوتا اور جس میں زون نہ ہوں میرے نزدیک وہ شاعری ہے ہی نہیں بلکہ قبلہ علی متقی امروہوی کا کلام ہے۔ قبلہ علی متقی امروہوی ایک پچھتر سالہ بزرگ تھے جو اس زمانے میں اردو کے استاد امام دین گجراتی سمجھے جاتے تھے یعنی نہ تو تیتر ہے نہ ہی بٹیر ہے۔



اس بحث کا کوئی نتیجہ تو نکلنا ہی نہیں تھا۔ یہ بات ہم تینوں اچھی طرح سے جانتے تھے اس لیے دو گھنٹے کی دھواں دھار گفتگو کے بعد بھی نتیجہ صفر ہی تھا۔ وہ لوگ تو چلے گئے مگر اس بے تسلی اور بے نتیجہ بحث کی وجہ سے طبیعت میں جو جھلاہٹ اور انتشار پیدا ہو گیا اس نے بہت بے چین رکھا۔ آخر اسی جھنجھلی میں میں نے طبیعت کا غبار دور کرنے کے لیے بندہ بشر کے عنوان سے نثری نظ؟م کے خلاف ایک کٹیلی طنزیہ نظم لکھ ہی ڈالی۔ نظم مکمل ہو چکی اور دل کو کچھ اطمینان ہوا تو اسے ابن صفی کو سنانے کی سوجھی۔

سہ پہر ہو چکی تھی جب میں بس سے ناظم آباد چورنگی اتر کر ابن صفی کے دفتر کی طرف بڑھا۔ موصوف حسب معمول دفتر میں دربار لگائے بیٹھے تھے۔ چار پانچ آدمیوں کا مجمع تھا اور اپنی گہری گونجیلی آواز میں استاد محبوب عالم کوئی فارسا قسم کی چیز سنا رہے تھے میں نے حق ٹھائی اندر داخل ہوا اور داد دینے والوں میں شریک ہو گیا۔ استاد کی فارسا آخری دنوں پر تھی اس لیے جلد ہی ختم ہو گئی۔ استاد نے ٹھنڈی چائے کا آخری

گھونٹ بھرا۔ اپنا پورٹ فولیو اٹھایا اور اپنے اصالیوں موالیوں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ جب سناٹا اور تنہائی ہوگئی تو ابن صفی نے میری طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائے اور بولے معلوم ہوتا ہے کوئی نئی چیز ہوگئی ہے جبھی اس ڈھلتی دھوپ میں چلے آئے ہو۔ ہم نے نظم کا پرچا جیب سے نکالا مجادلے کا مختصر احوال بیان کیا اور انہیں نظم سنانے لگ گئے۔

ابن صفی چہرے پر نرم سی مدھم مسکراہٹ سجائے میری نظم بندہ بشر سنتے رہے اور موقع بموقعہ داد دیتے رہے اور بعض شعروں کو مکرر پڑھواتے رہے نظم ختم ہوئی تو ان کے چہرے پر جیسے سورج اتر آیا اور ان کی مسکراہٹ جگمگاتی ہوئی دھوپ بن گئی۔ انہوں نے دراز سے ایک کاغذ نکالا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔آج میں خود تمہاری طرف آنے والا تھا۔ اچھا ہوا تم خود ہی آ گئے۔ یار سنناآج تو مجھ سے بھی ایک نثرنظم سرزد ہوگئی ہے جس کا عنوان صفر بٹا صفر ہے ذرا دیکھنا تو کیسی ہے۔

آج صبح ایک پرانے حوالے کی تلاش میں' میں اپنا پرانے کاغذات کا صندوق کھنگال رہا تھا کہ اچانک ایک پرانا بوسیدہ کاغذ ہاتھ آ گیا۔ اس کی تہیں کھول کر دیکھا تو وہی ابن صفی کی نثری نظم صفر بٹا صفر کی نقل تھی۔ بڑی دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ بیتی گھڑیاں فلم کی طرح آنکھوں کے آگے گزرتی چلی گئیں۔ بڑی دیر کے بعد میری بیوی نے آواز دی تو یاد آیا کہ میں کہاں ہوں۔ ابن صفی کا مجموعہ کلام ابھی تک چھپا نہیں ہے۔ اس لیے یہ یادگار نظم خوش ذوق قارئین کی نذر ہے جہاں تک مجھے علم ہے یہ ابن صفی بلکہ اسرار ناروی کی اکلوتی نثرنظم ہے اور مجھے کچھ ایسا بھی یاد پڑتا ہے کہ اس نظم کے کچھ مصرعے انہوں نے اپنے کسی جاسوسی ناول میں بھی استعمال کیے تھے۔ آیئے ہم آپ مل کر نظم پڑھیں اور ابن صفی کی یاد کو تازہ کریں۔

اسرار ناروی ابن صفی

صفر بٹا صفر

ٹیلی فون پر
مسز صائمہ سلیمان نے گہری سانس لیتے ہوئے
اپنی گونج دار آواز میں مزے لے کر کہا
میری جان تم غلط سمجھی ہو
بات بال پوائنٹ کی نہیں ہے
بال پوائنٹ تو عصر تازہ کی ایجاد ہے
جس نے دوات اور قلم بلکہ فاؤنٹین پن بھی
ایک عرصے سے متروک کر رکھے ہیں
اب کسی کو بھی
پتلی گول مخروطی لکڑی کے سرے پر لگے ہوئے
نوک دار نب والے قلم کی ضرورت نہیں
لکھنے والے تو ہر چیز سے لکھتے ہیں
چاہے وہ کوئلہ ہو برش ہو یا انگلی ہو

میرے روحانی استاد

ریاض بٹ

قارئین کچھ یادیں کچھ باتیں اور کچھ انتخاب اپنے روحانی استاد ایشیاء کے معروف و مشہور لاکھوں کروڑوں جاسوسی ادب پڑھنے والوں کے دلوں میں بسنے والے مصنف ادیب محترم ابن صفی مرحوم خدا ان کے درجات بلند فرمائے آمین کا آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو ان کی شخصیت اور ادب کے لیے ان کی جو خدمات ہیں ان کو احاطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ انکے متعلق لکھتے ہوئے میرا قلم کم مائیگی کا شکار ہے۔ پھر بھی سورج کو چراغ دکھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ 1971ء کی بات ہے۔ میں میٹرک کا امتحان دیکر فارغ تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں اپنے دوست ظفر نجمی کی لائبریری میں چلا جاتا تھا۔ جو نیچہ بازار حسن ابدال میں تھی۔ اب نہ وہ لائبریری رہی ہے نہ وہ پڑھنے والے رہے ہیں اور نہ میرا دوست ظفر نجمی رہا ہے۔ ان کی لائبریری میں ہر قسم کی کتابیں تھیں۔ ویسے مجھے شروع ہی سے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق تھا اور میں خان بالا اور اسد نعمانی کے جاسوسی ناول پڑھتا تھا۔ اچانک لائبریری کے ایک ممبر عبدالقادر صاحب نے مجھے کہا کہ آپ ابن صفی کو پڑھیں۔ اور ساتھ ہی انہوں نے ناول دلیر مجرم حمیدی فریدی سیریز میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں ناول گھر لے آ گیا۔ یقین کریں یہ مجھے کل کی بات لگتی ہے میں نے رات آٹھ بجے ناول پڑھنا شروع کیا اور ایک ہی نشست میں ختم کر کے سویا۔ اتنا تجسس سسپنس اور چاشنی میں نے اس سے پہلے کسی ناول خاص طور پر جاسوسی ناول میں نہیں پائی تھی۔ دوسرے دن میں عبدالقادر صاحب سے ملا اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے صحیح جاسوسی ادب سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد چل سو چل والی بات ہوگئی۔ یہ جنون اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک نشہ بن کر میرے حواس پر چھا گیا۔ اور میں اس کے حصار میں گرفتار ہو گیا۔ میرے دوست ظفر نجمی مرحوم ہر ماہ ایک انعامی سلسلہ رکھتے تھے اس میں ایک پرکشش بات یہ تھی کہ انعام پچاس روپے تھا جو اس دور کے حساب سے ایک قابل قدر رقم تھی اور دوسری بات جو سب سے اچھی تھی وہ یہ تھی کہ جو اس مقابلے میں ایک بار انعام حاصل کر لیتا وہ دوبارہ اس میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال انعام مجھے مل گیا۔ سوال یہ تھا کہ جناب ابن صفی صاحب کا وہ کونسا ناول تھا جس کی کہانی صرف ایک دن اور ایک رات کی کہانی تھی جواب تھا۔ خونی رشتے' اس کتاب کو 69-9-30 کو لکھا گیا تھا۔...... اس سے چھوٹا ساز اقتباس حاضر ہے۔ اچھا صاحب خونی رشتے پر نظر رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے انہی کہانیوں کی یاد تازہ ہو جائے جن کے حوالے آپ اکثر دیئے رہتے ہیں۔ ویسے آپ مطمئن رہیے۔ اگر بڑھاپا شروع ہو گیا تو آپ کو اس کی اطلاع ہرگز نہ ہونے پائے گی۔ کیونکہ براہ راست ملاقات تو ہوئی نہیں بیس سال پہلے کی تصویر مرتے دم تک چھپواتا رہوں گا۔ آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے یہ اقتباس تحریر کرنے کا مقصد فقط یہ ہے کہ ابن صفی مرحوم اپنے قارئین سے کیسی کیسی باتیں کرتے تھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں انہیں کم از کم ٹی وی پر چلتے پھرتے دیکھ سکوں۔ ان کی باتیں سن لوں۔ میری یہ خواہش ایک دن پوری ہوگئی۔ جب طارق عزیز صاحب نے انہیں اپنے پروگرام نیلام گھر میں بلایا۔ مجھے وہ تصویر سے بڑھ کر لگے۔ ان کے چلنے کے انداز

میں ایک وقار تھا۔ بولنے کے انداز میں ایک سحر تھا۔ اوران کے جوابات ان کی وسیع وعریض معلومات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جن قارئین نے ان کے ناول پڑھے اوراب بھی میری طرح بیسویں اکیسویں دفع پڑھ رہے ہیں اور پہلی دفع پڑھنے جانے کا لطف اٹھا رہے ہیں یہ بات محسوس کرتے ہیں اور پہلی دفع پڑھنے جانے کا لطف اٹھا رہے ہیں یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ ایک توان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اس کے سامنے بی اے کی ڈگری کسی شمار وقطار میں نہیں تھی اور دوسرے ان کی نظر اور مشاہدہ بہت آگے اور ایڈوانس تھا۔ جنہوں نے ان کے ناول تاریک سائے وبائی ہیجان شکرال کا ناسور جس میں کالے چراغ خون کے پیاسے درندوں کی بستی شعلوں کا سیٹ جس میں پہلا شعلہ دوسرا شعلہ تیسرا شعلہ جہنم کا شعلہ شامل ہیں پڑھے ہیں اس کے علاوہ وہ بہت سی ناول جن کا ذکر کیا جائے تو بات بہت لمبی ہوجائے گی۔ یہ بات جان گئے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے چالیس بیالیس سال پہلے لکھا تھا وہ بعد میں سچ ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر ڈینگی وائرس اور سرحدی علاقوں میں گڑبڑ اسلحہ کے ذخائر خودکش دھماکے۔ دوسرے ملک کی ایجنسیوں کی مداخلت وغیرہ شامل ہیں۔ وہ قارئین اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ اور خبردار کردیا تھا۔ درندوں کی بستی عمران سیریز سے اقتباس۔ تھریسیا پرسکون آواز میں بولی۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ اتنی دور سے مرنے آیا تھا مگر جھوتا اور شیخی خورالفااس کے پیروں کے نیچے دم توڑ رہا ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ جس نے کچھ دیر پہلے ایک عورت کو زمین پر پٹخنے کے لیے سر سے بلند کیا تھا وہ اب بے بس کیچوے کی طرح لہریں لے رہا ہے۔ ابن صفی مرحوم نے ایسے ایسے لافانی اور ذہنوں سے چپک جانے والے کردار تخلیق کیے تھے کہ کوئی اور مصنف ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ ان کرداروں میں تھریسیا سنگ ہی فنچ اپنی مثال آپ ہیں۔ حمیدی فریدی سیریز میں قاسم کا کردار اور عمران سیریز میں جولیا کا کردار ذہن کے ساتھ چپک جانے والا کردار ہے۔ وہ کرداروں سے صحیح انصاف کرلیے تھے اوران کی زبان سے بڑے چھپے ہوئے جملے ادا کروائے تھے عمران نے آخری آدمی میں جو کچھ کہا وہ بھی پڑھ لیجئے۔ ان کا غذات میں ایک ایسے اسمگلر کی نشان دہی کی گئی ہے جو بیک وقت اسمگلر بھی ہے اور بلیک میلر بھی۔ مگراس کا اصل کام دونوں سپر پاورز کو ڈبل کراس کرنا تھا۔ جس میں ترقی پذیر ملک میں جس پاور کے مفاد ہوئے وہ ان کی حفاظت کرتا تھا۔ خود ایک بین الاقوامی مجرموں کے ٹولے کا سربراہ تھا۔ اور ترقی پذیر ملکوں یا طفیلی ملکوں میں مسلح بغاوتیں کرانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا پھر وہ مسلح بغاوت کے لیے اسلحہ بھی خود ہی جمع کرتا تھا۔ ابن صفی مرحوم کے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے الفاظ ان کے فن کا صحیح طور پر احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ پھر میرے علاوہ اور بہت سے بہن بھائی لکھیں گے۔ ابن صفی نمبر کے لیے میں ان کے صفحات پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ جاتے جاتے ان کے آخری ناول عمران سیریز آخری آدمی کے......اس کو من وعن یہاں نقل کررہا ہوں اوراس کو نقل کرنے کی وجہ آپ...... پڑھ کر سمجھ جائیں گے۔

جاسوسی ادب کے پہلے اورآخری آدمی کا ناول آخری آدمی پیش خدمت ہے یہ ناول ابو نیا پنی علالت کے دوران ہی مکمل کرلیا تھا مگران کی حسب خواہش ملک میں بارشوں اور سیلابی کیفیتوں کے باعث اسے شائع نہ کیا جاسکا۔ کسی کو کیا معلوم تھا عظیم سانحہ ہوجائے گا اور وہ اسے خود شائع نہ کراسکیں گے۔ اوراس کی اشاعتی ذمہ داری میرے کمزور کاندھوں پرآپڑے گی۔ اب کہاں تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا ہوں یہ

آپ کی رائے پر منحصر ہے ابو کے ہر ناول کے یہ صفحات جن پر آج آپ میری تحریر دیکھ رہے ہیں اپنی جگہ ادب کا ایک انمول نمونہ ہوئے تھے۔ آج جب مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں اپنے بے وقعت الفاظ سے ان صفحات کو سیاہ کر دوں تو میرے لیے ایک سطر بھی لکھنا مشکل ہو رہا ہے ابو کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ نئی کتاب کا نام و پیش رس سب سے آخر میں اس وقت تحریر کرتے تھے جب آخری کاپی پریس میں ہوتی تھی۔ لیکن مرگ ناگہانی نے ان کو اس کی مہلت نہ دی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ابن صفی ......ادیب اور شاعر

(طاہر جولانی کی وال سے)

ابن صفی 26 جولائی 1928ء کو الہ آباد، اتر پردیش کے ایک گاؤں نارا میں صفی اللہ اور نذیرا (نفیسراء) بی بی کے گھر پیدا ہوئے۔ اردو زبان کے شاعر نوح ناروی رشتے میں ابن صفی کے ماموں لگتے تھے۔ ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ اگست 1952ء میں ابن صفی اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آ گئے جہاں انہوں نے کراچی کے علاقے لالوکھیت کے سی ون میں 1953ء سے 1958ء تک رہائش اختیار کی۔ ان کے والد 1947ء میں کراچی آ چکے تھے۔

تعلیم

انہوں نے ابتدائی تعلیم نارا کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک ڈی اے وی اسکول الہ آباد سے کیا جبکہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم الہ آباد کے ایونگ کرسچن کالج سے مکمل کی۔ 1947ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں برصغیر میں تقسیم کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہنگامے فرد ہوئے تو تعلیم کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا لہذا بی اے کی ڈگری جامعہ آگرہ سے یہ شرط پوری کرنے پر ملی کہ امیدوار کا عرصہ دو برس کا تدریسی تجربہ ہو۔

ملازمت

1949ء سے 1952ء کے عرصے میں ابن صفی پہلے اسلامیہ اسکول اور بعد میں یادگار حسینی اسکول میں استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ اگست 1955ء میں ابن صفی نے خوفناک عمارت کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا اور علی عمران کے کردار کو راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔

ادبی خدمات

سن 1948ء میں عباس حسینی نے ماہنامہ نکہت کا آغاز کیا۔ شعبہ نثر کے نگران ابن سعید (پروفیسر مجاور حسین رضوی) تھے جبکہ ابن صفی شعبہ شاعری کے نگران مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف قلمی ناموں سے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھنے لگے۔ ان قلمی ناموں میں طغرل فرغان اور سنکی سولجر جیسے اچھوتے نام شامل تھے۔ سن 1948ء میں نکہت میں ان کی پہلی کہانی فرار شائع ہوئی۔

1951ء کے اواخر میں بے تکلف دوستوں کی محفل میں کسی نے کہا تھا کہ اردو میں صرف فحش نگاری ہی مقبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ ابن صفی نے اس بات سے اختلاف کیا اور کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے فحش نگاری کے اس سیلاب کو اپنی تحریر کے ذریعے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ اس پر دوستوں کا موقف تھا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا، لوگ یہی کچھ پڑھتے رہیں گے۔ یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب ابن صفی نے ایسا ادب تخلیق کرنے کی ٹھانی جو بہت جلد لاکھوں پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ عباس حسینی کے مشورے سے اس کا نام جاسوسی دنیا قرار پایا اور ابن صفی کے قلمی نام سے انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید کے کرداروں پر مشتمل سلسلے کا آغاز ہوا جس کا پہلا ناول دلیر مجرم مارچ 1952ء میں شائع ہوا۔

اسرار پبلی کیشنز کا قیام

ناول بھیانک آدمی کو ماہانہ جاسوسی دنیا نے نومبر 1955ء میں کراچی کے ساتھ ساتھ "الہ آباد" سے بیک وقت شائع کیا تھا۔ اکتوبر 1957ء میں ابن صفی نے اسرار پبلی کیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت جاسوسی دنیا کا پہلا ناول ٹھنڈی آگ شائع ہوا۔ 1958ء میں ابن صفی، لالوکھیت سے کراچی کے علاقے ناظم آباد منتقل ہوگئے۔ جنوری 1959ء میں ابن صفی اسرار پبلی کیشنز کو فردوس کالونی منتقل کر چکے تھے اور یوں انہیں اپنی تخلیقات کو پروان چڑھانے کے لیے ایک آرام دہ ماحول میسر آ گیا۔ ناظم آباد کی رہائش گاہ میں وہ 1980ء میں اپنے انتقال تک مقیم رہے۔

ابن صفی کے بقول، ان کے صرف آٹھ ناولوں کے مرکزی خیال کسی اور سے مستعار لئے ہیں باقی کے 245 ناول مکمل طور پر ان کے اپنے ہیں۔

نکہت پبلیکیشنز سے وابستگی

عباس حسینی کی ملکیت میں الہ آباد کے نکہت پبلیکیشنز کے تحت بھارت میں ابن صفی کے ناولوں کی اشاعت عمل میں آتی تھی۔ عباس حسینی نے کانپور سے ابن صفی کے کرداروں پر جعلی ناشروں کے خلاف زبردست مہم چلائی تھی۔

عباس حسینی سے والہانہ وابستگی

ابن صفی کس حد تک عباس حسینی سے دلی وابستگی رکھتے تھے، اس کا اندازا اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے
"پھر جب میری صحتیابی کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگیں تو یار لوگوں نے شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی صاحب کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ اب بھارت میں میری کتابیں ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوں گی۔ ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں)۔"

اردو ادب میں مقام

جناب ابن صفی بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار گزرے ہیں اور ان کی تحریروں میں ایسا جادو ہے کہ 50 سال قبل لکھے گئے ناول جب آج کے دور کا انسان بھی پڑھتا ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے۔ ابن صفی کا لگایا ہوا پودا عمران سیریز اس قدر تناور ہوا کہ آج تک یہ ثمر بار ہے اور کئی ایک مصنفین اس سلسلے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

اردو میں آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے دور پر بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے "اردو ادب آزادی کے بعد" اور ڈاکٹر علی حیدر نے "اردو ناول سمت و رفتار" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر سلیم احمد نے اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں "ابن صفی کا" مختصر ترین ذکر کیا ہے۔ ابن صفی کے فن کو سراہنے والی ادبی شخصیات میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، محمد حسن عسکری، کالم نگار حسن نثار، شاعر امجد اسلام امجد، صحافی و ادیب قاضی اختر جوناگڑھی، سیاسی شخصیات میں فیلڈ مارشل ایوب خان اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب جیسے نام شامل ہیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر خان نے ابن صفی کے حوالے سے محقق و ادیب راشد اشرف کے نام 2009ء میں اپنے ایک پیغام میں اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ جن دنوں وہ (ڈاکٹر خان) بڑا میدان، ناظم آباد، کراچی کے قریب رہا کرتے تھے، ابن صفی کے ناولز ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ ابن صفی کے فن کا اعتراف کرنے والی مغربی شخصیات میں خاتون ناول نگار اگاتھا کرسٹی، اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور نارویجین پروفیسر فن تھیسن شامل ہیں۔ کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے ابن صفی کے فن کے بارے میں کہا تھا:

"ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں، وہ یہ ہے کہ ان کے کردار فریدی اور عمران کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بد پھیرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے۔ اس لیے اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے ابن صفی کو یوں خراج تحسین پیش کی "میں نے کبھی ابن صفی کے ناولوں کو کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے انٹلکچوئل اسے ایک سب اسٹینڈرڈ مواد گردانتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ابن صفی کے تخلیقی ذہن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ابن صفی کے ناول کیوں پڑھتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں، کیونکہ ابن صفی ہمارے کئی ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتے ہیں۔" جب محمد حسن عسکری نے یہ شکایت کی کہ اردو نثر کا فن زوال پزیر ہے اور کوئی اچھی زبان نہیں لکھ رہا ہے تو میں نے انہیں ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا ایک ناول پڑھنے کو دیا۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ پوچھتے تھے "کشفی صاحب، ابن صفی کا نیا ناول آ گیا؟"

ابن صفی اور پی ٹی وی

1977ء کے عام انتخابات کے دوران ان کے ایک ناول ڈاکٹر دعاگو کو پاکستان ٹیلی ویژن نے ٹیلی فلم کی حیثیت سے پکچرائز کیا تھا۔ مشہور اداکار قوی خان نے اس میں عمران کا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن کچھ سیاسی الجھنوں کی وجہ سے ناظرین یہ ٹیلی فلم دیکھنے سے محروم رہے۔ روزنامہ جنگ نے اپنی 18، اکتوبر 1979ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی۔ "یہ جملہ بار بار سننے میں آتا ہے کہ فلاں فلاں مصنف کو بعید نما نے بلیک لسٹ کر دیا، لیکن کسی مصنف نے بعید نما کو بلیک لسٹ کر دیا ہو یہ عجیب بات ہے۔ ابن صفی کا کہنا ہے کہ وہ اس وقت تک بعید نما کے کسی پروگرام میں حصہ نہیں لیں گے جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ ان کے ناول ڈاکٹر دعاگو کو ٹیلی کاسٹ کیوں نہیں کیا گیا؟

طرز نگارش

جونک کی واپسی: "میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم، جرائم نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔"

سہ رنگا شعلہ: "آدمی کس قدر بے چین ہے مستقبل میں جھانکنے کے لیے۔ شاید آدمی اور جانور میں اتنا ہی فرق ہے کہ جانور مستقبل سے بے نیاز ہوتا ہے اور آدمی مستقبل کے لیے مرا جاتا ہے۔"

مہکتے محافظ: "میں عموماً بنجر زمین پر کاشت کرتا ہوں اور کچھ نہیں تو کانٹے دار پودے ہی اگا لیتا ہوں اور وہ کانٹے میرے لیے خون کی بوندیں فراہم کر دیتے ہیں۔"

خطرناک لاشیں: "اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں۔ انہیں اعزاز ملتے ہیں، ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔"

صحرائی دیوانہ: "جو عبادت آدمی کو آدمی نہیں بنا سکتی، میں اس عبادت کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھنے پر مجبور ہوں۔"

ہیروں کا فریب: "دنیا کا کوئی مجرم بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ قدرت خود ہی اسے اس کے مناسب انجام کی طرف دھکیلتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تم ایک رات بھی اپنی چھت کے نیچے آرام کی نیند نہ سو سکو، زمین پر فتنوں کے علاوہ کچھ نہ اگے۔"

جہنم کی رقاصہ: "یہاں اس ملک میں تمہارے ناپاک ارادے کبھی شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں کی فضا میں ایسا معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا جو خدا کے وجود سے خالی ہو۔"



موت کی آندھی: "جب کوئی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی ساری شخصیت صبر کی تلخیوں میں ڈوب جاتی ہے۔"

دشمنوں کا شہر: "ایک پرندے کو سنہرے قفس میں بند کر کے دنیا کی نعمتیں اس کے لیے مہیا کر دو لیکن کیا وہ پرندہ تمہیں دعائیں دے گا؟"

ابن صفی نے عمران سیریز کے ایک ناول "پیاسوں کی تلاش" پر ایک فلم بھی لکھی تھی "دھماکہ" جو جاوید شیخ کی پہلی فلم تھی اسکے دیگر اداکار رحمان، شبنم، قربان جیلانی تھے جسے محمد حسین تالپور (مولانا ہپی) نے پروڈیوس کیا تھا اور قمر زیدی اس کے ہدایتکار تھے اس میں حبیب ولی محمد کی ایک غزل تھی "راہ طلب میں کون کسی کا- یہ فلم کامیاب نہی رہی-

ابن صفی کا ایک مشہور جملہ تھا کہ "آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جبکہ ایک دن اسے اپنی تمام تر سنجیدگی کے ساتھ دفن ہو جانا ہے"

بیماری

1960ء سے 1963ء تک آپ انفصام کے مریض رہے لیکن 1963ء میں وہ حکیم محمد اقبال حسین کے علاج کی مدد سے نہ صرف اس مرض سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے بلکہ عمران سیریز کے بہترین ناول ڈیڑھ متوالے کے ہمراہ جاسوسی ادب کے میدان میں پوری توانائی کے ساتھ دوبارہ قدم رکھتے ہوئے اپنے بدخواہوں کو کچھ یوں للکارا: " کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے۔۔۔ پھر چھلکنے لگے سبو آؤ" .
1970ء میں پاکستانی ایجنسی انٹر سروسز انٹیلیجنس (ISI) کو جاسوسی کے حوالے سے غیر رسمی مشاورت بھی دی۔

17 ستمبر، 1979ء کی رات کو آپ پر درد کا پہلا اور شدید حملہ ہوا اور اس کے بعد صحت مسلسل خراب رہی۔ نومبر 1979ء میں بیماری شدت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹروں نے طویل معائنوں اور تکلیف دہ ٹیسٹوں کے بعد ایک خطرناک بیماری، سرطان، کا اندیشہ ظاہر کر دیا۔ دسمبر، 1979ء میں آپ کو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مزید معائنوں اور ٹیسٹوں نے لبلبہ میں کینسر کی تصدیق کر دی۔ اس بات کو ابن صفی سمیت تمام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ صرف ابن صفی کے فرزند، احمد صفی کو اس بات کا علم تھا۔ اسپتال میں بہترین علاج اور توجہ سے بظاہر ان کی بیماری میں کمی تو ہوئی، تاہم اسپتال سے گھر آنے کے بعد علاج جاری رہا لیکن بیماری کی وجہ سے ان کے جسم میں متواتر خون کی کمی واقع ہونے لگی۔

وفات

24 جولائی 1980ء کو آپ کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہوگئی۔ اس بیماری کو تقریباً دس ماہ سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔ دو دن بعد، 26 جولائی، 1980ء کو (یعنی اپنی سالگرہ کے ہی دن) وہ اس جہان سے رخصت ہوئے۔ مشاق احمد قریشی نے لحد میں اتارا۔ تدفین قبرستان پاپوش نگر میں ہوئی۔ بقول شاعر

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

ابن صفی کے فرزند، احمد صفی، اپنے والد کی وفات کے جانکاہ سانحے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:
" جمعرات 24 جولائی، 1980ء کو ابو کو بخار آ گیا جو اس وقت غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن رات ہوتے ہوتے بخار بہت تیز ہو گیا۔ دوسرے دن طبیعت میں خرابی کی وجہ سے میں (احمد صفی) دیر سے سو کر اٹھا۔ امی نے بتایا کہ رات بھر ابو کی طبیعت بہت خراب رہی۔ ابو کو اس وقت بھی خاصا بخار تھا۔ جمعہ کا دن تھا، چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کا ملنا بھی مشکل تھا۔ امی کے مشورے سے میں اور بھیا (ابرار صفی) رحمٰن بھائی کو لینے چلے گئے۔ ڈاکٹر رحمٰن آئے تو ابو کا بخار تیز ہو چکا تھا۔ ان کی سانس اس قدر تیز تیز چل رہی تھی کہ بولنا دشوار تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن نے فوراً انجکشن منگوائے، جب انہوں نے انجکشن لگانے کے لیے ابو کی آستین سرکائی تو ابو نے منع کیا " میرے بازو اب مزید مت چھیدو" ۔۔۔ رحمٰن بھائی نے پاؤں کی رگ میں انجکشن لگایا۔ انجکشن لگنے اور دوا ملنے کے بعد ابو کی طبیعت بہتر ہوگئی اور انہوں نے عادتاً طبیعت سنبھلتے ہی باتیں شروع کر دیں۔ شام کے وقت افطار کے بعد عیادت کے لیے حسب معمول لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ ابو کو کافی تیز بخار ہونے کے باوجود آنے جانے والوں سے تھوڑی بہت بات چیت کر رہے تھے۔ رحمٰن بھائی نے جاتے وقت بھیا سے کہا کہ اس وقت تو حالت قدرے بہتر ہے، انشاءاللہ صبح سب سے پہلے

خون چڑھانے کا انتظام کریں گے۔

یہ ایک ایسی صبح کا ذکر تھا جو کبھی نہ آئی۔ اس رات مجھے (احمد) بھی کافی تیز بخار تھا، میں ابو کے پاس سے اٹھتے ہی بڑے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہی سو گیا۔ رات کو ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ گھڑیاں دیر ہوئے 26 تاریخ کا اعلان کر چکی تھیں۔ ابو نے سارے دن کے بعد بیت الخلا جانے کو کہا۔ سارا دن اس قدر کمزوری رہی تھی کہ ہاتھ نہ اٹھتا تھا لیکن اس وقت خود اٹھے اور سہارا لے کر کمرے سے متصل باتھ روم گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو سانس نہایت تیزی سے چل رہی تھی۔ بھیا کو بلایا کہ پیٹھ سہلا دیں۔ امی نے فوراً بھیا کو جگایا۔ جب بھیا پیٹھ سہلا رہے تھے تو ابو نے کہا" ناحق تم لوگوں کو آدھی رات کے وقت تنگ کر رہا ہوں، میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے"۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تھوڑی دیر میں اچانک تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ کراہنے کی آواز سن کر میں فوراً کمرے میں پہنچا، اس وقت تک ابو لیٹ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں چھت میں گڑی ہوئی تھیں اور سانس چلنے کی وجہ سے پورا پلنگ ہل رہا تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے، امی اور بہنیں گھبرا کر رونے اور دعائیں مانگنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں اور بھیا ابو کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگے۔ ابو کی حالت دیکھ کر سب کی حالت غیر ہو رہی تھی، بھیا روتے جاتے تھے اور ابو کو جھنجھوڑتے جاتے تھے۔ افتخار (بھائی) فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر کو لینے گئے۔ بھیا اور مجھ میں ابو کے پاس سے ہٹنے کی ہمت نہ تھی۔ امی اور بہنیں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ اچانک ابو نے زور سے سانس لی اور ان کے چہرے کا کرب یکسر دور ہو گیا۔ وہ بالکل پرسکون ہو گئے۔"

26 جولائی کی صبح ان کے اہل خانہ ان کے پرستاروں کی موجودگی مٹی کا حق مٹی کے سپرد کر آئے تھے۔ وہ 25 اور 26 جولائی کی درمیانی ابن صفی انتقال کر گئے تھے۔

انتقال کے بعد چھپنے والے مشتبہ ناول

نکہت پبلیکیشنز کی جانب سے ابن صفی کے انتقال کے بعد دو ناول ان ہی نام موسوم کر کے چھپے تھے۔ ان کے نام سایے کا قتل اور روشنی کی آواز تھے۔ ان ناولوں کی زبان اور انداز بیان کو دیکھ کر ان کے مصنف ابن صفی ہونے پر شبہ کا اظہار کر رہے تھے۔ مثلاً ابن صفی کے ہر ناول میں لفظ دفعتاً بکثرت مستعمل تھا۔ اس کے برعکس ان ناولوں میں ایکدم اس کی جگہ مستعمل تھا۔ اس کے علاوہ سوقیانہ اور بھونڈی زبان بھی ناولوں میں رواں تھی۔

بہت کم لوگ واقف ہیں ابنِ صفی شاعر بھی تھے بہت پہلے میں نے ایک غزل پڑھی تھی بہت ڈھونڈی مگر نیٹ پر دستیاب نہیں مصرعہ یاد ہے۔

باغوں میں کوکے گی کوئل بورآموں پرآنے دو
ذیل میں دستیاب شدہ غزل دی ہے
راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشک غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی سی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں
چشم ولب ورخسار کی تہ میں روحوں کے ویرانے ہیں
اف یہ تلاش حسن وحقیقت کس جا ٹھہریں جائیں کہاں
صحن چمن میں پھول کھلے ہیں صحرا میں دیوانے ہیں
ہم کو سہارے کیا راس آئیں اپنا سہارا ہیں ہم آپ
خود ہی صحرا خود ہی دوانے شمع نفس پروانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں
حوالہ جات: وکی پیڈیا، ریختہ اور (میں)
طاہر جولانی

وقت کا جال اور ابن صفی
مامون الرشید

زوردار دھماکہ۔
تیز کڑکڑاہٹ۔
دل کانپ کر رہ گیا۔
آسمانی بجلی باہر قہر برسا رہی تھی اور بارش اتنی تیز برس رہی تھی کے لگتا تھا جیسے آسمان نے زمین سے کوئی پرانا حساب چکانا ہو۔
دن دو بجے کا وقت تھا مگر پھر بھی باہر کالے بادلوں نے ایسے سورج کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا جیسے کسی محبوب کی گستاخ زلفیں۔
آسمانی بجلی کی آمد کی وجہ سے زمینی بجلی بھی سسرال سے لڑ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔
گھر میں گھپ اندھیرا تھا اور سب گھر والے کھانا کھا کے قیلولہ فرما رہے تھے۔
میں نے نہایت آہستگی سے والد صاحب کے کمرے کا دروازہ کھولا حالانکہ میں نے پوری احتیاط کی تھی مگر پھر بھی میری جان کا دشمن دروازہ اک لمبی "چوووووووں ں ں ں" کی آواز نکالنے سے باز نہ آیا۔
اُدھر ابا جان نے کروٹ بدلی اِدھر ہم نے سانس روک لی، دل تو کیا کہ اس گستاخ دروازے کو اک زوردار لات ماری جائی پر پھر سوچا ایسے میں ابا جان نے اٹھ کے ہماری کروٹ بدل دینی ہے۔
خیر کافی دیر بعد جب اطمینان ہو گیا کہ ابا جان پھر نیند کی گہری وادیوں میں چلے گئے ہیں تو میں

دبیقدموں گھر سے ایسے باہر آیا کہ سامنے کھڑی اک بلی بھی میرے انداز کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔
مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ جو میں کرنے جارہا ہوں وہ ٹھیک بھی ہے کے نہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔
باہر ایسا طوفان تھا کہ جنات بھی گھر سے باہر نکلنے سے پہلے مجلسِ شوری سے مشورہ کرتے۔
مگر کیا کریں جب عشق ہو جائے تو پھر ایسی آزمائشیں تو قسمت میں لکھ دی جاتی ہیں۔
خیر میں ہمت کر کے اپنی منزل کی طرف چل دیا۔
پندرہ منٹ کی طویل جدوجہد کے بعد میں گرتا پڑتا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔
اُس کے گھر کا دروازہ میرے سامنے تھا۔
اک عجیب نامعلوم سی خوشی۔
میں نے ہمت کر کے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
ڈر بھی تھا کے کہیں اس کے والدِ گرامی نے دروازہ کھول دیا تو پھر میرے جسم میں درد کی لہریں، خوشی کی لہروں سے دوڑ میں جیت جائیں گی۔
حالانکہ ملاقات کا وقت طے
تھا اور میں ٹھیک وقت پر پہنچا تھا۔
خدا خدا کر کے دروازہ کھلا۔
اک کانپتا ہوا ہاتھ باہر آیا اور اس کے ہاتھ میں میرے نازک دل کے تار چھیڑنے کا پیغام تھا۔
میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے لفافہ پکڑا اور گھر کی جانب ایسے دوڑ لگا دی جیسے
یونانی سپاہی میراتھون کے میدان سے فارسیوں کی شکست کی خبر لے کے بھاگا تھا۔
ایک ماہر چور کی طرح میں اپنے ہی گھر میں گھسا اور کسی کو کانوں کان تو کیا ناکوں ناک خبر نہ ہوئی۔
اپنے کمرے میں جا کر رضاء اوڑھ کر کھڑکی کے بلکل پاس بیٹھ گیا جہاں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔
میں نے لفافہ کھولا جو کہ پلاسٹک کا تھا اور پانی سے بھیگ کے اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔
میں نے احتیاط سے لفافے کو اک کونے میں رکھ دیا کیوں کے اس نے زندگی میں میرا بہت ساتھ دیا تھا۔
میرے دل کی دڑکن بے ترتیب ہوگئی۔
کیونکہ لفافے کہ اندر سے
"جہنم کی رقاصہ"
(عمران سیریز---ابن صفی)
نکلی تھی۔
"میرے تن بدن میں خوشی کی لہریں جھوم رہی تھیں۔"
اور میں ناول پڑھتا چلا جارہا تھا۔
اچانک بجلی زور سے چمکی اور کھڑکی سے آتی روشنی مدھم ہوگئی۔
تھوڑا غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ تو انرجی سیور کی روشنی ہے جو یو-پی-ایس سے مدد لے کر میری مدد کر رہی تھی، آج ک ٩ سالوں بعد ایک بار پھر "جہنم کی رقاصہ" ناول پڑھنے میں۔

اتنے سالوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔
اب میں سکول جانے کے بجائے کام پر جاتا تھا۔
میرا وہ دوست جس سے میں ناول لے کے آتا تھا اب وہ مجھے شادی شدہ ہونے کے فائدے بتاتا تھا۔
وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔
پر کچھ چیزیں آج بھی نہیں بدلی تھیں جیسے کہ
آج بھی ویسی ہی طوفانی بارش تھی۔
زینی بجلی آج بھی سسرال سے لڑکر میکے چلی گئی تھی۔
اور......اور......ناول پڑھتے وقت۔
"میرے تن بدن میں خوشی کی لہریں آج بھی ویسے ہی جھوم رہی تھیں۔"
وقت کا جال "ابن صفی" کو قید نہ کر سکا تھا۔

اردو ادب اور ابن صفی

مامون الرشید

بھاگتے قدموں کی آواز۔
سب کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔
مٹی سے بھرے جوتے اور پسینے سے تر لباس۔
گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد آج پہلا دن تھا۔
گھنٹی بجتے ہی وہ سب کھیل کے میدان سے اپنی کلاس کی طرف دوڑے تھے، کیوں کے یہ مس صبا کا پریڈ تھا جو اردو کی ٹیچر تھیں اور اپنی سخت گیر طبیعت اور سزا دینے کی وجہ سے پورے اسکول میں مشہور تھیں۔
مس صبا کو تاخیر سے آنے والے بچوں سے سخت چڑ تھی اس لیے سب بچے کلاس میں پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔
جیسے ہی مس صبا ہفتم کلاس میں داخل ہوئیں کلاس میں ایسی خاموشی چھا گئی کہ پتہ بھی ہلے تو آواز آئے۔
مس کا چہرہ دیکھ کہ سب طالب علموں کا رنگ فق ہو گیا تھا کیونکہ آج اُن کا مزاج ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اور ہر کوئی جانتا تھا کہ آج کسی نہ کسی کی شامت ضرور آئے گی۔
"اسلم، کھڑے ہو جاؤ اور اونچی آواز میں نیا سبق پڑھنا شروع کرو۔"
مس کی گونجدار آواز آئی تو اسلم جو سر نیچے کیے دل ہی دل میں شائید کوئی ورد کر رہا تھا، کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسے ابھی سے اپنے جسم میں درد کا احساس ہونے لگا تھا۔ چھٹیوں میں اس نے اردو ادب کی کتاب کو پڑھنا تو دور ہاتھ لگانے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی، کیونکہ اردو کی کتاب پڑھتے پڑھتے وہ بہت جلد اکتا جاتا تھا۔
خوف کے مارے تھوک نگل کر اس نے اپنے خشک گلے کو تر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جب پڑھنا شروع کیا تو کلاس میں ہلکی ہلکی شرارت بھری ہنسی کی آوازیں گونجنے لگیں۔
اسلم نے اردو کی ٹانگیں توڑنے سے شروع کیا تو آہستہ آہستہ ہاتھ، پاؤں اور پھر اردو کو بلکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔

ہنسی کی آوازیں اب کافی اونچی ہو گئی تھیں۔
''خاموش۔''
مس صبا کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا تھا اور اسلم کی حالت یہ تھی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
''ناصر، تم کھڑے ہو جاؤ اور شروع سے پڑھو اور اسلم تم کھڑے ہی رہو۔''
ناصر نے بھی اسلم کی پیروی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر آہستہ آہستہ آدھی سے زیادہ کلاس کھڑی ہو گئی مگر ''زخمی اردو'' کی وجہ سے سبق چند سطروں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا اور اچانک غصے سے بھرپور آواز آئی۔
''بس، چپ ہو جاؤ سب تم لوگوں کا کچھ نہیں ہو سکتا، آگے امتحانات آنے والے ہیں اور تم لوگوں کی یہ حالت ہے۔''
اُن کے سر میں بھی ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔
''بس اب میں خود پڑھوں گی۔''
جیسے ہی انھوں نے چشمہ صاف کر کے آنکھوں پر لگایا، کلاس میں ایک آواز گونجی۔
''مس اگر آپ اجازت دیں تو میں پڑھوں۔''
آواز کافی مؤدبانہ تھی۔
''جی ضرور ضرور، کیوں نہیں، آپ بھی کوشش کر لیں، ویسے اپنا نام بھی بتا دیں، آپ شائید اس کلاس میں نئے آئے ہیں۔''
مِس نے بے ساختہ مگر طنز سے بھرپور لہجے میں کہا کیونکہ یہ چہرہ ان کے لیے نیا تھا۔
''جی میرا نام اسد ہے اور میرا آج اِس کلاس اور اسکول میں پہلا دن ہے۔''
پھر اُس نے پڑھنا شروع کیا تو کلاس میں اٹھنے والی دبی دبی طنزیہ آوازیں بلکل ہی دب کر رہ گئیں۔
اتنی صاف اردو، ٹھہرا ہوا لہجہ، انداز میں شائستگی اور روانی ایسی کہ دل عش عش کر اٹھے۔ وہ مشکل سے مشکل الفاظ بھی بہت آسانی سے پڑھے جا رہا تھا۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے اردو کے الفاظ کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہو۔
مِس صبا سے رہا نہ گیا تو وہ اٹھ کر اسد کے پاس چلی گئیں اور حیرت اور خوشی سے ملی جلی آواز میں پوچھا۔
''بیٹا تم کیا پہلے سے سبق کی تیاری کر کے آئے تھے۔''
''جی نہیں یہ سبق تو میں پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔''
''پھر تمہاری اردو اتنی صاف کیسے ہے۔''
مِس نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا۔
''جی وہ ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے ایک استادِ محترم سے اردو کی تیاری شروع کر دی تھی۔''
اسد کی آواز میں شرارت تھی۔
''اور تمہارے استادِ محترم کون ہیں۔''
مِس صبا نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔
اسد کی آنکھوں میں ایک عجیب اور پراسراری چمک لہرا گئی۔

اوراس نے عقیدت بھری آواز میں جواب دیا۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

شکریہ ابن صفی

مامون الرشید

کافی دن پہلے اپنے اک دور بلکہ چنداماما دور کے جتنے دور کے رشتہ دار کے گھر جانا ہوا وہاں سب اپنے اپنے ہم عمروں کے ساتھ بیٹھ کے گپ شپ لگانے لگے ہماری ہم عمر کی بس اک دوشیزہ ہی تھیں پر وہ شاید پہلے ہی ہمارا ارادہ بھانپ کر کچن میں چینی اور پتی کا کیمیکل سلوشن بنا کہ جابر بن حیان کی روح کو خوش کرنا چاہتی تھیں۔

بادل اور بارش ناخواستہ میں گھر کہ سب سے آخر میں بنے اک خاموش کمرے کی طرف چل دیا۔

قبرستان کی سی خاموشی۔

وہاں اک بارعب اور سنجیدہ شخصیت کے مالک بزرگ اپنی پرانی الماری کی کتابیں درست کر رہے تھے میں نے ادب و آداب کے سارے سبق دل ہی دل میں دہرا کے سلام عرض کیا اور اور انھوں نے ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی اور میں اندر تک کانپ کر رہ گیا پھر انہوں نے سمندر جیسی گہری اور پر سکون آواز میں سلام کا جواب دیا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ بزرگ بہت سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں اس لیے سلام کر کے کچن کی ہی طرف جانے کا خطرہ مول لیا جائے تھوڑا ڈر لگا مگر ایسے میں اک شاعر ہمارے تصور میں آئے اور بولے۔

”گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا۔“

اور میں واپس کچن کی طرف پرواز کرنے کے لیے اپنے پر تول ہی رہا تھا۔

کہ ایسے میں اچانک کچھ گرنے کی آواز آئی۔

الماری سے کچھ کتابیں نیچے گریں تھیں اور پھر جس طرح آسمانی بجلی چمکتی ہے ایسے میں کتابوں تک پہنچا اور انھیں اٹھالیا۔ مگر پھر ایک پرانی کتاب پر نظر پڑی اور میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے تیراکی کے مقابلوں میں تمغے جیتنے لگا۔

کتاب کا نام تھا۔

جاسوسی دنیا ”طوفان کا اغوا“ ابن صفی۔

کمرے میں ایک طویل خاموشی۔

میں نے بزرگ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہاں ایک ایسی مسکراہٹ تھی جیسی ایک اُس بچے کے چہرے پر جسے من پسند کھلونا نظر آ گیا ہو۔

اس کے بعد پھر ایسی محفل جمی کہ گھر والوں کو مجھے اس کمرے سے زبردستی گھسیٹ کر باہر نکالنا پڑا۔

گھر والے حیران تھے کہ شاید میرا اس گھر میں بچپن سے آنا جانا ہے۔

کچن میں پھر سارا دن کیا بنتا رہا میرا دھیان ایک پل کے لئے ادھر نہیں گیا۔

گھر سے جاتے ہوئے ایسا لگا کہ چنداماما بہت نزدیک آ گئے ہیں۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

آخری کون ہے یہ ابن صفی

مامون الرشید

اُس کے اِس سوال سے قہقہوں بھری محفل میں اچانک اِک گہری خاموشی سی چھا گئی۔

کاشف جو پچھلے ہی مہینے امریکہ سے اپنی ایم بی بی ایس کی ڈگری مکمل کر کے واپس لوٹا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہر ہفتے چھٹی کہ دن دادا جان کے بہت سے دوست ان کے پاس آجاتے تھے اور پھر ان کی یہ محفل گھنٹوں چلا کرتی تھی اور اُس کے انتہائی سنجیدہ طبیعت کے مالک دادجان اِس محفل میں کسی بچے کی طرح خوش نظر آتے تھے۔

اس نے غور کیا تھا کے اُن کی اِس محفل میں اکثر کسی ابن صفی کا تذکرہ رہتا تھا تو اس کا تجسس بڑھتا گیا اور آج اس نے ہمت کر کے دادا جان کی کرسی کے ساتھ نیچے بیٹھتے ہوئے پوچھ ہی لیا تھا۔

اُس کے اس سوال پر سب اُسے گہری نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ تھوڑا سا پریشان ہو گیا کہ ایسے میں اس کے دادا جان کی بھاری آواز آئی۔

''بیٹا، نروس سسٹم کیا ہوتا ہے؟''

اُس کے لیے دادجان کا یہ سوال غیر متوقع تھا۔

''دادا جان، کسی بھی جاندار کے جسم میں جو سسٹم رابطے کا کام کرتا ہے اُسے نروس سسٹم کہتے ہیں۔''

کاشف نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنی طرف سے آسان لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تو بیٹا اردو جاننے اور پڑھے لکھے جانداروں کا بھی ایک نروس سسٹم ہے۔''

دادا جان نے بولنا شروع کیا۔

''اور اُسی کا نام ''ابنِ صفی'' ہے۔''

دادا جان نے بھی بات آسان لفظوں میں سمجھائی تو محفل میں موجود سب لوگوں کے ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔

❀.......❀.......❀.......❀.......❀.......❀.......❀

صفی کا جنون اور علی عمران بننے تک کا سفر (آپ بیتی)

مامون الرشید

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں تھی۔

ظہر کی نماز کے بعد کا وقت طے تھا۔

ملاقات کے لیے مسجد کے پیچھے والے میدان کا بڑا درخت منتخب کیا گیا تھا۔

دور سے میرا دوست عثمان ایک چوکنا چیتے کی طرح ہوشیار، آس پاس نظر رکھے، میری طرف بڑھتا نظر آرہا تھا۔

تپتی گرمی میں بھی اُس پر لپٹی چادر دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا کیوں کے اِس کا صاف صاف مطلب تھا کے مطلوبہ مال اس کے گھر پکڑا نہیں گیا اور وہ ساتھ ہی لایا ہے۔

جب سے ابا حضور کو ہمارے ناولوں کے شوق کا علم ہوا تھا تب سے گھروں میں جا کے ناول کا تبادلہ ہم نے ختم کر دیا تھا اور ایسے ہی مختلف خفیا جگوں پر ملاقاتیں ہوتی تھیں کیونکہ ابا جان نے جا کر عثمان کے والدِ محترم کو بھی ہوشیار کرنا اپنا فرض سمجھا تھا۔

ان دنوں ابن صفی کی عمران سیریز چل رہی تھی، خیر عمران کے دیوانے تو ہم بھی تھے مگر عثمان صاحب تو جنون کی بھی حدیں پھلانگ گئے تھے عمرانیت میں۔

ہم نے تو اپنے گھر والوں کو یقین دلا دیا تھا کے ہم نے ناول پڑھنے سے مکمل توبہ کر لی ہے اب سارا دھیان اور گیان سکول کی کتابوں میں لگاتے ہیں، لیکن ہمارے بڑے بھائی جان یہ راز جانتے تھے کے اب بھی چھپ چھپ کر عمران سیریز پڑھی جاتی ہے۔

خیر تو یہ اس خاص دن کا حادثہ ہے جس دن کو اتوار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

عصر کا وقت تھا، ابا جان گھر میں بیٹھے شام کی چائے کے ساتھ اخبار پڑھ رہے تھے۔

اور سب گھر والے آس پاس بیٹھے ابا جان کی آواز میں خبرنامہ سماعت فرما رہے تھے۔

ایسے میں اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو دل کے ساتھ ساتھ میری آنتیں بھی اچھل کر باہر آنے کو بے قرار ہو گئی تھیں۔

میں جانتا تھا یہ کون ہوگا، کیونکہ آج ابا جان کی سخت نگرانی کی وجہ سے مقررہ وقت پر میں نیا عمران سیریز کا ناول تبدیل کرنے نہ جا سکا تھا اور یہ بے صبرا عثمان ہماری سیکرٹ سروس کے بنائے سب اصولوں کو پامال کرتا سیدھا گھر آ دھمکا تھا۔

اور میری قسمت کے آج ابا جان اپنی عادت کے خلاف خود دروازہ کھولنے اٹھ گئے اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر جب سامنے عثمان کو ہاتھ میں عمران سیریز کا ناول پکڑے دیکھا تو ساری بات سمجھ گئے اور پھر اونچی اور سخت آواز میں بولے۔

''جی بیٹا کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

عثمان صاحب کو نہ ہی یہ توقع تھی کہ ہمارے ابا جان دروازہ کھولیں گیا ور اگر کھول بھی لیا تو اتنی سختی سے پوچھ گچھ ہوگی یہ انھوں نے سوچا نہ تھا۔

جناب کا رنگ پیلا پڑ گیا، ٹارزن جیسی ٹانگیں کانپ اٹھیں اور بدحواسی میں ہمارا نام ہی بھول گئے اور کپکپاتی آواز میں بولے۔

''انکل جی وہ ''علی عمران'' گھر ہے؟''

اُس کا یہ کہنا تھا کے ہمارے بڑے بھائی جان جو دروازے کے ساتھ ہی کھڑے تھے، انھوں نے اتنے زور کا قہقہہ مارا کے ہمیں ڈر سا لگ گیا کہ آج قہقے کو مار ہی ڈالیں گے۔

اُدھر عثمان صاحب بھی سمجھ گئے تھے کے ان سے کیا ہو گیا ہے تو وہ ابا جان کو سلام کر کے جواب سنے بغیر ہی ایسے گھر سے بھاگے جیسے کسی غریب کے گھر سے راشن۔

اِدھر ہم شرمندہ شرمندہ سا منہ لیے بار بار پانی کا گلاس بھر کے ایسے پیے جا رہے تھے جیسے یہ ہی ہمارے جینے کا مقصدِ اولین ہو۔

بڑے بھائی صاحب نے سب گھر والوں کو پھر پوری تفصیل سے سمجھایا کے "علی عمران" کون ہے اور عثمان صاحب کیا گل کھلا کے گئے ہیں تو سب ہی اس واقعہ سے بہت محظوظ ہوئے۔

اور پھر یہ واقعہ آہستہ آہستہ پوری برادری میں مشہور ہو گیا اور سب نیکافی عرصہ ہمیں چھیڑنے کی لیے"

مامون الرشید" کے بجائے "علی عمران" بلانا شروع کر دیا۔

ابن صفی اور بے قراری

مامون الرشید

اِس کی سانس سینے میں اٹک کر رہ گئی تھی، سَر میں دھما کے ہو رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

اِس نے آخری بار ہمت کر کے گردن گھمائی تو اِس کے بدن میں درد کی تیز لہر سی دوڑ گئی۔ ہر طرف اندھیرا تھا اِسے لگا جیسا اِس کی بینائی چلی گئی ہو پھر اِس نیا اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے زبان کا سہارا لیا تو اِسے ایسا محسوس ہوا کے اِس کی زبان پر کسی نے خشک صحرائی کانٹے اُگا دیے ہوں۔ اپنی اِس حالت پر اِسے خود پر ہی ترس آنے لگا اور پھر اچانک اُس بے وفا کے ساتھ بیتے لمحے کسی سانپ کی طرح اِسے ڈسنے لگے۔

اُس کے ساتھ گزار ہر ہر لمحہ اِس کے زخموں کو اور گہرا کر رہا تھا۔ وہ جب سے اِس گھر میں آئی تھی ایک رونق سی لگ گئی تھی اور وہ ہر کسی کے ساتھ اتنا گھل مل گئی تھی کہ ہر کوئی اُس کا دیوانہ تھا مگر اِسے اُس کیساتھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ جیسے وہ اس کی روح میں رچ بس گئی ہو۔ اُس کے بغیر ایک ایک لمحہ گزارنا مشکال تھا اِس کے لیے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اِسے یوں بنا بتائے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اُس کو گئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اُس کی یاد کی شدت نے اِس کا رہا سہا حوصلہ بھی چھین لیا تھا۔

اچانک کہیں سے اک بھولا بھٹکا آنسو اِس کی آنکھوں کی حدیں پامال کرتا تکیے پر جا گرا۔ پھر اِسے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی سی نظر آنے لگی اور کچھ لوگ اِس کے اردگرد آ کے بیٹھ گئے۔ اِس نے غور کیا تو یہ اِس کے اپنے ہی گھر والے تھے اور اُن کے ساتھ کچھ طبیب بھی تھے۔ ''طِب میں اس بیماری کا کوئی علاج نہیں، اب تو بس دعا ہی کی جاسکتی ہے۔''

اچانک ایک طبیب نے کہا تو سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، یہ طبیب پچھلے ایک ہفتے سے اِس کا علاج کر رہا تھا۔ طبیب کی بات سن کر اِس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی رینگ گئی کیوں کے یہ تو دل کا روگ تھا اور لاعلاج تھا۔ اِس کی آنکھیں اپنے ابا جان کی آنکھوں سے ملیں تو اِس کے لب ہلنے لگے اور کمرے میں بہت ہلکی سی آواز آئی۔ اِس نے انتہائی بےبسی کے عالم میں ایک آخری اور دردناک سوال کیا تھا۔

''ابا جان، آپ کے دور میں تو سمارٹ فون اور لیپ ٹاپ تو کیا ''بجلی'' جو ایک ہفتے سے ہم گھر والوں کو اکیلا چھوڑ کے چلی گئی ہے، وہ بھی نہیں تھی تو آپ کا وقت کیسے گزرتا تھا'' ابا جان ہلکا سا مسکرائے اور بولے۔

''ابن صفی کے ناول پڑھ پڑھ کے امجد بیٹا'' اور پھر کچھ دن بعد بجلی واپس لوٹ آئی۔

امجد کا سمارٹ فون اور لیپ ٹاپ بھی پوری طرح چارج تھے۔

لیکن امجد اِن سب چیزوں سے دور کسی درویش کی مانند دنیا و مافیا سے بے خبر ایسے اکیلا بیٹھا تھا جیسے وہ اس دنیا کا حصہ ہی نہ ہو۔

وہ "ابن صفی" کا ناول پڑھ رہا تھا۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

صبح کا بھولا

حامد حسن حامی

"کاش وہ مجھے معاف کر دیں کاش۔"

ٹرین کی کھٹا کھٹ کے دوران حسن نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا مرجھایا ہوا چہرہ آنسوؤں میں بھیگنے لگا۔ جنہیں اس نے فوراً اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ سمیرا تڑپ کر اٹھی تھی اور حسن کا چہرہ اپنی بانہوں میں چھپاتے ہوئے بولی۔

"بس کرو حسن بس کرو...... مانا کہ تم نے گھر چھوڑ کر غلطی کی۔ ضروری نہیں کہ تمہارے والدین بھی تم سے ناراض ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی حسن ماضی میں پہنچ گیا۔ واقعات کی ایک فلم سی اس کی نظروں کے سامنے چل پڑی۔ ایک دو کمروں کا گھر چھوٹا سا صحن صحن کے ایک کونے میں رسوائی اس کی امی رسوائی میں اور ابو صحن میں پڑی چار پائی پر بیٹھے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوا تو ابو نے غصے بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ کہاں تھے اب تک؟ ابو کھڑے ہوئے اور اسے کان سے پکڑ لیا۔

"اتنی دیر گھومتے رہتے ہو آوارہ گردی کرتے ہو شرم نہیں آتی۔" اس کی امی کا رسوئی سے نکلنا اور کہنا۔

"بہت خراب ہوتے جا رہے ہو آج کوئی کھانا نہیں بھوکے ہی سو جاؤ۔"

یہ آخری کیل تھی جس کے بعد وہ اسی رات گھر سے نکلا تھا اور لکڑی کے دروازے کو بند کرتا ہوا وہاں سے دوڑا تھا۔ سیدھا اسٹیشن اور پھر ٹرین میں چھپ گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے منظر دھندلا ہوا اور وہی ٹرین نظر آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی سمیرا کی آواز کانوں میں گونجی۔ جو اس کے ساتھ بیٹھی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیے تسلی دے رہی تھی۔

حسن والدین اولاد سے کبھی ناراض نہیں ہوتے۔ ان کا غصہ سطحی اور وقتی ہوتا ہے۔ صرف اولاد کو اچھا بنانے کے لیے۔ آج تم اچھے انسان ہو تو اس میں تمہارے والدین کی دعائیں بھی شامل ہوں گی۔ جن کے والدین ان سے ناراض ہو جاتے ہیں تو وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں امید رکھو بلکہ اچھی امید۔

حسن نے سمیرا کو دیکھا جو اس کی محسنہ تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کراچی پہنچتے ہی اسے ایسا ساتھ ملا تھا جس کا نتیجہ یا تو جیل کی چار دیواری یا ایک نشہ باز کی کسی فٹ پاتھ پر لاش کی صورت میں نکلتا۔ یہ سمیرا ہی تھی جو اسے جرم کی تاریکیوں سے امید کی روشنی میں لائی تھی اور اسی سمیرا کی کوششوں سے اس میں واپس گھر جانے کی ہمت پیدا ہوئی تھی وہ کھڑا ہوا اور باتھ روم منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

"سمیرا میں جب میں اپنے گھر میں داخل ہوتا تھا تو ابو اکثر مجھ سے سوال کرتے تھے کہ کہاں رہ گئے تھے یا اتنی دیر کیوں کر دی وہ بہت غصے ہوتے تھے اور امی تو ناراض ہو جاتی تھیں۔ اب نہ جانے امی کیا کہیں اور ابو کیا؟"

"حسن دل چھوٹا مت کرو انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔" سمیرا نے حسن کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ پھر

ان کی منزل آ گئی۔ مضطرب حسن نے سامان اٹھایا اور سمیرا کے ہمراہ ٹرین اور پھر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ ٹانگہ کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک ایک گلی دیکھ کر یاد آ رہا تھا کہ وہ یہیں دستوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتا تھا۔ اب وہ پرانی گلیوں میں موجود تھا اور اکیلا اب بھی نہیں تھا۔ اب اس کے ساتھ اس کی بیوی سمیرا بھی تھی۔ بیوی جیسے ہی بیوی کا خیال آیا اسے دل ہی دل میں مزید شرمندگی ہوئی کہ والدین کا ایک اور حق چھین لیا۔ پھر وہ دروازہ آ گیا جہاں سے جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا بھی نہ تھا کہ کہیں ابو پکڑ نہ لیں۔ کوچوان کی آواز اسے ماضی سے واپس حال میں لے آئی جو نزل آنے کا اعلان کر رہا تھا۔ حسن نے کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر بچپن کے در کی طرف بڑھا۔ سمیرا نے اسے حوصلہ دینے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ حسن نے ایک نظر اسے دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہی پرانا دروازہ تھا لکڑی کا دروازہ۔ لکڑی کا دروازہ جس کے پیچھے پردہ اس نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوا سمیرا نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا اور اس کے پیچھے اندر آ گئی۔

صحن میں دو چار پائیاں تھیں۔ ایک کونے میں رسوئی بنی ہوئی تھی جس میں ایک بوڑھی عورت کچھ پکا رہی تھی۔ بوڑھی نے اندر آنے والے کی طرف دیکھا۔ یا وامید بھری نگاہیں جو ایک لمحے کو انہیں اجنبی کو دیکھ کر فوراً جھک گئیں۔ اور ہاتھ چادر کی طرف بڑھے تاکہ پردہ کر لیں لیکن اچانک دماغ نے فیصلہ دیا کہ جسم کا بوجھ ٹانگوں پر منتقل ہوا کہ آگے بڑھ کر استقبال کرے اور بازو بڑھے کہ بانہوں میں لے کر برسوں سے بچھڑی دولت پانے کا یقین کر لیں۔ منہ سے چیخ نکلی آواز میں ڈھلی اور حسن لفظ حسن میں جکڑا اماں کے گلے لگ گیا۔ ماں خوشی سے رو رہی تھی اور حسن شرمندگی سے۔ سمیرا کے دل کو یک گونہ سکون سا محسوس ہوا کہ حسن کے خدشے بے بنیاد تھے اس کے گھر میں تو اس کا انتظار ہو رہا تھا ماں کی خوشی تو اس کے سامنے تھی۔ مگر باپ ایک لمحے کو دل میں خیال آیا کہیں حسن سے واقعی دیر تو نہیں ہوگئی ادھر حسن کے منہ سے الفاظ نکلے امی ابو کہاں ہیں۔

سمیرا کو خوف سا محسوس ہوا ماں نے آنسوؤں بھری نگاہ حسن کے چہرے پر ڈالی پھر نظریں اندرونی کمرے کی طرف اٹھیں۔ حسن نے نگاہوں کا تعاقب کیا تو دروازے پر ایک بوڑھا نظر آیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی کمر جھکی ہوئی تھی اور جسم کا سارا بوجھ اصلی دو ٹانگوں کے بجائے لکڑی کی ٹانگ پر تھا۔ چہرے پر کسی اجنبی کی وجہ سے بے چینی کے تاثرات تھے۔ جیسے ہی حسن نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیا چہرے پر نظر پڑی ایک جھٹکا سا لگا۔ جھریوں کے بھرے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ جسم کا بوجھ دونوں اصلی ٹانگوں پر منتقل ہوا کمر سیدھی ہوئی اور لاٹھی کوئی سہارا نہ پا کر نیچے گر گئی کیونکہ دونوں بازو اوپر اٹھ گئے تھے۔ گویا بیٹے کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین تھے۔ حسن فوراً دوڑا اور بوڑھے باپ کے قدموں میں گر گیا۔ باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اس نے جھک کر بیٹے کو دونوں بازوؤں سے پکڑا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ حسن کا چہرہ آنسوؤں میں تر تھا اور دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں منہ کی آگے تھے۔ باپ نے دونوں ہاتھوں کو نیچے کیا تو بیٹا روتا ہوا گلے لگ گیا۔ باپ کے سینے میں ایک ٹھنڈک سی دوڑ گئی۔ حسن نے باپ کو بھینچا ہوا تھا جب کہ والد صاحب حسن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ دوسری طرف ماں نے سمیرا کو گلے لگا ہوا تھا پھر ابو کے منہ سے الفاظ نکلے کہاں رہ گئے تھے؟

ان الفاظ کے ساتھ ہی حسن کے جسم کو جھٹکا لگا اور آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ سوال نیا نہیں تھا وہی پرانا سوال تھا۔ مگر سوال میں چھپی محبت حسن پر اب آشکار ہوئی تھی جس کا اسے پہلے احساس نہیں تھا۔

❁.......❁.......❁.......❁.......❁.......❁.......❁

منظر

حامد حسین حامی

کچھ تو تھا جو اس لڑکی میں خاص تھا ورنہ کئی لڑکیاں تھیں جو ساجد کی کلاس اور یونیورسٹی میں تھیں۔ بات چیت بحث مذاکرے اور نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا تھا کہ جن میں لڑکیوں کا سامنا ہوتا تھا۔ کبھی بھی کسی نے ایسا متاثر نہیں کیا تھا کہ کسی کی قربت کی خواہش ہوئی ہو یا کسی کی دید کے لیے دل مچل گیا ہو۔ لیکن آج ساجد امتحانات کی تیاری کے لیے اپنا سامان لے کر اوپر آیا تھا۔ کتابوں اور ورق اور قلم کی دنیا سے تھک کر ٹہلنے کے لیے کھڑا ہوا تھا اور کھڑا ہی رہ گیا تھا۔ ساتھ والے گھر کی چھت پر ایک پری وش ٹھہری شاید دھلے یا سوکھے ہوئے کپڑوں میں مصروف تھی۔ سادہ سا لباس ارتے ہوئے سیاہ گیسو...... کھلی کھلی رنگت بادامی آنکھیں ستواں ناک برگ گل سے ہونٹ صراحی دار گردن سرو قد متناسب جسم حسن کے لیے ایسا کون سا استعارہ تھا کہ جس پر وہ پوری نہ اترتی ہو۔ ساجد کو احساس ہی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے اس حسینہ میں گم ہے۔ کبھی ایک سمت تو کبھی دوسری سمت سے نظارہ ہو رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ جسم حسن ایک جگہ ٹھہر گیا۔ رخ ساجد کی طرف تھا اور نگاہوں کا طائر بھی ساجد کے گرد منڈلانے لگا۔ ایک سوال سا نظروں سے کیا گیا جواب ملا یا نہیں۔ پتا ہی نہیں چلا۔ بس پری نے نظریں چرائیں حسن کا دیوتا منہ موڑتا نہ جانے کس سمت اوجھل ہو گیا۔ تب حواس جاگے اور دنیا ادھیر نظر آئی۔ شام ڈھلنے لگی تھی گو رات کی سیاہی ابھی وارد نہیں ہوئی تھی لیکن ساجد کو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ہر سو تاریکی راج کر رہی ہے۔ بوجھل قدموں اور پراگندہ سوچوں کے ساتھ وہ نیچے چل دیا کیونکہ اب پڑھائی ممکن نہیں رہی تھی۔

اگلے دن جب آنکھ کھلی تو ذہن صاف تھا لیکن یونیورسٹی پہنچتے ہی گزشتہ شام آنکھوں میں تیرنے لگی۔ کیا تھا وہ چہرہ کچھ بھی ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی نائلہ سامنے آئی۔ غور سے دیکھا۔ بادامی آنکھیں لیکن نہیں یہ ویسی نہیں ہیں جو اس پری کی تھیں۔ صفیہ بہت خوب صورت بال لیکن وہ الگ تھی۔ ایک اور لڑکی ستواں ناک لیکن یہ بھی ویسا نہیں۔ ایک اور کی کھلی کھلی رنگت یہ بھی ویسی نہیں ایک اور کا تناسب جسم لیکن ویسا نہیں کسی کے پتلے پتلے ہونٹ کسی کی صراحی دار گردن کسی کا کچھ تو کسی کا کچھ۔ سب حسین لگ رہا تھا لیکن اس پری پیکر کے سامنے بیچ یہ کیا ہو گیا تھا؟

ساجد حیران ہو رہا تھا کہ محبت کرنے والے تو کہا کرتے ہیں کہ محبوب ذہن پر نقش ہو جاتا ہے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا بلکہ وہ حسین چہرہ ذہن کی سلیٹ سے مکمل مٹ چکا تھا کئی بار آنکھیں بند کر کے اس چہرے کے خدوخال یاد کرنے کی کوشش کر چکا تھا اور ناکام ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہی دوسری لڑکیوں کو دیکھا ویسے ہی وہ چہرہ ایسے عجیب انداز میں سامنے آتا کہ سامنے موجود چہرے دھندلے سے ہو جاتے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا ہے جو لڑکی بھول جانے کے باوجود بھولی نہیں جا رہی۔ گھر واپس آیا اور کھانے وغیرہ سے فرصت پا کر کتابوں سمیت پھر چھت پر پہنچ گیا۔ آج دوبارہ جائزہ لینا چاہ رہا تھا کہ کل ہوا کیا تھا۔ اس

نازنین کے گھر کی دیوار کے پاس آیا تو اندازہ ہوا کہ ان کی چھت کافی نیچی تھی جس کی وجہ سے ساتھ والی چھت کا کافی حصہ دیکھنا ممکن تھا۔ ذہن میں کل کا منظر دوبارہ تازہ کیا۔ وہ لڑکی جہاں ٹھہری ہوئی تھی وہ جگہ مجموعی طور پر اتنی دور نہیں تھی کہ جسے فاصلہ کہا جاتا۔ اب کیونکہ وقت دن کا ہی تھا اس لیے سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے ساجد نہ جانے کیا سوچ جا رہا تھا کہ جب قدموں کی آہٹ سنائی دی دوسری جانب سیڑھیوں پر کوئی تھا۔ ساجد حتی المقدور دیوار کے نیچے ہو گیا۔ جوتوں کی دھمک نازک قدموں کی خبر دے رہی تھی جو چھت کے دوسرے کونے سے کمرے کی طرف اور پھر اسی دیوار کی طرف آنے لگی جہاں ساجد گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی دیوار کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ جب ذرا دیر بعد قدم واپس جانے لگے تو ساجد کھڑا ہو گیا۔ ظاہر ہے اب وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ وہ مخالف سمت جا رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی ساجد کھڑا ہوا۔ کھڑا ہی رہ گیا۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁......❁

صلہ

حامد حسن حامی

حالانکہ رفتار زیادہ نہیں تھی مگر کیونکہ وہ اچانک سامنے آیا تھا اور میرا دھیان بھی اس پر بعد میں گیا تھا تو ٹکراؤ تو لازمی تھا۔ مجھے تو کچھ علم ہی نہیں ہوا کہ کیا ہوا ہے بس یہی نظر آیا تھا کہ وہ سفید داڑھی والا بابا اچانک سڑک پر آ گیا اور میں پوری طرح اس کو دیکھ ہی نہیں پایا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوئے اور میرے سر میں درد کی لہر اٹھی جو تاریکیوں پر منتج ہوئی۔ میں اس وقت سوچ کیا رہا تھا یہی کہ اماں بھی بس ہر وقت مجھے بچہ ہی سمجھتی ہے اچھا خاصا جوان ہو گیا ہوں نوکری ہے دفتر کے لوگوں میں اچھی سلام علیک ہے اور سبھی مجھے ایک باشعور اور سلجھا ہوا انسان گردانتے ہیں مگر اماں پتا نہیں کیوں ابھی تک دودھ پیتا بچہ تصور کرتی ہے۔ دو سال ہوئے مجھے نوکری کرتے ہوئے۔ سرکاری نوکری ہو اور تن آسانی نہ ہو تو ہو ہی نہیں سکتا مگر میں صرف یہ کہ اپنا مکمل مکمل اور اپ ٹو ڈیٹ رکھتا ہوں بلکہ دفتر کے تمام ساتھی میرے اچھے کام اور اخلاق کی گواہی دیتے ہیں۔

سلیم نہ صرف میرا دور کا رشتہ دار اور دوست تھا بلکہ میرے ساتھ کچھ عرصہ کام بھی کر چکا تھا۔ چھ ماہ پہلے اپنے شہر تبادلہ کرا کر مجھ سے جدا ہوا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اس سے اب کبھی ملنا نہیں ہو پائے گا۔ گھر بیٹھے ہی اسے کچھ ہوا تھا اور وہ انتقال کر گیا۔ صبح صبح ہی اطلاع ملی تھی اور میں اپنے موٹر سائیکل پر اس کے جنازے میں شرکت کے خیال سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ چالیس کلو میٹر کا فاصلہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا جب تیار ہو کر نکلنے لگا تو اماں نے ٹوک دیا۔ طارق موٹر سائیکل پر نہ جاؤ۔ بہت تیز چلاتے ہو میری جان اٹکی رہتی ہے۔'' مجھے تو غصہ ہی آ گیا کہ اماں نے ایک تو ٹوکا اوپر سے تیز رفتار کا الزام بھی عائد کر دیا بھلا ساٹھ ستر کی بھی کوئی رفتار ہوتی ہے۔ اماں کو یہی کچھ کہتا ہوا میں گھر سے روانہ ہوا اور اب تاریکیوں میں گھر گیا تھا شاید یہ اسی بدتمیزی کا صلہ تھا۔

''لیاقت اس کا بلڈ پریشر چیک کرو۔'' یہ وہ الفاظ تھے جو میری سماعت سے ٹکرانے کے بعد میرے شعور تک پہنچے تھے اور مجھے اپنی بیداری کا احساس ہوا۔ مگر میری بصارت ابھی تاریکیوں سے کھیل رہی تھی نہ

جانے کیا ماجرا تھا کہ ذرا بھی روشنی نہیں تھی جبکہ سماعت میرے اردگرد کی آوازوں کو میرے شعور تک دھکیل رہی تھی۔ میرے بازو ٹانگیں اور سارا جسم سن ہو رہا تھا۔ چہرے پر کچھ سرسراہٹ سی ہو رہی تھی مجھے احساس تھا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہے مگر مجال ہے کہ روشنی کی کوئی ایک کرن تک میری بینائی سے آشنا ہوئی ہو۔ شاید میرے چہرے پر کچھ تھا جو پیشانی سے رخساروں تک رینگ رہا تھا ناک اور ہونٹ بھی سرسراہٹ کا شکار تھے۔ داڑھی ایسی سخت ہو رہی تھی کہ جیسے داڑھی کا بال بال جکڑ دیا گیا ہو۔ دفتر کے سب لوگ مجھے سنائی دے رہے تھے کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ سبھی فکرمند لگ رہے تھے پھر وہی اجنبی آواز سنائی دی اس کے تو ناک سے بھی خون آ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اماں کی سسکیاں بھی۔ ارے اماں تم کہاں سے آ گئیں؟ اسی وقت ایسا لگا جیسے میرا داہنا بازو کسی شکنجے میں جکڑا جا رہا ہو۔ باقی جسم تو اذیت کا شکار تھا ہی بازو کی تکلیف نے دوہرا کر دیا۔ شکنجہ آہستہ آہستہ ڈھیلا ہونے لگا اور پھر میرا بازو آزاد ہو گیا۔ ''بی پی ٹھیک ہے سر۔'' اس جملے کے ساتھ ہی میرا دل چاہا کہ میں بولوں اور پھر میں ٹھیک ہوں یار۔ میرے منہ سے نکلا۔ کیونکہ اماں کی سسکیاں بڑھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اجنبی آواز نے کہا۔

''لیاقت اس کے ناک کی پیکنگ کرواور اسے ضلعی اسپتال بھیجنے کا بندوبست کرو۔ میں اس کی پرچی بنا دیتا ہوں۔ ٹھیک ہے سر کا جواب آیا اور اماں کی سسکیاں زیادہ ہو گئیں۔ ناک پر طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ مختلف آوازوں کا ملا جلا ہجوم ہوا اور پھر کچھ دیر بعد ایسا لگا جیسے میں فضاؤں میں اڑنے لگا ہوں۔ تیر رہا ہوں۔ ایک جھونکا سا آیا اور سماعت بھی خاموش ہوئی۔

ہوش آیا تو اسپتال کا ہی کمرہ تھا اور میں اکیلا نہیں تھا۔ کئی مریض بستروں پر اور ایک ایک فرد ہر بستر کے ساتھ موجود تھا۔ غالباً سبھی سو رہے تھے۔ گھومتے گھومتے میری نظر اپنے بستر کے ساتھ موجود بنچ پر گئی تو اماں آنکھیں بند کئے ہاتھ میں تسبیح لیے کچھ ورد کئے جا رہی تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کمرے میں کچھ اور مریضوں کے ساتھ بھی خواتین تھیں جو کہ نیند کی لذت میں گم تھیں مگر اماں کچھ ایسی شرم آئی کہ خود بخود آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کچھ بولوں۔ بولنا چاہا تو طاقت جواب دے گئی اور الفاظ حلق سے برآمد ہی نہ ہوئے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے تو باآسانی ہلنے لگے۔ ایک ہاتھ سے انسو صاف کئے تو پتا چلا کہ ماتھے سمیت پورے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے ابھی پٹی کو چھو رہا تھا کہ ہاتھ کو ایک ہاتھ نے تھام لیا۔ چہرے پر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور نیچے بدن کی طرف جانے لگا۔ آنکھیں کھولیں تو اماں کا چہرہ نگاہوں میں آیا جو پھونک مار کر خوشی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ یہ ہے میری ماں اور میں؟ مارے ندامت کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے اور اماں کا چہرہ آنسوؤں کے پردے میں دھندلا رہا تھا۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے میرے بیٹے کو نئی زندگی عطا کی ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ اماں نے اپنے آنچل سے میری آنکھیں صاف کیں اور میں نے محسوس کیا کہ آج مجھے ظاہری طور پر نہیں بلکہ باطنی طور پر میری ماں دکھائی دے رہی ہے شاید میرا باطن صاف ہو رہا تھا مجھے اپنے کیے پر شرم آ رہی تھی۔ میں نے اماں کے آگے ہاتھ جوڑے اور معافی کا طلب گار ہوا۔ مگر ابھی میں نے اماں کو کہاں دیکھا تھا۔ ماں تو وہ ہے کہ جس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے اور پھر میری پیشانی پر ممتا ثبت کر دی۔ اتنی

ساری پٹیاں ہونے کے باوجود میں نے اماں کی محبت اپنے دماغ میں اترتی محسوس کی۔ ماں معاف کرنے میں کہاں دیر کرتی ہے اولاد چاہے لاکھ برا کر لے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ میں چار دن تک بے ہوش رہا اور دماغ والے وارڈ میں میری نگہداشت ہوتی رہی۔ اس دوران صرف اماں ہی تھیں جو میرے سرہانے میرے لیے دعائیں کرتی رہی تھیں۔ اب تو میرے لیے اماں ہی سب کچھ ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اماں کے آگے ایک بھی لفظ نہ بولوں۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁......❁

ابن صفی

عابی خان

اسلام وعلیکم ممبرز......!

آخر کار میں بھی ''ابن صفی'' کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز مکمل پڑھنے والے خوش قسمت لوگوں میں شامل ہو ہی گئی۔

آج سے کچھ ماہ پہلے تک میں ابن صفی کے بارے میں صرف اتنا جانتی تھی کہ عمران سیریز کے سب سے پہلے مصنف ہیں اور عمران فریدی وغیرہ یہ سب کردار ابن صفی کے ہیں...... کبھی ابن صفی کو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کیونکہ میری محدود سوچ یہ تھی کہ اتنا پرانا ادب شائد میں سمجھ نہ پاؤں... لیکن جاسوسی دنیا کا صرف ایک ناول پڑھتے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ میری سوچ غلط تھی... تو یہی کوئی پانچ چھ ماہ میں دونوں سیریز مکمل پڑھ لی ہیں اور میرے مطالعے کے سفر میں یہ پانچ چھ ماہ یادگار بن گئے ہیں...... میرے پاس الفاظ نہیں جن میں میں "ابن صفی" کو خراج تحسین پیش کرسکوں... لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ "ابن صفی" کو پڑھنے کے بعد کسی اور مصنف کو بہت کوشش کے باوجود نہیں پڑھ سکی... میرے لئے اپنے محسوسات کو الفاظ کے احاطے میں لانا مشکل ہے بس خوشی محسوس کر رہی ہوں حد سے زیادہ۔

اور یہاں خصوصی شکریہ ادا کروں گی سید فہد حسینی سر کا جن کے مشورے پر "ابن صفی" کو پڑھا اور اس دوران انہوں نے دونوں سیریز کے حوالے سے بہترین معلومات فراہم کیں...... جزاک اللہ خیر۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁......❁

ابن صفی

تحریر گلشن زاہرا

بہت خوب مضمون۔ ایک نئے انداز فکر کے ساتھ اپنے پسندیدہ مصنف پر ایک بھرپور نظر۔ نئی نسل کو باہر سے آکر کوئی نہیں پڑھائے گا۔۔۔ یہ میرا آپ کا کام ہے کہ اپنے دائرہ اختیار میں بچوں کو اردو کی کتابوں، اچھی ویب سائٹس اور لکھنے والوں سے متعارف کرائیں۔ کسی ایک بچے کو اپنے ساتھ بٹھا کر اسے اردو کی کہانی سنایئے۔ ناممکن ہے کہ وہ دلچسپی نہ لے۔ بس یہ تھوڑی سی محنت ہے۔ پڑھے یا نہ پڑھے بچے کو تحفے میں اس کی عمر کے لحاظ سے کتاب ضرور تحفے میں دیں۔ یہ شاید بہت سے قیمتی تحائف سے کم قیمت ہو مگر اس کے اثرات بیش قیمت ہوں گے! احمد صفی

السلام علیکم

جب بھی کوئی نظام تباہی اور بربادی کا سامان لئے اپنا رخ انسانیت کی جانب موڑتا ہے تب رب باری تعالیٰ کی رحمت کا خودکار نظام کچھ اس طرح سے حرکت میں آتا ہے کہ صدیوں تک گونج سنتا ہے۔

یہی حال برصغیر پاک و ہند کے ادبی نظام کا ہوا جہاں تہذیب ایک طوائف کی آنکھوں سے ابھرتی تھی اور اس کے گھنگھروؤں کی جھنکار میں غروب ہو جاتی تھی۔

جہاں شعراء شراب و شباب کی محافل میں دیوان چھاپتے پھرتے تھے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا مگر جب اس کا رخ عام نوجوان نسل کی جانب ہوا اور اس کے اثرات انسانیت کی حدود پھلانگنے لگے اور مستقبل کے معمار اسے اپنی منزل سمجھ بیٹھے حتیٰ کہ دینی محافل میں بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا تب خدا کی خدائیت کے بھید آشکار ہونا شروع ہوئے اور اسرار کھلنے لگے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ الہ آباد میں ایک متوسط گھرانے میں جنم لینے والا بچہ ایک نئے دور کے راز بتائے گا۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ سات سال کا بچہ طلسم ہوشربا کے شربوں میں گم کئی نسلوں کو اپنے خوابوں کے طلسم میں جکڑے گا۔ کس کے گمان میں تھا کہ وہ ایسے کردار تخلیق کرے گا جو ذہنی الجھنوں اور یاسیت و ناامیدی کی شکار نوجوان نسل کو ہدایت و امید اور روشنی کی سمت گامزن کریں گے جو قانون کی حفاظت جوانوں کا نصب العین بنائیں گے۔ کس کے تصور میں تھا کہ وہ جزباتیت وعریانیت سے بھرے ادبی ماحول میں خود سے وعدہ کرے گا کہ وہ ان سب سے الگ ہے تو یہ دکھانا ہوگا اور پھر اس نے ایسے بے مثال کردار تخلیق کئے جو اپنا وجود نہ رکھتے ہوئے بھی سب کے وجود کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نے تاریخ کو سنہری لبادے سے ڈھک دیا۔ جس طرح طور اک تجلی نہ سہہ سکا اسی طرح نام نہاد ادبی حلقہ اس کی آب و تاب کی تاب نہ لاسکا جل کے خاک ہوا اور اس کے خلاف صفحے کالے کرنے لگا۔ مگر جسے رب العزت نے عزت بخشی اور جس نے گرتی ہوئی تہذیب و ادب کو دین اور قانون کی حقیقی روشنی و پاسداری سے متعارف کروایا اس نے اپنا وقت جسم روح سب کچھ اس عظیم مقصد کی راہ میں صرف کردیا اور تب جا کے تاریخ نے اپنے اوراق پر درخشندہ الفاظ میں لکھا کہ اس شخص (ابن صفی) کا اردو (کئی نسلوں کی زباں) پر بڑا احسان ہے۔

جی ہاں وہ اسرار جو اسرار ہی رہا اور وہ ابن صفی جسے آج تک اک دنیا کھوجتی ہے پوجتی ہے۔ وہ اسرار جسے وقت نے بہت کم مہلت دی مگر وہ وقت کو عظیم بنا گیا۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁......❁

ڈاکٹر کرسٹینا اویسٹر ہیلڈ

جرمنی کی ڈاکٹر کرسٹینا اویسٹر ہیلڈ جو اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون ہیں ان سے خصوصی گفتگو 2007ء

سوال۔ ابن صفی کے چکر میں کیسے پڑگئیں؟

اسے چکر نہیں کہیے۔ یہ تو حسن اتفاق تھا کہ ادب کی دنیا میں سرراہ چلتے چلتے ابن صفی جیسا زمانہ شناس مل گیا۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال میں ان کے ناولوں کو پڑھ رہی ہوں۔ ان کے 250 کے قریب ناولوں میں سے 20-25 اب تک پڑھے ہیں ساتھ ہی ساتھ ترجمے کا کام بھی شروع کر رکھا ہے ابن صفی کے معیار سے میں بے حد متاثر ہوں وہ بہت ہی باشعور ادیب تھے ان کے ناولوں میں مکالے اور طنز و مزاح کو ب پائے

جاتے ہیں۔

سیلف کرٹی سزم بھی موجود ہوتا ہے۔ ان میں دیباچے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پیش لفظ کو پیش رس کہتے تھے ان میں ان کے اسلوب اور رویے کے بارے میں جاننے کو ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قارئین کے ردعمل کی بھی واقفیت ہو جاتی ہے اس طرح کا مواد دوسرے ادیبوں کے یہاں شاذ و نادر ہی دکھائی پڑتا ہے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی خوش مزاج نیک اور معصوم تھے۔ ان میں کوئی چھل کپٹ نہیں تھا۔ عام طور پر ادیب حساس ہوتے ہیں لیکن وہ بہت ہی معتدل مزاج تھے۔ ان میں انا بھی نہیں تھی۔ بہت ہی انکساری سے کوئی بات کہتے تھے مجھے ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے کردار فریدی اور عمران کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بد پھیرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ابن صفی کے جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے اس لیے اس محض تفریح ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔

ظفر الملک اور جیمسن سے عمران کی پہلی ملاقات

ادا علی (دھلی بھارت)

کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اس لیے سردار گڈھ کے مسافر کم ہی ہوتے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور سرد ہوا لباس سے گزر کر کھال میں پیوست ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔

جمن نے اوورکوٹ کا کالر کانوں تک اٹھا لیا تھا اور کبھی کبھی عمر رسیدہ خشکی کے کچھوے کی طرح گردن ابھار کر خالی کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگتا تھا۔ دفعتاً گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور آخر کار وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ ساتھ ہی کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر گھس آیا۔ کچھ بوکھلایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ ظفر اور جمن نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ آنے والا جوان العمر تھا۔ نیلے سوٹ پر زرد قمیض پہن رکھی تھی اور گلے میں سرخ رنگ کی ٹائی لہرا رہی تھی۔ فلٹ ہیٹ میں سرخ گلاب لگا رکھے تھے صورت سے پرلے درجے کا احمق معلوم ہوتا تھا ویسے خدوخال دلکش تھے۔ وہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر ان دونوں کو احمقانہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو۔" ظفر مسکرا کر بولا۔ اس نے احمقانہ انداز میں اپنے سر کو منفی جنبش دی۔

"پھر اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔" نوارد بولا۔

"اگر میرے بال بھی تمہاری ہی طرح ہوتے تو کیسا لگتا۔"

"فائن۔" ظفر مسکرایا۔

"تمہاری ٹوپی مجھے پسند آئی بڑی سلیقے سے پھول لگائے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کہ اس ملک میں ابھی تک صرف تم ہی نظر آئے ہو۔"

''اور جناب کا کس ملک سے تعلق ہے۔'' نو وارد نے پوچھا۔
''تعلق تو اسی ملک سے ہے لیکن بچپن ہی سے لاتعلق رہ کر دوبارہ متعلق ہوا ہوں۔''
''ماشاءاللہ!'' نو وارد نے جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا۔
''اوہو..... تم تو اپنے ہی قبیلے سے معلوم ہوتے ہو..... آئی ایم اے ہپی!'' ظفر نے چیونگم کا پیکٹ اس کی ہتھیلی سے اٹھاتے ہوئے کہا۔
''وی آر آل ہپیز۔'' اجنبی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر احمقانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ پھر بڑی تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ ظفر بھی بوکھلا کر اٹھ گیا تھا۔ نو وارد بڑے والہانہ انداز میں اس سے بغل گیر ہو گیا اور آہستہ سے اس کے کان میں بولا۔
''تم میرے لباس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہو ہو۔''
''یہ حقیقت ہے!''
''ارے تو چلو بدل لیں۔''
ظفر اسے حیرت سے گھورنے لگا۔ گاڑی دوبارہ حرکت میں آ کر رفتار پکڑ چکی تھی۔
''تم میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔'' اجنبی چہک کر بولا۔
''وی آر ہپیز میرا سب کچھ تمہارا ہے اور تمہارا سب کچھ میرا۔ ہم دنیا کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم امن کے پیامبر ہیں۔ ہم جنگ سے نفرت کرتے ہیں ہمارا پیغام محبت ہے آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ظفر کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانے کی طرف کھینچنے لگا۔
''باس۔'' جمن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
''آپ کی تعریف!'' اجنبی اس کا ہاتھ چھوڑ کر جمن کی طرف مڑا۔
''میرا ساتھی۔''
اجنبی جھپٹ کر جمن سے بھی نہ صرف بغل گیر ہو گیا بلکہ اس کی بے ترتیب داڑھی کو دو تین بوسے بھی دیئے۔
''مسٹر مسٹر۔'' جمن ناگواری سے بولا۔
''بردار کہو برادر۔'' اجنبی نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ اور پھر ظفر کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانے کی طرف لے جانے لگا۔
''آپ چاہتے ہیں کیا جناب؟'' جمن اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
''میں ان س لباس تبدیل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ انہیں پسند ہے۔''

❁.....❁.....❁.....❁.....❁.....❁

جوزف سے عمران کی پہلی ملاقات

ادا علی (دھلی بھارت)

عمران کچھ نہ بولا۔ وہ چیونگم کا پیکٹ پھاڑ رہا تھا۔ دفعتاً وہ دروازہ تیز آواز کے ساتھ بند ہو گیا اسے وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے اور عمران اچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن لڑکی بدستور بیٹھی رہی۔ سا ے شائد عمران

کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی تھی پھر مغربی جانب کا زر کھلا اور ایک تیم شحیم سیاہ فام آدمی اندر داخل ہوا جس کے جسم پر صرف ایک جانگیا تھا۔ عمران نے اس کے جسم کی بناوٹ سے اندازہ کرلیا کہ وہ کوئی کہنہ مشق قسم کا باکسر ہے۔

"وکیل صاحب سے ملیے ڈاکٹر ڈھمپ۔" لڑکی مسکرائی۔

"خوب!" عمران معنی خیز انداز میں سر ہلا کر مسکرایا۔ لیکن اس کے چہرے پر نظر آنے حماقتوں میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس وکیل کو تمہیں یہ بتاتا ہے ڈاکٹر ڈھمپ کو تم حقیقتاً کون ہو اور تم کیوں یہاں کیوں مقیم تھے۔

"میں اس وکیل کا بھی معقول علاج کرسکوں گا۔" عمران نے کہا۔ اس پر لڑکی ہنس پڑی اور پھر بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم خالی ہاتھ ہو۔ تمہارے پاس ریوالور نہیں ہے۔

"لاحول ولاقوہ۔" عمران برا سا منہ بنا کر بولا۔

"یہاں ریوالور رکھتا ہی کون مردود ہے..... غل غپاڑہ مچانے والی چیزوں سے مجھے اختلاج ہوتا ہے۔"

"جوزف اسے سنبھالو۔" لڑکی نے سفاکانہ لہجہ میں کہا اور ڈراؤنا نکیرو دانت نکال کر عمران کی طرف بڑھا۔ عمران کھسک کر دیوار سے جا لگا تھا۔ نکیرو بڑی تیزی سے اس کی طرف مڑا۔ اس کا گھونسہ ایسا ہی تھا کہ ہاتھی کا جبڑا بھی ہل کر رہ جاتا۔ لیکن چیخ خود اسی کے منہ سے نکلی تھی۔ کیونکہ اس کا گھونسہ دیوار پر پڑا تھا اور عمران اس سے تھوڑی دور کھڑا چیونگم کے پیکٹ سے چیونگم نکال رہا تھا۔

تکلیف کی شدت میں نکیرو نے اس پر چھلانگ لگائی تاکہ دبوچ بیٹھے لیکن اس دوران میں عمران نے نہ صرف چیونگم کا پیس منہ میں ڈال لیا تھا بلکہ اس کا داہنا ہاتھ اس کی مرمت کے لئے بھی تیار ہوگیا تھا۔ اپنے جھکائی دے کر اس کی زد سے نکلتے ہوئے بائیں کنپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ نکیرو اسے اناڑی سمجھ کر محتاط نہیں تھا۔ اس لیے اس کے پیر اکھڑ گئے اور وہ اچھل کر لڑکی پر جا گرا لڑکی کی چیخ چھت پھاڑ دینے والی تھی۔ ساتھ ہی نکیرو بھی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اٹھ کر پھر عمران کی طرف جھپٹا اور لڑکی دروازہ کھول کر کسی نادر کو آواز دینے لگی۔ ادھر اس بار عمران نے نکیرو کی بائیں پسلی پر ٹھوکر رسید کی تھی اور وہ بلبلا کر پھر فرش پر ڈھیر ہوگیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں ٹیکسی ڈرائیور کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک بڑا فولادی رنچ تھا۔ وہ اسے تولتا ہوا عمران پر جھپٹا۔ نکیرو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے بڑی پھرتی سے ڈرائیور کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اس کی پیٹی پر ہاتھ ڈال دیا پھر وہ اس کے سر سے بلند ہوچلا گیا اور اس بار نکیرو کے سر پر پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ عمران نے ڈرائیور کو اس پر پھینک مارا تھا۔ دو تیز قسم کے کراہوں سے کمرہ پھر گونج اٹھا ڈرائیور کا فولادی رنچ نکیرو کے سر پر پڑا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ اٹھ ہی نہیں سکا۔ ڈرائیور نے دانت پیستے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر جبڑوں میں جنبش کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی عمران کی بھرپور..... کر منہ ہی پر پڑی تھی ہوسکتا ہے کہ دو چار دانت ہل بھی گئے ہوں۔ پھر عمران نے چھلانگ لگائی اور لڑکی کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ جو نکل بھاگنے کی فکر میں تھی۔

"چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ٹھیک اسی وقت عمران نے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور لڑکی کو چھوڑ کر باہر جھپٹا۔ مگر اب شائد اس کے فرشتے بھی ٹیکسی کو نہ پاسکتے۔ وہ بڑی تیز

رفتاری سے روانہ ہوئی تھی۔ عمران پھر کمرے میں پلٹ آیا۔ لیکن اس بار لڑکی اس پر بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹی۔ اس کے ہاتھ میں بیہوش ڈرائیور کا فولادی رینچ تھا۔

❀……❀……❀……❀……❀……❀

تھریسیا سے عمران کی پہلی ملاقات

ادا علی (دہلی بھارت)

عمران نے اسے دیکھا وہ سچ مچ بہت حسین تھی۔ نکلتا ہوا قد متناسب الاعضاء جسم پر چست لباس شانوں پر ڈھلکتی ہوئی گھونگھریالی زلفیں جن کی رنگت سنہری تھی۔ خدوخال غیر معمولی جن کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ناقابل بیان ہیں یعنی الفاظ میں ان کی تصویر پیش کرنا ناممکن ہے۔ بہتیرے کہتے ہیں کہ شاید وہ خود بھی کوئی روح ہے خود عمران نے بھی محسوس کیا کہ کچھ دیر دیکھتے رہنے کے باوجود بھی محض یادداشت کے سہارے اس کی شکل وصورت کے متعلق کچھ نہ بنا سکے گا کبھی اس کا اوپری ہونٹ ایک خفیف سے خم کے ساتھ اوپر اٹھ جاتا اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ناک کی جڑ سے دہانے تک بالکل ہموار ہو۔ کبھی آنکھیں خواب ناک سی معلوم ہوتیں اور ان سے اداسی جھانکنے لگتی اور کبھی ایسا معلومہوتا جیسے جسم کی ساری قوت آنکھوں میں کھنچ آئی ہو۔ نہ جانے کیوں ان بدلتی ہوئی کیفیات کا اثر اس کا خدوخالپر بھی پڑتا تھا۔

وہ لان پر ٹہل رہی تھی اس کے ساتھ جمیل بھی تھا۔ شکیل اور جمیل میں کافی مشابہت تھی ویسے دونوں کی ظاہری حالتوں میں بڑا فرق تھا۔ جمیل کے چہرے پر سنجیدگی تھی ٹھہراؤ تھا اس کے برعکس شکیل کھلنڈرا اور سوخ معلوم ہوتا تھا۔

”کیا میں جمیل بھائی سے تمہارا تعارف کراؤں۔“ شکیل نے عمران سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ عمران دانت جما کر بولا۔

”میں رقیبوں سے متعارف ہونا پسند نہیں کرتا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں ابھی اور اسی وقت ان حضرت کو رقیب ڈکلیر کرتا ہوں کیونکہ پہلی ہی نظر میں اس دمبالہ عالم پر عاشق ہو چکا ہوں۔

”دمبالہ عالم یہ کیا بلا ہے۔“ شکیل پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

”جاہل ہو تم کیا جانو میں نے اردو کے ایک عشقیہ ناول میں پڑھا تھا۔ عاشق اپنی ممنونہ ارر پھر بول گیا کیا کہتے ہیں محبوبہ محبوبہ کو ستمگر جفا پیشہ اور دمبالہ عالم کہتا ہے۔

”ابے فتالہ عالم ہو گا عاشق کے بچے۔“

”اررہاں یہی تھا۔“ عمران حیرت سے بولا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”دیکھو ڈیر عمران! تم اسے الو بنایا کرو جو تم سے واقف نہ ہو۔“

”اچھا تو کوئی ایسا ہی آدمی پکڑ لاؤ میں اس وقت الو بنانے کے لیے بے چین ہوں۔ جلدی کرو ورنہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔“

دفعتاً اسٹاریٹا ان کی طرف مڑی وہ اس سے تھوڑی ہی فاصلے پر پام کے بڑے گملوں کے درمیان کھڑے تھے شکیل کو دیکھ کر وہ بڑے دلاویز انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ کچھ اسطرح ان کی جانب سے بڑھنے لگی جیسے وہ ارادتاً ایسا نہ کر رہی ہو کچھ یونہی چہل قدمی کے طور پر۔

ارے باپ رے۔'' عمران خوفزدہ آواز میں بولا۔

''یہ تو اسی طرف آ رہی ہے۔''

''آنے دو میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔'' عمران نے جیب سے تاریک شیشوں کی عینک نکال کر لگالی۔

اسٹاریٹا ان کے قریب آ کر رک گئی۔ اس کے ساتھ شکیل کا بڑا بھائی جمیل بھی تھا۔

''ہیلو مسٹر شکیل۔'' ریٹا نے اپنی مسکراہٹ میں کچھ اور زیادہ دلکشی پیدا کر کے کہا۔

''آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔''

یہی شکایت مجھے بھی آپ سے ہے۔'' شکیل موم کے ڈھیر کی طرح پگھل گیا۔''

''واہ! وہ ہنسی۔'' میں تو یہیں رہتی ہوں۔''

''مگر آپ بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں شکیل نے کہا۔''

''پھر بھی مجھے توقع ہے کہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''یقیناً شکیل مسکرایا۔

جمیل اس دوران عمران کو گھورتا رہا تھا جو کسی فوجی کی طرح اٹینشن کی پوزشن میں کھڑا تھا لیکن جمیل نے شکیل سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔

وہ دونوں پھر ٹہلتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ عمران بدستور اسی طرح کھڑا رہا جب اسٹاریٹا اور جمیل دوسری طرف کی کنجوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے تشکیل عمران کو جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

''تمہیں تو سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔

عمران کسی اکڑی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

''ارے اچانک شکیل بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ عمران کی سیاہ عینک کے شیشے کے نیچے موٹے موٹے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ پھر اسنے اس کی عینک اتار لی۔ عمران کی آنکھیں کچھ ویران سی نظر آ رہی تھیں اور آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے شکیل نے ایک قہقہے کے لیے اسٹارٹ لیا۔ لیکن پھر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے وہ غلطی پر رہا ہو کیونکہ عمران کی سنجیدگی اور آنسوؤں کی روانی میں کوئی فرق ہیں واقع ہوا تھا۔

''عمران کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' شکیل اسے دوبارہ جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

''کچھ نہیں۔'' عمران ٹھنڈے سانس لے کر بولا۔

''جب مجھے کوئی شعر یاد نہیں آتا تو یہی حالت ہوتی ہے۔ میری میں بہت دیر سے وہ شعر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیوانہ بنانا ہے تو پروانہ بنا دے۔ لیکن پورا شعر یاد نہیں آ رہا۔ تم بتاؤ میں کیا کروں پچھلے سال ایسے ہی ایک موقع پر مجھے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔

''کیا بک رہے ہو۔'' شکیل بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ارے لعنت ہے تمہاری دوست پر میں رو رہا ہوں اور تم ہنس رہے ہو خدا سمجھے تم سے۔"

"کیا اس عورت نے تمہیں رونے پر مجبور کیا ہے۔"

"نہیں وہ بیچاری کیوں ویسے وہ مجھے سو فیصد یتیم معلوم ہوتی ہے۔ یہ تمہارے بھائی جمیل تھے۔ عمران رومال سے آنسو خشک کرتا ہوا بولا۔

"تم رو کیوں رہے تھے۔"

"میں اس لیے رو رہا تھا کہ یہ مقدر ہی کی خرابی ہے مجھے ایک ایسے رقیب کو قتل کرنا پڑے گا جو میرے بھائی کا دوست ارر دوست کا بھائی ہے۔"

"کیوں بک رہے ہو۔" شکیل برا سامنہ بنا کر بولا۔

میں بک رہا ہوں۔" عمران دانت پیس کر بولا۔ کیا حق ہے تمہارے بھائی کو میں نے اس عورت کو آج سے اٹھارہ سال پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ بس تم جلدی سے جوان ہو جاؤ۔ ہاں پھر جب میں جوان ہو گیا تو۔ اس نے ایک رات پھر خواب میں کہا اب تم جلدی سے بوڑھے ہو جاؤ ہم دوسری دنیا میں ملیں گے۔ فراڈ سالی کہیں کی ارر ہپ لاحول شائد محبوبہ کو سالی والی نہیں کہا جاتا اچھا اب تم مجھے اجازت دو میں ذرا سول لائنز تک جاؤں گا۔"

"کیا دو ٹھہر جاؤ اب اس کے عقیدت مندوں کی بھیڑ بھاڑ بھی دیکھتے جاؤ۔"

"نہیں کیا تم مجھ سے بیٹا اپنا قتل کرانا چاہتے ہو۔"

"کیا تم کسی وقت بھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔"

"یہ سوال اس وقت کرنا جب میں کفن میں نظر آؤں اچھا ٹاٹا! میں ایک گھنٹے بعد واپس آ جاؤں گا۔"

عمران تیر کی طرح پھاٹک سے نکلا کچھ دور پیدل چلتا رہا پھر ایک جگہ ایک ٹیکسی مل گئی اور وہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹیلی گراف آفس کے سامنے اس نے ٹیکسی رکوائی۔ اور سیدھا اس کاؤنٹر کی طرف چلا گیا جہاں سے فون پر ٹرنک کال کی جا سکتی تھی۔ پنچ منٹ بعد وہ طویل فاصلے سے اپنی ماتحت جولیانا فٹز واٹر سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔

"جولیانا فٹز دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ایکس ٹو شاداب نگر سے۔ تم اور کیپٹن جعفری پہلے ملنے والے جہاز سے شاداب نگر پہنچو۔ تم سب ایک طرح سے نالائق ہو اگر میں عمران پر نظر نہ رکھو تو وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک جائے۔

"کیوں...... کیا ہوا جناب۔"

"ٹی تھری بی۔"

"میں نہیں سمجھی جناب۔"

❀......❀......❀......❀......❀......❀

روشی کی عمران سے پہلی ملاقات

ادا علی (دہلی بھارت)

روشی! اسے بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شام ہی ہوٹل میں داخل ہوا تھا اور اب سات بج رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوائیں کچھ بوجھل سی ہوگئی تھیں۔ جب وہ ہوٹل میں داخل ہوا تھا تو روشی کی میز کے علاوہ اور ساری میزیں خالی پڑی تھیں لیکن اب ہوٹل میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور جامہ زیب نوجوان تھا۔ لیکن یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کی بناء پر روشی اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ اسی ہوٹل میں اس نے اب سے پہلے درجنوں خوب صورت آدمیوں کے ساتھ سینکڑوں راتیں گزاری تھیں اور اس کی وہ حس کبھی کی فنا ہوچکی تھی جو صنف قوی کی طرف متوجہ کرنے پر اکساتی ہے۔

روشی ایک اینگلو برمیز عورت تھی۔ کبھی لڑکی بھی رہی ہوگی لیکن اب یہ بہت پرانی بات ہوچکی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سنگاپور پر جاپانیوں نے بمباری کی تھی اور جدھر جس کے سینگ سمائے تھے بھاگ نکلا تھا۔ روشی چودہ سال کی ایک لڑکی تھی اس کا باپ سنگاپور کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ لیکن بہت بڑے تاجر کی بیٹی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ روشی تین دن کے فاقے کے بعد ایک کپ چائے کے عوض لڑکی سے عورت نہ بن جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے باپ کو ایک کپ چائے بھی میسر نہ آئی ہو کیونکہ اس میں لڑکی سے عورت بننے کی صلاحیت تو تھی نہیں۔ بہرحال روشی اس کے انجام سے آج بھی ناواقف تھی اور اب وہ ایک پچیس سال کی پختہ کار عورت تھی۔ لیکن گیارہ سال قبل کی روشی نہیں تھی۔ چائے کا وہ کپ اسے آج بھی یاد تھا اور وہ اب تک ایسے درجنوں آدمیوں کو ایک کپ چائے کے لیے محتاج کرچکی تھی۔

اب اس کے پاس ایک عمدہ سا آرام دہ فلیٹ تھا۔ دنیا کی ساری آسائشیں میسر تھیں اور اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی فاقے نہ کرے گی۔

یہ ہوٹل اس کے کاروبار کے لیے بہت موزوں تھا اور وہ زیادہ تر راتیں یہیں گزارتی تھی۔ یہ ہوٹل کاروبار کے لیے یوں مناسب تھا کہ بندرگاہ یہاں سے قریب تھی اور دن رات یہاں غیر ملکیوں کا تار بندھا رہتا تھا جن میں زیادہ تر سفید نسل کے لوگ ہوتے تھے اور یہ ہوٹل چلتا بھی انہیں کے دم سے تھا اور نہ عام شہری ادھر کا رخ بھی نہیں کرتے تھے مگر روشی اس بنا پر بھی اس نوجوان میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی کہ وہ کوئی جہاز راں نہیں تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ جب سے آیا تھا قدم قدم پر اس سے حماقتیں سرزد ہورہی تھیں۔ جیسے ہیڈ ویٹر نے پیشانی تک ہاتھ لے جاکر اسے سلام کیا اس ہوٹل کے سارے ویٹر آنے والے گاہکوں کو سلام کرنا ضروری خیال کرتے تھے خواہ وہ نئے ہوں خواہ پرانے۔ اس نے بھی باقاعدہ طور پر نہ صرف اس کے سلام کا جواب دیا بلکہ مودبانہ انداز میں کھڑی ہوکر اس سے مصافحہ بھی کرنے لگا اور کافی دیر تک اس کے بال بچوں کی خیریت پوچھتا رہا۔

پہلے اس نے چائے منگوائی۔ اور خاموش بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ چائے ٹھنڈی ہوگئی پھر ایک گھونٹ لے کر برا سا منہ بنانے کے بعد سانے چائے واپس کرکے کافی کا آرڈر دیا۔ کافی شائد ٹھنڈی چائے سے زیادہ بدمزا معلوم ہوئی اور اس نے کچھ اس قسم کا منہ بنایا جیسے ابکائی روک رہا ہو پھر اس نے کافی بھی واپس کردی اور پے در پے ٹھنڈے پانی کے کئی گلاس چڑھا گیا۔ اندھیرا پھیل گیا اور ہوٹل میں برقی قمقمے روشن ہوگئے۔ لیکن اس احمق نوجوان نے شاید وہاں سے نہ اٹھنے کی قسم کھالی تھی۔ روشی کی دلچسپی بڑھتی رہی! وہ بھی اپنی جگہ پر جم

سی گئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہونے سے قبل ہی میز پوش تبدیل کر دیئے گئے اور میزوں پر تر و تازہ پھولوں کے گلدانوں کے ساتھ ہی ایسے گلاس بھی رکھے گئے جن میں نیپکن اڑسے ہوئے تھے۔ اس بیوقوف نوجوان نے اپنی کرسی پیچھے کھسکالی تھی اور ایک ویٹر اس کی میز بھی درست کر رہا تھا۔ ویٹر کے ہٹتے ہی وہ ایک گلاب کا پھول گلدان سے نکال کر سونگھنے لگا۔ وہ خیالات میں کھویا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی اپنے گرد و پیش نظر ڈالنے کی زحمت نہیں گوارہ کی تھی شائد وہ وہاں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

روشی اسے دیکھتی رہی اور اب وہ نہ جانے کیوں اس میں خاص قسم کی کشش محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے کئی بار وہاں سے اٹھنا بھی چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ اور اس نوجوان نے کھانے کا آرڈر دیا۔ پھول ابھی تک اس کی چٹکی میں دبا ہوا تھا جسے وہ کبھی سونگھنے لگتا اور کبھی آنکھیں بند کر کے اس طرح اس سے گال سہلانے لگتا جیسے ضرورتاً ایسا کر رہا ہو۔

کھانا میز پر چن دیا گیا لیکن وہ بدستور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ اب بھی کچھ سوچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ویٹر کے آنے اور کھانے کی موجودگی کا اسے علم ہی نہ ہو۔ روشی اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ وہ گلاب کا پھول شوربے میں ڈبو رہا ہے اور پھر وہ اسے چبا بھی گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس نے اتنا برا سا منہ بنایا کہ روشی کو بیساختہ ہنسی آ گئی۔ اس کے منہ سے کچلے ہوئے پھول کے ٹکڑے پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔

''بوائے۔'' اس نے رو دینے کے سے انداز میں ویٹر کو آواز دی اور کئی لوگ چونک کر اسے گھورنے لگے۔ ڈائننگ ہال اب کافی آباد ہو چکا تھا۔ شائد پانچ میزیں خالی ہوں گی۔

''سب چوپٹ۔'' اس نے ویٹر سے گلوگیر آواز سے کہا۔ ''سب لے جاؤ...... بل لاؤ۔'' نوجوان نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

''بل لاؤ''

ویٹر برتن سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ لیکن اسے واپس آنے میں دیر نہیں لگی۔ نوجوان نے طشتری میں رکھے ہوئے پرچے پر نظر ڈالی اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جیبوں سے نوٹوں کی کئی گڈیاں نکل آئیں۔ جنہیں وہ میز پر ڈالتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اب وہ اپنی اندرونی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ آخر اس نے ایک کھلی ہوئی گڈی نکالی اور اس میں سے سو کا ایک نوٹ کھینچ کر طشتری میں رکھ دیا۔ روشی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اور نوجوان بڑی لاپرواہی سے میز پر پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈیوں کو کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس رہا تھا۔ روشی نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اس نے دیکھا کہ ڈائننگ ہال کے سارے لوگ اس بری طرح گھور رہے ہیں اسے وہاں کچھ برے لوگ بھی دکھائی دیئے جو للچائی ہوئی۔

سنگ ہی سے عمران کی پہلی ملاقات

عمران کی ٹیکسی مورگیٹ اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ اور پولیس کے سامنے سے گزرتی ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئی پی چنگ یہیں رہتا تھا۔ عمران نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا اور عمارت کے برآمدے میں پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبانے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے انگریز بٹلر کا سر دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے!'' اس نے عمران کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھا۔
''مسٹر پی چنگ سے ملنا ہے۔''
''نہیں پیکنگ سے کوئی خط نہیں آیا'' بٹلر نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''یہ ڈاک خانہ نہیں ہے۔''

قبل اس کے کہ عمران کچھ کہتا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ تقریباً دو تین منٹ بعد اس نے پھر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اس بار دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ لیکن جس نے دروازہ کھولا تھا وہ کوئی انگریز نہیں تھا۔ عمران نے اسے بہت غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ ایک دراز قد اور دبلا پتلا چینی تھا اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت انگیز طور پر چمکیلی تھیں۔ عمران نے اتنے لمبے قد کا کوئی چینی آج تک نہیں دیکھا تھا اس کی ناک چپٹی ضرور تھی لیکن پھر بھی وہ خالص چینی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

''فرمایئے اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں جانتا ہوں عمران نے جرمنوں کے انداز میں انگریزی بولنے کی کوشش کی میں جانتا ہوں کہ یہ ڈاک خانہ نہیں ہے اور نہ میں نے یہی پوچھا تھا کہ پیکنگ سے کوئی خط آیا ہے؟

''میں نہیں سمجھا جناب کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔''

''ہم...... ہم وہ ابھی ایک بٹلر آیا تھا میں نے اس سے کہا کہ میں مسٹر پی چنگ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن اس نے جواب دیا کہ پیکنگ سے کوئی خط نہیں آیا۔ یہ ڈاک خانہ نہیں ہے۔''

''اوہ...... وہ!'' دراز قد چینی ہنسنے لگا۔

''وہ دراصل بہرہ ہے لیکن آپ مسٹر پی چنگ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔''

''میں برلن سے آیا ہوں۔ اور میرے پاس ان کے لیے ایک خط ہے۔''

''اوہ مگر مسٹر پی چنگ اس وقت بہت اداس ہیں کیونکہ ان کا طوطا مر گیا ہے مگر خیر آپ آیئے میں کوشش کروں گا کہ وہ اس وقت آپ سے ملنے پر رضا مند ہو جائیں۔ آپ کا کارڈ۔''

''میرا نام فوئر باخ ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اوہو آپ فلسفی فوئر باخ کے خاندان سے تو نہیں۔''

''میرے خاندان میں ہر قسم کے فوئر باخ گزرے ہیں موچی سے لے کر فلسفی تک تم اس کی پرواہ مت کرو۔

''خوب۔'' دراز قد چینی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا اور پھر ایک طرف ہٹتا ہوا بولا۔

''آیئے۔''

وہ عمران کو ساتھ لیے ہوئے ایک ایسے کمرے میں آیا جو غالباً نشست کے لیے تھا اور بہترین قسم کے آرائشی فرنیچر سے مزین تھا۔ وہ اسے وہاں بیٹھا کر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک پستہ قد اور گول مٹول سے چینی کے ساتھ واپس آیا۔ وہ اتنا موٹا تھا کہ اسے چلنے میں بھی سائد دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جب وہ بولا تو عمران بمشکل تمام اپنی ہنسی روک سکا کیونکہ اس کی آواز سیٹی سے مشابہ تھی بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ہاتھی میاؤں میاؤں کر رہا ہو۔

''کس کا خط لائے ہیں آپ مسٹر۔'' اس نے اور پھر کچھ اس طرح پلٹ کر دراز قد چینی پر اپنے دونوں

ہاتھ چلائے جیسے اس نے کی پشست پر چٹکی لی ہو۔ دراز قد چینی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور پی چنگ نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

''حرام زادے۔''

پھر عمران سے بولا۔''ہاں مسٹر جلدی آپ کس کا خط لائے ہیں۔''

''خط۔''عمران حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

''کس کا خط کیسا خط کہیں میں کسی پاگل خانے میں تو نہیں آ گیا! پہلے آپ کے بٹلر نے کہا کہ پیکنگ سے کوئی خط نہیں آیا حالانکہ میں نے کہا تھا کہ مسٹر پی چنگ سے ملنا چاہتا ہوں اب آپ بھی کسی خط کا تذکرہ کر رہے ہیں۔''

دراز قد چینی عمران کو بہت غور سے دیکھنے لگا پھر مسکرا کر انگریزی میں بولا۔

''اوہو یہ شائد تمہارے ساتھ پنگ پانگ کھیلنے آئے ہیں۔''

''جی نہیں۔''عمران سر ہلا کر بولا۔

''میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔''

''کیا مطلب!''پی چنگ اچھل پڑا پھر خوف زدہ آواز میں بولا۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''اچانک پھر اس نے پلٹ کر دراز قد چینی پر دو ہتھڑ چلایا اور بالکل پہلے ہی کے انداز میں بولا۔

''حرامزادے۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا۔''عمران نے کہا۔

''زندگی کا کوئی اعتبار نہیں پتہ نہیں کب آپ کو بھی مکلارنس پکڑ لے جائے۔''

پی چنگ نے مکلارنس کی ماں سے اپنے ناجائز رشتے کا اعلان کیا۔

''آپ کی پارٹنر کیلی پیٹرسن۔''

لیکن پی چنگ نے اپنے جملہ نہیں پورا کر نا دیا کیونکہ اس بار اس کی سیٹی جیسی آواز کیلی کی ماں سے بھی اسی رشتے کا اعلان کر رہی تھی۔ پھر وہ عمران پر برس پڑا۔

''تم مجھے دھمکانے آئے ہو میں کسی مکلارنس وکلارنس سے نہیں ڈرتا چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں پولیس کو فون کر دوں گا۔''

''آپ غلط سمجھے!''عمران نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

''میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیا ہے یا نہیں اگر نہ کرایا ہو تو میں اپنی کمپنی کی خدمات پیش کروں۔''اس پر کمپنی کی ماں کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے کیلی اور مکلارنس کی ماؤں کا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پی چنگ سارے لندن کی ماؤں پر احسان کرتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

''آپ ہی اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیجئے۔''عمران نے مسمی صورت بنا کر دراز قد چینی سے کہا۔

''ضرور ضرور۔''وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور عمران کے قریب آ کر آہستہ سے بولا۔

''اتنی دیر میں سارے دروازے مقفل ہو چکے ہوں گے تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔''

''اوہو بہت بہت شکریہ۔'' عمران نے شرمیلی ہنسی کے ساتھ کہا۔
''میں بہت تھک گیا ہوں شاید آپ مجھے شام تک یہاں آرام کرنے کیا جازت دے دیں گے۔''
''تمہارا تعلق کس کمپنی سے ہے ویسے تم مجھے جرمن نہیں معلوم ہوتے۔''
''میرا تعلق نیو لائف انشورنس کمپنی سے ہے اور میں جرمن نہیں ہوں۔''
''پھر کون ہو؟''
''میں دراوڑ ہوں۔''
''تم مجھ سے نہیں اڑ سکتے سمجھے۔'' دراز قد چینی نے اردو میں کہا۔
''میں جانتا ہوں کہ تم کس قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہو۔''
''عمران کو اس پر سخت حیرت ہوئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے نہیں ظاہر ہونے دیا اور برجستہ بولا۔
''میں چینی زبان نہیں سمجھ سکتا۔''
''تمہاری اپنی زبان کیا ہے۔''
عمران نے اپنی پوری زبان منہ سے نکال کر اسے دکھائی اور دراز قد چینی جھنجھلا گیا۔
''اگر تمہیں مکلارنس نے بھیجا ہے تو میں تمہیں چلا جانے دوں گا مگر یہ جان بخشی ایک کام کے صلے میں ہوگی۔''
''آپ مجھے اپنی عمر بتایئے تا کہ میں آپ کو کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔'' عمران نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔
''مکلارنس سے کہہ دینا اس طرف آنکھ اٹھانے کی بھی جرات نہ کرے ورنہ اس کا سارا بھرم خاک میں مل جائے گا۔ بلکہ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ پی چنگ کی پشت پر کوئی برساتی مینڈک نہیں بلکہ سنگ ہی ہے۔''
''ہائیں کیا کہا! پی چنگ برساتی مینڈک ہے۔'' عمران نے حیرت ظاہر کی ویسے اسے اس پر حیرت تھی کہ یہی مچھر سا آدمی سنگ ہی ہے اس نے سنگ ہی کا نام بہت زیادہ سنا تھا اور لندن ہی کے دوران قیام میں سرخ چین کے ریڈیو سے اس نے بھی سنا تھا کہ سنگ ہی نے سرخ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی اور اپنے مقصد میں ناکام رہنے پر وہاں سے بھاگ نکلا تھا اس کے ملک بدر کر دیئے جانے کی خبر تو محض سرکاری رسمیات میں سے تھی اس پر قانون کا ہاتھ پڑ ہی نہیں سکا تھا۔
''تم ضرورت سے زیادہ عقل مند معلوم ہوتے ہو۔ سنگ ہی اسے گھورتا ہوا بولا۔
''لیکن اتنی کم عمری میں تمہیں اتنا دلیر نہ ہونا چاہئے سمجھے۔ سنگ کی نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا ویسے مجھے افسوس ہے کہ تم مکلارنس جیسے گھریلو چوہے کے لیے کام کر رہے ہو۔
''چچا سنگ! مجھے خود افسوس ہے مگر میں مجبور ہوں۔'' عمران نے دردناک لہجے میں کہا۔
''کیا مجبوری ہے۔''
''میری محبوبہ پکڑ والی ہے اس نے۔''
''کوئی بکری تھی۔'' سنگ ہی مسکرا کر بولا۔
''پکڑ والی ہے کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے۔''

"کودتمہاری محبوبہ ہوگی بکری۔" عمران بگڑ گیا۔
"ذرا زبان سنبھال کر ورنہ میں بہت خراب آدمی ہوں۔
سنگ ہی اس طرح ہنسا جیسے کسی ننھے سے بچے کے لاف وگزاف پر ہنس پڑا ہو۔ پھر دفعتاً سنجیدہ ہوکر ہمدردانہ لہجے میں بولا۔
"اوہ تم نہیں سمجھے میرا مطلب کیا وہ کوئی بے سہارا لڑکی تھی۔"
"نہیں دیوار کے سہارے کھڑی تھی بس اچانک اس کے آدمی اس پر ٹوٹ پڑے اور پکڑ لے گئے بقول کنفیوشس۔"
"شش....." سنگ برا سامنہ بنا کر بولا۔ یہ نفرت انگیز نام آئندہ میرے سامنے نہ لینا۔
ہاں تو پھر کیا ہوا۔"
پھر یہ ہوا کہ میری مٹی پلید ہورہی ہے۔ عمران رودینے کے سے انداز میں بولا آپ مجھے مکلارنس کی طرف سے دھمکیاں ملتی ہیں کہ اگر میں اس کا کام نہیں کروں گا تو وہ میری محبوبہ کو مار ڈالے گا۔

جولیا سے عمران کی پہلی ملاقات

ادا علی (دھلی بھارت)

جولیا نافٹز واٹران دو آدمیوں کے ساتھ دانش منزل میں داخل ہوئی اس نے ابھی تک سب کچھ ایکس ٹو کی مرضی کے مطابق ہی کیا تھا وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی کہ ابھی تک ایکس ٹو کی پیشن گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی تھیں۔ جولیاں نے بھی اداکاری کی حد کردی ہوگی ورنہ وہ دونوں اس کے ساتھ دانش منزل تک کیوں آتے۔ جولیا نے اپنی زندگی میں پہلی بار دانش منزل کی کمپاؤنڈ میں قدم رکھا تھا۔ ویسے وہ جانتی ضرور تھی کہ وہ عمارت محکمے ہی کے کاموں کے لیے وقف ہے۔
جیسے ہی وہ پورچ میں داخل ہوئے اندر سے ایک بیرا باہر آیا جس کی وردی بڑی شفاف تھی۔ پتہ نہیں وہ کون تھا۔ جولیا نے اسے پہل پہل دیکھا تھا البتہ وہ صورت ہی سے بالکل احمق معلوم ہورہا تھا۔ کیپٹن جعفری سے کہہ دو کہ جولیا ہے۔ جولیا آگے بڑھ کر بولی۔ بیر خاموش پلکیں جھپکا تا رہا۔
"کیا تم بہرے ہو۔" جولیا نے جھنجھلائے ہوئے سے انداز میں پوچھا۔
"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بیرے نے احمقوں کی طرح اپنے کان جھارتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں مردوں سے پوچھا۔ "آپ حضرات کیا چاہتے ہیں۔"
"یہ میرے ساتھ ہیں تم فضول بکواس کیوں کررہے ہو۔" جولیا بولی۔
"اگر یہ آپ کے ساتھ ہیں تب صاحب آپ سے مل بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی مل سکتے۔" بیرا بولا۔
"کیا بک رہے ہو۔"
"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میم صاحب۔ صاحب کا حکم ہے مردوں سے کہہ دو صاحب نہیں ہیں۔ عورتوں کو آنے دو۔"
پھر اچانک وہ اس طرح اپنا منہ دبا دبا کر گال پر تھپڑ مارنے لگا جیسے یہ بات بے خیالی میں اس کے منہ سے

نکل گئی اور اب اسے نہ صرف اس پر افسوس ہو بلکہ اپنی حماقت پر غصہ بھی آ رہا ہو۔ دونوں مرد ہنسنے لگے اور جولیا اسے ایک طرف دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی دونوں مرد بھی آگے بڑھے مگر بیرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں جناب! آپ یہیں انتظار کریں گے۔"

"الگ ہٹو۔"

دونوں نے دونوں طرف سے اسے گھونسے رسید کئے اور خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

"اسے یہیں روکے رکھیے!" جولیا نے پلٹ کر ان دونوں سے کہا اور اندر چلی گئی۔ وہ اس احمق بیرے کو ڈرائنگ روم میں کھینچ لائے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "تم دروازے بند کر دو۔"

بیرا چپ چاپ کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ دوسری طرف جولیا بڑی تیزی سے اندر پہنچی اور عمارت کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔

باہر گہری تاریکی تھی اور کمپاؤنڈ سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس وقت اسے اندھیرے میں چاروں طرف ایکس ٹو کا جلوہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج ایکس ٹو کا دیدار ہی کر لیا جائے۔ پھر وہ اس احمق بیرے کے متعلق سوچنے لگی۔ بڑا خوب صورت اور پیارا سا جوان تھا۔ یقیناً وہ بیرا نہ رہا ہوگا۔ حالانکہ اس کے چہرے پر حماقت برس رہی تھی مگر پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا ایسا آدمی جو بیرا بننا کبھی پسند نہیں کر سکتا۔

کیا وہی ایکس ٹو تھا؟ مگر یہ خیال جولیا کو فضول معلوم ہوا۔ وہ ایکس ٹو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذہن میں ایکس ٹو کا تصور بڑا بھیانک تھا۔ وہ سوچنے لگی اس وقت ایکس ٹو یقینی طور پر یہاں موجود ہے وہ عمارت کی پشت سے پھر پائیں باغ میں آ گئی۔ پورچ کی روشنی گل ہو چکی تھی اور اب کوئی کھڑکی بھی روشن نہیں نظر آ رہی تھی۔

❀......❀......❀......❀......❀......❀

بوغا' مسکلارنس' ایڈلاوا' کیلی گراہم' تاریک وادی' تین ناگنیں' طاقت اور دیگر تنظیمیں' تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا' تھری بی' علامہ دہشت ناک ہر ناول کے بیک پیج پر ابن صفی صاحب کی تصویر کا سلسلہ' پیشرس پیش لفظ میں قارئین کے خطوط کے جوابات ڈاکٹر دعا گو۔

مندرجہ بالا کردار مقامات و تنظیموں وغیرہ کی علاوہ ابن صفی صاحب کے ناولوں کی اہم باتوں کو ایک صفحے میں سمیٹنا ناممکن ہے مگر چند باتیں ملاحظہ فرمائیں سلامی اور دیگر اقوال' فریدی و عمران کی حیرت انگیز شخصیت' ہارڈ اسٹون' ایکسٹو' زی ٹو' سیکرٹ سروس بننا' عمران کی ریڈی میٹ کھوپڑی' ٹیکنی کلر لباس' مر کے بل کھڑا ہونا' اماں بی کی جوتیاں کھانا' جولیا کو تنگ کرنا' تنویر کا حسد' مونگ کی دال کا مزاج' حمید و قاسم کی قلفلوٹیاں' یلا یلیاں فریدی وایکسٹو سے مجرموں کا خوف کھانا' عمران فریدی حمید کے مقابل دنیا کے انتہائی خطرناک ترین پھرتیلے مجرم' جدید سائنس' میڈیکل' مشینری دنیا کے اعلیٰ سائنسدان سائنسی لیبارٹریز' کوڈ ورڈز گفتگو وائرلیس نظام خلائی سیارے سٹیلائیٹ اسٹیشن ٹرانسمیٹر گفتگو ہیکنگ' جدید ٹرانسمیٹر' جدید ہولوگرام' میزائل وربوٹ ٹیکنالوجی' لیزر شعاعیں سائنسی ہتھیار فارمولاز' اڑن طشتریاں' موبائل آئیڈینٹی کاسٹ' کیچ پینل' مصنوعی آندھیاں دھند' ایٹم ہائیڈروجن دیگر خطرناک بم خلا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل سیاروں کی تباہی پرندوں جانوروں میں کیمرے واٹرانسمیٹر' خطرناک ترین زہر' سیرم' جراثیم سمندری' سائنسی' جنگلی مہمات' مختلف ممالک' علاقوں کا خوفناک سفر' ایکشن ایڈونچر' جاسوسی' ذہنی جنگ دنیا کے سیکرٹ ایجنٹس طنز و مزاح نفسیات اندرون ملک بیرون ملک کسی جگہ ہوٹل وغیرہ میں یا مجرموں کے اڈوں قمار خانوں کلبوں وغیرہ میں فریدی عمران صفدر وغیرہ کو جانا پڑے تو کیسے جاتے ہیں۔ قانون کا احترام فریدی [illegible] جاذب مرکزی کرداروں کی آپس میں محبت جذبات [illegible] کے ساتھ فریدی عمران کا حمید معاملات [illegible] کے اختیارات مختلف ممالک کے ٹاپ سیکرٹ ایجنٹس جاسوسوں سے فریدی و عمران کے تعلقات وغیرہ۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

ابن صفی ادب کی دنیا کا روشن ستارہ

ریحانہ اعجاز

ابنِ صفی ادب کی دنیا کا ایک بہت بڑا اور معتبر نام، جن کی عمران سیریز آج بھی بہترین کہانیاں پڑھنے والوں کے دل پر راج کرتی ہیں، "حمیدی فریدی" جیسے لازوال کریکٹر کے خالق ابنِ صفی کا اصلی نام "اسرار احمد" تھا، ابنِ صفی 26 جولائی 1928 کو الٰہ آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے،

ابنِ صفی نہ صرف ایک اچھے ناول نگار تھے بلکہ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے، بلکہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی شاعری سے کیا، اسرار ناروی کے نام سے مشہور تھے، وہ اپنے ماموں "نوح ناروی" سے اصلاح لیا کرتے تھے، انہوں نے اپنی نظموں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر کسی اور نے قلم نہیں اٹھایا، اللہ نہ روکو جانے دو، مرگھٹ کا پیپل، بانسری کی آواز، سنگتراش نے کہا، خوف کا میخانہ وغیرہ، ان کی نظموں کے موضوعات تھے،

راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں

چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
تنہائی سی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں
چشم ولب ورخسار کی تہ میں روحوں کے ویرانے ہیں

،افسانے اور طنز ومزاح میں بھی ان کو ایک مقام حاصل تھا،

ابنِ صفی درس وتدریس کے شعبے سے بھی وابستہ رہے، 1955 میں ابنِ صفی نے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا جس میں عمران جیسا آفاقی کردار مقبولِ عام ہوتا چلا گیا،

انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمیدی کا کردار تخلیق کرنے کے پیچھے جن عوامل کا ہاتھ تھا اس میں سب سے مشہور یہ بھی کہ ابنِ صفی کے دوست اس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ سوائے فحاشی کے کوئی ادب کامیاب نہیں ہوسکتا، اور فحش نگاری ہی مقبول ہوسکتی ہے، جبکہ ابنِ صفی مرحوم کو اس سے سخت اختلاف تھا، اسی لیے انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ ایک دم صاف ستھرا ادب تخلیق کرنا ہے اور پھر اس طرح ابنِ صفی نے 1952 میں حمیدی، فریدی سیریز لکھنا شروع کی جو جلد ہی لاکھوں دلوں پر راج کرنے لگی. 1957 میں ابنِ صفی نے "اسرار پبلیکیشنز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت جاسوسی دنیا کے ناولز ادب کی دنیا میں شہرہ آفاق بن کر جگمگانے لگے. ابنِ صفی کے مقبول عام ناولز میں ایک دلچسپ بات یہ بھی کہ انہوں نے کل آٹھ ناولز کے مرکزی خیال کسی سے مستعار لیے تھے جبکہ بقایا تقریباً 245 ناولز ان کے اپنے تھے، ابنِ صفی کے ناولز بھارت میں بھی بہت مقبول تھے جو کہ نکہت پبلیکیشنز کے تحت بھارت میں ابنِ صفی کے خاص الخاص دوست عباس حسینی کی نگرانی میں پبلش کیے جاتے تھے، ابنِ صفی اپنے اس دوست سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔

ابنِ صفی بلاشبہ سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار تھے، ایک بے انتہا مقبولِ عام جاسوسی ناولز کے خالق کے کرداروں کی سب سے بڑی خوبصورت یہ بھی کہ ابنِ صفی کے کرداروں نے چاہے وہ "عمران" ہو یا "حمیدی" "فریدی" کبھی عورت کی طرف ہوس زدہ نظروں سے نہیں دیکھا اور ایک شفاف ادب تخلیق ہوتا گیا جس کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے ابنِ صفی کو صاف ستھرا ادب تخلیق کرنے پر کچھ اس طرح خراج تحسین پیش کیا کہ " میں نے کبھی ابن صفی کے ناولوں کو کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے انٹلکچوئل اسے ایک سب اسٹینڈرڈ مواد گردانتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ابن صفی کے تخلیقی ذہن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ابن صفی کے ناول کیوں پڑھتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں، کیونکہ ابن صفی ہمارے کئی ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتے ہیں۔" جب محمد حسن عسکری نے یہ شکایت کی کہ اردو نثر کا فن زوال پذیر ہے اور کوئی اچھی زبان نہیں لکھ رہا ہے تو میں نے انہیں ابنِ صفی کی جاسوسی دنیا کا ایک ناول پڑھنے کو دیا۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ پوچھتے تھے " کشفی صاحب، ابن صفی کا نیا ناول آگیا؟"

اور آج 64 سال بعد بھی اس دور کے لکھے گئے ناول جب آج کا قاری بھی پڑھتا ہے تو وہ جاسوسی دنیا میں کھو سا جاتا ہے، عمران سیریز کے مقبولِ عام سلسلے کو کئی مصنفین نے آگے بڑھایا، لیکن جو کردار ابنِ صفی تخلیق کر گئے وہ آج بھی ان کی پہچان ہے، ابنِ صفی کی صحت خراب رہنے لگی وہ "انفصام" نامی بیماری کا

شکار ہوئے تو انہیں کافی عرصہ علاج معالجے کی وجہ سے اپنی تخلیقی سرگرمیاں وقتی طور پر موقوف کرنا پڑیں، دو تین سال کے مسلسل علاج کے بعد ابنِ صفی کی دوبارہ سے ادبی دنیا میں عمران سیریز کے ایک ناول "ڈیڑھ متوالے" کے ساتھ واپسی ہوئی، لیکن چند سال بعد ہی انہیں درد کا پہلا شدید اٹیک ہوا جس کے بعد صحت مسلسل گرتی گئی، بیماری میں شدت آتی گئی، بے شمار ٹیسٹوں اور طویل معائنے کے بعد ڈاکٹرز نے آخر کار یہ روح فرسا اعلان کر دیا کہ ابنِ صفی "سرطان" جیسی موذی بیماری کا شکار ہو چکے ہیں، ابن صفی تقریباً دس ماہ اس موذی بیماری سے لڑتے رہنے کے بعد ایک رات شدید بخار چڑھنے کی وجہ سے مسلسل دو دن بے حال رہے اور اسی بخار میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، یوں 26 جولائی، 1980ء کو (یعنی اپنی سالگرہ کے ہی دن) وہ اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ مشتاق احمد قریشی نے لحد میں اتارا۔ تدفین قبرستان پاپوش نگر میں ہوئی۔ یوں ادب کا روشن ستارہ مٹی کے حوالے کر دیا گیا، ادب کے اس نامور شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار کی تصنیفات پر بعد میں بہت سا کام کیا گیا، ان کے کام کو کئی ایک مصنفین نے آگے بھی بڑھایا، تبصرے بھی کیے گئے، لیکن افسوس ابنِ صفی کی زندگی میں ان کی وہ قدر نہ کی گئی جس کے وہ مستحق تھے، کاش ہماری قوم زندہ ہوتی تو ایسے افراد اپنی زندگی ہی میں پذیرائی حاصل کر لیتے۔ اور انہیں اگر کوئی انعام نہ بھی ملتا مگر ایک طمانیت کے احساس کے ساتھ تو رخصت ہوتے۔

خراج تحسین ابن صفی

عمارہ خان

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار!!
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

ابن صفی کیا ہی خوبصورت نام ہے، جس کے ساتھ نصف صدی کے لوگوں کی حسین ترین یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر انیس سو ساٹھ سے لے انیس سو نوے کی دہائی کے لوگوں کی اس زمانے کے بچے اور نوخیز لڑکے لڑکیوں کی زندگی کا اہم ترین حصہ ابن صفی کی کتابوں پر مشتمل تھا، یہ الگ بات ہے کہ بڑھتی عمر کے لوگ بھی ان کے قلم سے نکلے ہوئے سحر انگیز الفاظ کے نشے کی حد تک عادی تھے لیکن ماننے سے عار تھا، بظاہر ابن صفی کی جاسوسی دنیا، ایک ایڈونچر، رومانوی، مزاح اور سسپنس کہانیوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن اس میں ایک جہاں آباد رہا ہے۔ جس کے پڑھنے والے بھی لاتعداد رہے۔ انہی پڑھنے والے لوگوں میں مجھ جیسے دیوانے بھی شامل ہیں جو جوٹارزن اور عمرو عیار کی کہانیوں کے بعد سیدھا ابن صفی تک جا پہنچے اور آج تک نہایت سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں کہ علی عمران زیادہ بہتر تھا یا احمد کمال فریدی

ہماری زندگی کی پہلی نوخیز محبت جاسوسی دنیا ٹھہر گئی تھی۔

ابن صفی ہمیشہ بولتے تھے میری کتابیں لوگوں کے سرہانے تکیوں کے نیچے ملیں گی نا کہ الماریوں میں اور آج الحمدللہ میرے خاندان کی تیسری نسل اسی ذوق شوق سے عمران کو پڑھتی نظر آتی ہے۔ ان کی مکمل صلاحیتوں کا احاطہ کم از کم مجھ جیسی کم عقل انسان کے بس کی چیز نہیں، جس کے لکھنے کا فن ابھی پنگوڑے میں ہچکولے رہا ہے، لیکن یہ بات سولہ آنے سچ ہے کہ صاحب تحریر نے ابن صفی کی کتابوں کو پڑھ کے اردو سیکھی ہے،

کیسے جاسوسی کہانیوں میں مزاح کا تڑکا لگانا ہے، کیسے مہذب انداز میں اپنی بات بیان کرنی ہے کہ بڑوں کے ساتھ بچے بھی با آسانی آپ کو پڑھ سکیں بلکہ کھلے عام بنا چھپائے آپ کی کتابیں پڑھ سکیں، یہ بھی جاننا ہے کہ لکھتے ہوئے احتیاط لازم ہے، ورنہ کہیں آپ کے لکھے ہوئے الفاظ آپ کے لیے ہی باعث شرم نا بن جائیں
آج ان کو خراج تحسین دینے کا وقت آیا تو، نوے کی دہائی والی، چھوٹی سی ساتویں کلاس کی قاری عمارہ نے، آج کی لکھاری عمارہ خان کو یاد دلایا، اب تمہارے قلم کا فرض ہے اس بندے کو یاد کرنا جس کی بدولت آج کچھ لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ اس ٹوٹی پھوٹی تحریر میں کچھ دل کی باتیں، کچھ بچپن کی یادیں، کچھ جوانی کے ان کہے اعتراف اور ایک قیمتی شخص (میرے ابو) کا شکریہ ادا کرنے کی ادنی سی کوشش، جنہوں نے ابن صفی جیسے مہذب لکھاری سے تعارف کرایا ان کی کتابیں پڑھ کے معلوم ہوا، اگر جنسی مواد نا بھی ہو تو شاہکار کیسے وجود میں لایا جاسکتا ہے، صاف ستھرا مزاح مرد اور عورت کے جسمانی خدوخال کا مذاق اڑائے بغیر بھی ہوسکتا ہے، قتل وغارت کے بناء بھی جاسوسی کہانیاں تخلیق ہوسکتی ہیں۔ پہاڑوں سے چھلانگ لگائے یا سو دو سو گولیوں کو کھائے بغیر بھی ایڈونچر لکھا جاسکتا ہے، مختصر یہ ہے کہ، ایک ادنی سی کاوش، ابن صفی جیسے استاد کے لیے پیش خدمت ہے۔

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا جبکہ ابن صفی، طغرل فرغان، اسرار ناروی، سنکی سولجر تخلص کے ساتھ قلمی نام بھی رہے۔ شاعری کی اور بڑی نفیس کی اسی کے ساتھ نفسیات پر ایک کتاب بھی لکھنا شروع کی تھی لیکن اپنی بیماری کے باعث وہ پوری نا کر سکے اور ادھوری رہ گئی۔

ابن صفی، یہ وہ نام ہے جو رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں میں نقش رہے گا، جب تک ایک بھی انسان علی عمران کے ساتھ احمد کمال فریدی کو یاد رکھے گا۔ جی ہاں یہ وہ دو لازوال کردار ہیں جنہوں نے ایک وقت نا صرف پاکستان بلکہ انڈیا میں بھی دھوم مچا رکھی تھی، ان کی ہر کتاب بلیک ہوتی تھی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی، منہ مانگے داموں لوگ کتابیں لینے کو تیار رہتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے ابن صفی 1970ء میں پاکستانی انٹیلیجنس ایجنسی انٹر سروسز انٹیلیجنس (ISI) کو جاسوسی کے حوالے سے لیکچر بھی دیتے رہے ہیں۔

بات کی جائے ان کے تخلیق کردہ زندہ جاوید کرداروں کی جوان کے گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر نقش ہے تو سورج کو روشنی دکھانے والی بات ہوگی۔ ایک دنیا گواہ ہے ابن صفی نے مجھ سمیت بہت سے لوگوں کو نا صرف لکھنا سکھا دیا بلکہ ان کو بہترین انداز سے پیش کرنے کے طریقے بھی بتائے

1951ء کے اواخر میں بے تکلف دوستوں کی محفل میں کسی نے کہا تھا کہ اردو میں صرف فحش نگاری ہی مقبولیت حاصل کرسکتی ہے۔ ابن صفی نے اس بات سے اختلاف کیا اور کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے فحش نگاری کے اس سیلاب کو اپنی تحریر کے ذریعے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے، اس پر دوستوں کا موقف تھا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا، لوگ یہی کچھ پڑھتے رہیں گے، اور یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب ابن صفی نے ایسا ادب تخلیق کرنے کی ٹھانی جو بہت جلد لاکھوں پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ عباس حسینی کے مشورے سے اس کا نام جاسوسی دنیا قرار پایا اور اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا بلکہ تاریخ رقم کردی

اگست 1955ء میں ابن صفی نے خوفناک عمارت کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا اور

عمران کے کردار کو راتوں رات مقبولیت حاصل ہوگئی۔علی عمران ایم ایس سی، ڈی ایس سی (آکسن)۔ایک ایسا خوبصورت جوان، دل کش محب وطن ہیرو جو خود کو احمقوں کا سردار کہتے نہیں جھجکتا، جس کے اپنے اسٹاف ممبر ہی اسے بے عزت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہوں اور وہ بنا کسی پروٹوکول کے، بنا کسی شرم کے اپنی ماں کی چپل سر پر رکھ کے نظریں جھکا لے یہ سب ابن صفی کی اپنی تربیت بھی دکھائی تھے، بہن سے شرارت، ماں سے محبت اور باپ کا احترام، ملک سے وفاداری، دوستوں کا مان سلامت رکھنا۔ بھرپور اور مکمل ہیرو۔

ذہن میں رہے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہر جگہ ماچومین قسم کے ہیرو چھائے ہوئے تھے، سستا رومانس اپنے عروج پہ تھا، ایسے وقت اس طرح کا ناول مارکیٹ میں لانا جس کا ہیرو نا تو لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا ہو اور نا ہی وہ کھلے عام شراب پیتا ہو، ایک عجیب فیصلہ تھا، ناول میں نا تو طوائفوں کی بھرمار تھی اور نا ہی اس میں جنسی مواد شامل تھا، اس کے برعکس کہانی کا ہیرو مخصوص حماقت کے تاثرات سجائے، ٹیکنیکلی کلر کے ملبوسات پہنے اعلیٰ تقریبات میں جا پہنچے اور مشکل سے مشکل کیس کو با آسانی حل کر کے شہر کی پولیس کے حوالے کر کے چلتا بنے، اس وقت کے ماہرین کی رائے میں سراسر گھاٹے کا کاروبار تھا۔ کہانی کے ہیرو کا اپنا باپ ہی اسے کسی قابل نہیں سمجھتا تھا تو لوگ کیسے اسے سر آنکھوں پہ بٹھا سکتے تھے لیکن...... لیکن، علی عمران ایم ایس سی، پی ایچ ڈی آکسن، راتوں رات لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں کیونکر چھا گیا، اس کا جواب اکیسویں صدی میں بھی کسی کو سمجھ نہیں آ سکا۔

ابن صفی کے تخلیق کردہ کردار اس قدر مضبوط تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خود اپنے ہی لکھے ہوئے کرداروں کی دنیا میں تین سال تک کھو گئے۔(۱۹۶۰-۱۹۶۳)۔۔وہ ایک ایسی بیماری کا شکار ہو گئے تھے، جس کا مریض حقیقی اور خیالی دنیا میں تفریق نہیں کر پاتا، اس مریض کا منطقی انداز میں سوچ بچار اور تجزیہ کرنا ختم ہو جاتا ہے، مختصر یہ کہ اس بندے کی اپنی اندر کی دنیا باہر کی دنیا پہ حاوی ہو جاتی ہے اب ہم قاری اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کردار جس کی ایک دنیا عاشق ہے اس کا اپنا تخلیق کردہ ماسٹر ہی اس کا گرفتار ہو جائے تو کیا کہنے

ابن صفی کے تین سالہ بیماری کے مشکل اور تکلیف دہ دور میں بہت سے ایسے لوگوں کی چاندی ہو گئی تھی جنہوں نے اپنے اپنے ناموں کے آگے، صفی، لکھ کے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا شروع کر دیا تھا۔ کسی نے علی عمران کو ایک بھانڈ بنا دیا تو کسی نے فریدی کو کوٹھے تک پہنچا دیا۔ کسی نے اپنی ہی بنائی ہوئی فورس عمران کے ساتھ نتھی کر دی تو کسی نے عمران کے خاندانی ملازم کو ادھیڑ عمر بنا ڈالا۔ ابن صفی کی جدائی میں لوگوں نے ان دھوکا بازوں اور گھٹیا کہانیوں کو بھی ویلکم کہا لیکن اصلی ابن صفی نے اپنی واپسی کا شاندار دھماکا کیا، ڈیڑھ متوالے سے اور اسی کے ساتھ وہ تمام لوگ جو عمران کی مٹی پلید کر رہے تھے ان کو منہ کی کھانی پڑی، ان لوگوں میں کچھ ایسے کم ظرف بھی شامل ہیں، جنہوں نے اپنی ساری زندگی ابن صفی کے کرداروں کو لکھ کے روزی روٹی کمائی، شہرت حاصل کی لیکن ایک لفظ کا کریڈٹ بھی اصلی مالک کو نا دیا، کچھ لوگوں نے عدالتی سمن کے بعد بھی توبہ نا کی اور جعلی۔صفی۔بن کے کماتے رہے۔۔ابن صفی کو اپنے قلم پہ اتنا بھروسہ تھا کہ انہوں نے شاید ہی کسی کو اس جرم کی پاداش میں آخری انجام تک پہنچایا ہو اور ان کا یہ یقین کچھ ایسا غلط بھی نا تھا۔ جو لوگ ابن صفی کے ڈسے ہوئے ہیں وہ آج بھی علی عمران کے نام پہ اپنے چہرے پہ ایک خوبصورت

مسکراہٹ چہرے پہ بھی دیکھتے ہیں۔۔ابن صفی کے لکھے ہوئے کرداروں کے عاشق اتنے جذباتی تھے کہ انہوں نے فلم دھماکہ میں اپنے وقت کے نامی گرامی ہیرو کو بھی ان کرداروں میں دیکھنا پسند نہیں کیا، جبکہ اس فلم کا سکرین پلے خود ابن صفی نے ہی لکھا تھا

خیر، بات کریں اکیسویں صدی کی جاسوسی اور سائنسی فلموں کی تو ہم با آسانی اس کا کچھ کریڈٹ ابن صفی کو دے سکتے ہیں۔ان کی ذہانت سے کون انکاری ہوسکتا ہے جب شوگر بینک نامی ناول میں احمق نظر آنے والے علی عمران نے موسیقی کے تختے پہ چھبیس تاروں کی مدد سے کوڈ ورڈ لینگویج وضع کیا تھا اگر ہم آئرن مین کو طوفان کا اغوا کے فولادی کے پس منظر میں دیکھیں تو با آسانی اس کا کریڈٹ بھی ابن صفی کو دیں گے، موت کی آندھی ناول بھی ذہن میں رکھا جاسکتا ہے۔جاسوسی کا بہترین طریقہ مناروں والی میں پڑھا جاسکتا ہے جہاں اونچے جوڑے کی مدد سے ایک مقام کی آواز کہی اور سنی جارہی تھی ان گنت جگہ انہوں نے نت نئے طریقے ایجاد کر کے اپنی ذہانت کے ڈنکے بجوائے ہیں۔

جاسوسی کے علاوہ بھی ابن صفی کے پاس کافی ایسے کردار ہیں جو بتاتے تھے ان کا معاشرتی مطالعہ کتنا وسیع تھا۔مثال کے طور پر زہریلا آدمی کا وہ اذیت پسند شخص، جنسی جنونیت میں مبتلا لیڈی سیتا رام، بوغا، عامرہ جیسی معصوم لڑکی، ہدہد جیسا ہکلاتا ہوا یادگار جاسوس اور وہ کبڑا جو ادھورے جسم کے ساتھ بھی ہار ماننا گوارا نہیں کرتا تھا، علامہ دہشت ناک، ہمبگ دی گریٹ، اس کے علاوہ، روشی جو جسم فروشی کے باوجود لوگوں کے دل پہ راج کرگئی، عمران کی خون کی پیاسی تھریسیا جو بعد میں اسی کی چاہت کا شکار ہوگئی تھی، یہ وہ چند یادگار کردار ہیں جو ایک ناول کے لیے تخلیق کیے گئے تھے۔اگر ان کے ساتھ عمران کی اپنی بنائی ہوئی پارٹی کے بارے میں بات کریں تو وہ بھی اپنی مثال آپ تھی۔۔خود کو سات پردوں میں چھپائے ہوئے اپنے ملک سے وفاداری نبھانے والا علی عمران، جس کا ماٹو تھا، جب کام احمق بن کے ہوسکتا ہے تو خوامخواہ کی بہادری دکھانے کا فائدہ، جب کہ اس کے برعکس ایک دوسرا لازوال کردار اپنے اصولوں پہ جان دینے والا جو جھکنا نہیں جانتا۔انسپکٹر فریدی۔سوٹ بوٹ پہنے بغیر اپنے بیڈ روم سے باہر نہیں نکلتا اس کا شرارتی چلبلا اسٹنٹ، حمید اپنے برجستہ جملوں کے ساتھ قدم قدم پہ عمران کا مقابلہ کرتے دکھائی دیتا ہے لیکن علی عمران کے چاہنے والوں نے اس مقابلے کو کبھی نہیں مانا۔ہر جگہ علی عمران کو بلا مقابلہ جتوا دیا گیا

(لکھنے والے کا قلم بھی علی عمران کا شیدائی ہے اسی لیے، کم از کم اس تحریر میں تو حمید کے جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

جس زمانے میں کسی لکھاری کا ایک آدھ کردار ہی مقبولیت تک جاتا تھا، ہی ابن صفی جیسے شاہکار لکھنے والے بھی تھے جن کے لکھے ہوئے منفی کردار کی بھی اپنی ایک فالونگ رہی۔۔سرفہرست سنگ ہی، وہ چائنیز لمبا آدمی، جو اپنی شراب نوشی اور عورتوں کا رسیا ہونے کے باوجود چاچا سنگ کے نام سے شہرت پا گیا۔گولیوں کی بارش سے بچتا ہوا وہ چائنیز جو اردو کی مخصوص گالیاں اہل زبان کی طرح بول کے لبوں پہ دل کش مسکراہٹ دوڑا دیتا تھا، اسی کے ساتھ تھریسیا (ٹی تھری بی) جو حسن میں یکتا اور عمران کی چاہنے والی لیکن علی عمران اسے بھی چٹکیوں میں اڑانے کا ماہر تھا۔الفانسے، لیونارڈ، جابر، جیسے طاقتور ترین منفی کردار بھی زندہ و جاوید ہیں۔علامہ دہشت ناک بھی بھولنے والا کردار نہیں ہے اسی کے ساتھ ایک دیو قامت کردار

قاسم جو حمید کا کھلونا تھا، اس کی ش ق کے بے قاعدگی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ مجھے یقین ہے اس وقت آپ کے ذہن کے کسی گوشے میں قل قل کرتی ہنسی گونج رہی ہوگی

اب جہاں ابن صفی کے ہیرو اور ولن کی بات ہو رہی تو ایسا کیسے ممکن ہے ان کے پیش کردہ جانوروں اور زیرو لینڈ کو بھول جائیں۔۔۔جی ہاں، کیپٹن حمید کی وہ چوھیا کون بھول سکتا ہے جس کا خیال اس کو گن پوائنٹ پہ بھی رہا۔ اگر میں مرگیا تو وہ بھی بھوکی مر جائیگی طارق کا نیولا، فریدی کے وہ مختلف نسل کے کتے اور نایاب و نادر اقسام کے سانپ، زیرو لینڈ کی وہ تصوراتی دنیا جس کے لیے پہلی بار ۱۹۸۵ میں ابن صفی نے باقاعدہ معافی مانگی تھی اپنے پڑھنے والوں سے کیونکہ انہوں نے، زمین کے بادل، لکھ کے علی عمران اور فریدی کے چاہنے والوں میں جنگ چھیڑ دی تھی، عرصے تک ان کو خطوط کے ذریعے دھمکیاں ملتی رہیں آئندہ ایسا تجربہ کرنا ہوتو عمران کو ہیرو دکھانا ہے جبکہ آفریدی کے چاہنے والے خوش ہوتے رہے علی عمران کو پچھاڑ دیا۔ شکرال کے وہ خونی جنگل جہاں قبیلوں کا راج تھا، گھمسان کی جنگیں بھی یادداشت میں کھلبلی مچانے تیار رہتی ہیں۔۔کیا لکھیں تو کیا چھوڑیں۔

مزے کی بات تو یہ تھی، جہاں ابن صفی کی کہانیاں مقبول تھیں وہیں ان کے پیش رس بھی بے انتہا دلچسپ ہوتے تھے، بے تکلفی سے وہ لوگوں کو جواب دے کے ان کے دلوں میں مزید گھر جاتے، کیا پان والا تو کیا ہی یونی ورسٹی کا پی ایچ ڈی پروفیسر، ہر ایک کے پاس ابن صفی کی کتاب ہونا اس بات کی دلیل ہوتی تھی کہ وہ اپنے دعوی میں کس قدر کامیاب ہو چکے ہیں، جس انسان نے اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کے عہد کیا تھا، جنسی اور زومعنی کلچر کا خاتمہ کرونگا اللہ نے انہیں سرخرو کیا۔ اگر آپ کے پاس ان کے ناولز موجود ہیں تو ایک نظر ان کے پیشرس دیکھیں، نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کے کہے ہوئے جملوں کی تازگی، کھنک اور خوبصورتی کم نہیں لگے گی۔ اس پہ ان کی انکساری، میٹھے بول اور اپنے قارئین سے کھل کے دل کی بات کہہ دینا، آج کے زمانے میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

اگر کھلے دل سے جائزہ لیا جائے تو ابن صفی ہمارے پاس ایک ایسا سرمایہ تھے جن کی قدر نہیں ہوسکی، ان کو وہ مقام نہیں دیا گیا جو ان کا حق تھا اگر وہ کہیں باہر ملک کے باسی ہوتے تو اب تک کئی لائبریری اور سرکا خطاب پاچکے ہوتے یا کم ازکم یونی ورسٹی کا ایک ڈیپارٹ ان کے نام ہو چکا ہوتا

جاتے جاتے ابن صفی کی پوری ٹیم (علی عمران، احمد کمال فریدی، حمید، انور، رشیدہ، صفدر، ظفر، جمن، جوزف، صف شکن، شہباز، ہدہد، روشی، جولیانا، سلیمان، بلیک زیرو (طاہر)، کیپٹن شکیل، کیپٹن خاور، لیفٹیننٹ صدیقی، لیفٹیننٹ چوہان، کیپٹن جعفری، سارجنٹ ناشاد، سر سلطان، کیپٹن فیاض، تھریسیا، سنگ ہی) کو ایک خوبصورت بچپن اور دل کش یادیں دینے کے لیے بے حد شکریہ، اور اس عظیم بے مثال تخلیق کرنے والے کے لیے تہہ دل سے دعا۔

اللہ ابن صفی کو ٹھنڈی اور پرسکون جگہ رکھیں، جیسے انہوں نے ہم عام لوگوں کی مشکل زندگی میں خوبصورت تحاریر کے ذریعے کچھ پل ہنسنے مسکرانے کے دیئے ہیں ویسے ہی اللہ ان کے آگے کے سفر کو بھی آسان رکھے، آمین۔

تم تھوڑی ہو

زرین قمر

نئے افق پبلی کیشنز کا جولائی کا شمارہ ''ابن صفی'' کے نام ہے چنانچہ اس بار میں نے ابن صفی کے ناولوں میں پائے جانے والے کرداروں میں سے ایک کو چنا ہے جس کے بارے میں، میں اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا چاہتی ہوں ویسے تو اردو ادب میں ناول اور افسانوں میں کردار نگاری بنیادی اکائی ہے اور تقریباً تمام مصنفین کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں موجود کرداروں کی خصوصیات بہتر طریقے سے نمایاں کریں۔ افسانے میں تو کردار کچھ دیر کے لیے اپنا حصہ ادا کر کے چلے جاتے ہیں لیکن ناولز اور خاص طور پر سلسلے وار ناولز میں انہیں ساتھ لے کر چلنا اور ان میں وقتاً فوقتاً بہتری اور جدت پیدا کرنا بذات خود ایک فن ہے جس میں ہمیں چند ہی نام نظر آتے ہیں اور پھر سری ادب میں اگر دیکھا جائے تو ابن صفی کا نام نمایاں نظر آتا ہے جنہوں نے سیکڑوں کی تعداد میں جاسوسی ناولز لکھے اور ان میں بے شمار کردار پیش کیے ہر کردار پر بہت توجہ سے کام کیا ان کا ''عمران سیریز'' کا سلسلہ میں نے منتخب کیا ہے کیونکہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کو ملا کر اتنے زیادہ ناولز بن جاتے ہیں کہ کوئی ایک یا کئی مصنفین بھی ایمانداری سے اپنا حق ادا نہیں کر سکتے چنانچہ میں نے صرف عمران سیریز کو منتخب کیا ہے اور اس میں بھی ایک کردار جو ابن صفی کے منفی کرداروں میں مجھے سب سے زیادہ نمایاں اور دلچسپ نظر آتا ہے اسے میں نے آج کے لیے منتخب کیا ہے ''تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا''۔

ابن صفی نے T3B یعنی تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا کے کردار کو لے کر بہت سے ناولز لکھے انہوں نے اسے ایک بہت بہادر عورت کے روپ میں دکھایا جس کا تعلق زیرو لینڈ سے تھا اس میں صلاحیت تھی کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چند لمحوں میں تبدیل کر لیتی تھی اور کسی کے لیے بھی اسے پہچاننا ممکن نہیں ہوتا تھا خود عمران سے بھی وہ کئی ناولز میں کسی دوسرے نام اور حلیے کے ساتھ ملی عمران کافی دیر تک اسے پہچان نہ سکا بہت آخر میں جا کر اس کی شناخت کا بھید کھلتا تھا اس طرح بھی ابن صفی اپنے قاری کو آخر تک بور نہیں ہونے دیتے تھے اور ناول میں اس کی دلچسپی برقرار رہتی تھی۔

تھریسیا، عمران کی شخصیت سے بہت متاثر نظر آتی تھی اور اس نے کئی مقامات پر یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ عمران کو چاہتی ہے کئی ناولز میں اس نے عمران کے ساتھ رعایت برتی اور اس میں محبت ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی بچائی۔

تھریسیا سنگ ہی کی شاگرد تھی جو چینی تھا لیکن اپنی تخریبی سرگرمیوں کی بدولت وہاں سے نکال دیا گیا تھا پھر وہ مختلف ممالک کی خاک چھانتا ہوا لندن پہنچا جہاں عمران سے پہلی بار اس کی ملاقات ہوئی اور وہ وہیں پہلی بار تھریسیا سے بھی ملا تھریسیا ہمیں سب سے پہلے ابن صفی کے ناول ''کالے چراغ'' میں ملتی ہے اس کی خوبیاں الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے اس تحریر میں جگہ جگہ مختلف ناولوں سے کچھ حصے اخذ کروں گی اس طرح وہ لوگ جو اس میدان میں نئے ہیں اور انہوں نے ابن صفی کو نہیں پڑھا وہ بھی ان کی تحریر اور کردار سے لطف اندوز ہو سکیں گے اور تھریسیا کے اسٹائل کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی سب سے پہلے پہلا ناول ''کالے چراغ'' کا اہم حصہ جہاں پہلی بار تھریسیا کی انٹری ہوتی ہے۔

''وہ واقعی بہت خوب صورت تھی نکلتا ہوا قد، متناسب الاعضا، جسم پر چست لباس، شانوں پر ڈھلکتی ہوئی

گھنگھریالی زلفیں جن کی رنگت سنہری تھی خدوخال غیر معمولی جن کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ناقابل بیان ہیں یعنی الفاظ میں ان کی تصویر کشی کرنا ناممکن ہے۔ بہت لوگ کہتے تھے کہ شاید وہ کوئی ذی روح ہے خود عمران نے بھی یہی محسوس کیا کہ کچھ دیر دیکھتے رہنے کے باوجود بھی محض یادداشت کے سہارے اس کی شکل و صورت کے متعلق کچھ نہ بتا سکے گا کبھی اس کا اوپری ہونٹ ایک خفیف سے خم کے ساتھ اوپر اٹھ جاتا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ناک کی جڑ سے دہانے تک بالکل ہموار ہو کبھی آنکھیں خوابناک سی معلوم ہوتیں اور ان سے اداسی جھانکنے لگتی اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے جسم کی ساری قوت آنکھوں میں کھنچ آئی ہو نہ جانے کیوں ان بدلتی ہوئی کیفیات کا اثر اس کے خدوخال پر بھی پڑتا تھا وہ اس کے قریب سے گزرتی آگے نکل گئی تھی ان دنوں عمران اپنے دوست شکیل کی کوٹھی پر ٹھہرا ہوا تھا اسے جمیل کے بھائی خلیل نے وہاں بلایا تھا شانتی نگر یوں تو بہت بڑا شہر نہیں تھا لیکن یہاں مختلف طبقہ فکر کے لوگ پائے جاتے تھے عمران کو شانتی نگر بلوانے کا مقصد ہی اس حسینہ سے ملوانا تھا جو جادوگرنی تو نہیں تھی لیکن ستاروں کی چال کو خوب سمجھتی تھی شکیل کے سارے گھر والے اس سے خائف تھے وہ شکیل سے بہت بے تکلف تھی اور وہ بھی اس کی دعوت پر اس کی کوٹھی میں قیام پذیر تھی۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تمہاری کوٹھی میں کیسے آئی؟'' عمران نے شکیل سے پوچھا۔

''میرے بڑے بھائی جمیل سے تو تم واقف ہی ہو وہ ایک تقریب میں گئے تھے وہاں وہ انہیں مل گئی جب وہ واپس آنے لگے تو اس نے انہیں روک کر کہا کہ وہ اس وقت اپنی کوٹھی کے مشرقی پھاٹک سے عمارت میں نہ داخل ہوں۔''

''کس عمارت میں؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہیں، اسی عمارت میں یہاں دو پھاٹک ہیں ایک شمال کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف آمد و رفت مشرق ہی سے زیادہ رہتی ہے بھائی جمیل جو ذرا فلسفی قسم کے آدمی ہیں اس کی بات پر ہنسنے لگے تو اس نے کہا کہ وہ کوئی جادوگرنی نہیں ہے بلکہ ستاروں کی چال سے واقف ہے اور یہ چال ظاہر کر رہی ہے کہ رات 9 اور 10 بجے کے درمیان وہاں خطرہ ہے پھر جب جمیل بھائی کوٹھی پہنچے تو شمالی گیٹ کی طرف آئے پھر وہ اسے کھولنے کے لیے کار سے اترے ہی تھے کہ دور کسی دیوار کے گرنے کی آواز آئی اور انہیں مشرقی گیٹ کا خیال آیا وہ کار میں بیٹھ کر تیزی سے مشرقی گیٹ کی طرف گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ گیٹ کے اوپر کا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر چکا ہے اگر وہ ادھر سے آتے تو یقیناً نقصان اٹھاتے۔''

''میں نے پوچھا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی؟'' عمران نے پھر سوال دہرایا۔

''جب اس کی بات درست ثابت ہوئی تو جمیل بھائی دوسرے ہی دن اس سے ہوٹل میں ملنے پہنچے جہاں وہ مقیم تھی اس سے ملنے کے بعد وہ اس کے مزید معتقد ہو گئے اور پھر ایک دن اسے یہاں لے آئے وہ پہلے امی سے بہت ڈرتے تھے اب یہ حال ہے کہ انہیں کسی کی بھی پروا نہیں۔''

''لیکن مجھے یہاں کیوں بلایا ہے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ مجھے پراسرار لگتی ہے۔'' شکیل نے کہا۔

''یہ تو کچھ ایسی خاص بات نہیں عورتیں اکثر پراسرار ہی ہوتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر عاشق محکمہ سراغ رسانی کو بور کرتا پھرے۔''

''مگر وہ پراسرار حرکتیں کر رہی ہے راتوں کو اٹھ اٹھ کر عمارت کے مختلف گوشوں میں چوروں کی طرح کچھ تلاش کرتی پھرتی ہے۔'' شکیل نے بتایا۔
''کچھ اور؟''
''وہ کہتی ہے کہ وہ سوئٹزرلینڈ سے آئی ہے یہاں کسی کو نہیں جانتی۔'' شکیل نے بتایا۔
''اگر وہ کسی کو نہیں جانتی تو آئی کیوں؟''
''مجھے بھی شک ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے کیونکہ کل شام جب میں اس کے ساتھ باہر گیا تھا تو میں نے اسے ایک غیر ملکی کو اشارہ کرتے دیکھا تھا مجھے اندازہ نہیں کہ وہ غیر ملکی انگریز تھا جرمن تھا یا فرانسیسی۔''
''اس عورت کا نام کیا ہے؟''
''اسٹارٹیا۔''
''یہ نام سے تو سوئس ہی لگتی ہے کیا وہ لوگوں سے پیش گوئی کی کوئی فیس بھی لیتی ہے۔''
''ہاں، ہاتھ دیکھنے کے پچیس روپے اور روحوں سے ملاقات کرانے کے تین سو روپے۔''
''کیا وہ روحوں سے ملاقات بھی کراتی ہے۔''
''ہاں سنا ہے، لیکن ایسا کرتے خود کبھی نہیں دیکھا۔''
شکیل سے یہ معلومات ملنے کے بعد عمران نے اپنے سیکرٹ سروس نمبر پر فون کر کے جولیا کو ہدایت کی تھی کہ وہ کیپٹن جعفری کے ساتھ مل کر اس کیس کی تحقیقات کرے اور چونکہ وہ بھی سوئس ہے تو اسی تعلق کے تحت اپنی قسمت کا حال جاننے کے لیے پرائس ہوٹل میں اسٹارٹیا سے ملے جہاں وہ لوگوں سے ملتی ہے اور ان کی قسمت کا حال بتاتی ہے اس کے ساتھ ہی عمران نے بحیثیت ایکٹو اپنی ٹیم کو لعنت ملامت بھی کی تھی کہ وہ ملک میں ہونے والی سرگرمیوں سے بے خبر رہتے ہیں اور عمران کو اس کا علم پہلے ہو جاتا ہے۔
اسی ناول ''کالے چراغ'' میں دوسری بار عمران کی ملاقات اس سے اچانک ہی ہوتی ہے وہ جمیل کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا کہ اچانک ایک کمرے سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی اور وہ جمیل کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا تھا کمرے میں ایک چھوٹی سی میز پر تین چراغ روشن تھے اسٹارٹیا سامنے والی دیوار سے لگی کھڑی تھی اس کے چہرے پر پسینہ تھا اور وہ بغیر پلکیں جھپکائے خوف سے چراغوں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ان چراغوں کی لوؤں میں اسے کچھ نظر آ رہا ہو۔
''انہیں بجھا دو۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
جمیل نے چراغوں کو بجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں بجھے تھے پھر عمران آگے بڑھا تھا اس نے بھی کوشش کی تھی لیکن اسے بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی یہ دیکھ کر اسٹارٹیا تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔
''بھاگو...... جلدی بھاگو...... باہر نکلو۔'' وہ دوڑتے ہوئے چیخ رہی تھی انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو اس کے ساتھ ہی جمیل بھی کمرے سے نکلا تھا اور اس کے ساتھ دوڑتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا پھر اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔
''جمیل دروازہ کھولو۔'' عمران نے باہر سے دروازہ پیٹتے ہوئے ہانک لگائی تھی۔
''ہمیں تنگ مت کرو۔'' اندر سے جمیل کی آواز آئی تھی۔ ''وہ بہت خوفزدہ ہے۔ تم یہاں سے جاؤ۔''

جمیل نے سختی سے کہا تھا پھر عمران کو شکیل سے پتا چلا تھا کہ وہ کمرہ جمیل کی خوابگاہ تھی اور اسٹارٹیا کا جمیل کے ساتھ وہاں جا کر بند ہو جانا عمران کی سمجھ سے باہر تھا۔

ناول کے آخر میں عمران کو پتا چلتا ہے کہ اسٹارٹیا اس کوٹھی میں دراصل کسی خزانے کی تلاش میں آئی تھی اور راتوں کو چھپ چھپ کر وہی خزانہ تلاش کرتی تھی پھر وہ ایک رات اسے ایک بریف کیس لے کر بھاگتے ہوئے دیکھتا ہے اس کے کچھ نقاب پوش ساتھی بھی وہاں موجود ہوتے ہیں جن سے عمران مقابلہ کرتا ہے پھر اسٹارٹیا کی کمر پر ایک لات رسید کرتا ہے تو بریف کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتی ہے۔

اس رات عمران جولیا کو بتاتا ہے کہ اسٹارٹیا دراصل تھریسیا ہے جس سے اس کی ملاقات کبھی لندن میں ہوئی تھی وہ ایک گروہ ”زیرولینڈ“ کی سربراہ ہے اسے ٹی تھری بی بھی کہا جاتا ہے اس گروہ کے ہر لیڈر کو ٹی تھری بی کہا جاتا ہے چاہے اس کا پیدائشی نام جو بھی ہو دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں یہ گروہ ٹوٹ گیا تھا اور اس زمانے کی ٹی تھری بی اپنے دلیر ترین ماتحت الفانسے کے ساتھ جرمن سے فرانس بھاگ گئی تھی پھر اس کی موت کی خبر آئی لیکن کوئی ثبوت نہیں ملا۔

تمام تفصیل بتانے کے بعد عمران نے تھریسیا کی نگرانی جولیا کے سپرد کر دی تھی اور خود بھی اس کے ریکارڈ کی ٹوہ میں لگ گیا تھا جو اسے بریف کیس سے ملا تھا۔

ابن صفی کے تھریسیا سیریز کے دوسرے ناول ”خون کے پیاسے“ میں تھریسیا بریف کیس کی تلاش میں ہوتی ہے اس بار اس کا حلیہ بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا ماتحت ساتھی الفانسے بھی ہوتا ہے وہ ایک موقع پر جولیا اور اسکے ساتھیوں کو گرفتار کر لیتے ہیں عمران کی اپنے ساتھیوں سمیت ان سے مڈبھیڑ ہوتی ہے زبردست مقابلہ ہوتا ہے اور تھریسیا جو سارے یورپ کی پولیس کو انگلیوں پر نچاتی رہی تھی عمران کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے لیکن یہ پہلا موقع ہوتا ہے جب وہ عمران سے محبت کا اظہار کرتی ہے اور اس کی جان بخش دیتی ہے۔

ایک موقع پر وہ عمران پر پستول تان لیتی ہے لیکن فائر کرنے سے گریز کرتی ہے اس کا ہاتھ رک جاتا ہے اس کی آنکھوں میں کچھ ایسے آثار ہوتے ہیں جیسے اسے اظہار کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

”تم مجھ پر فائر کیوں نہیں کر رہی ہو؟ جبکہ میں نہتا ہوں اور تمہارے نشانے پر ہوں؟“ عمران نے کہا۔

لیکن وہ اسے خاموشی سے گھورتی رہی۔

”چلو، میں ان کارتوسوں کی قیمت دینے پر بھی تیار ہوں جو تم مجھ پر ضائع کرو گی۔“ عمران نے کہا لیکن اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوئچ بورڈ سے لگے ہوئے ایک بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن عمران نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے زور سے جھٹکا۔

”میں کہہ رہا ہوں نا کہ مجھ پر فائر کرو پھر آدمیوں کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟“ عمران نے کہا اور تھریسیا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسی حالت میں ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ وہ عمران کی طرف مڑی۔

”تم مجھے بتاؤ کہ تم ہو کیا بلا؟“ اس نے پوچھا لہجہ یکدم بدل گیا تھا۔

”بس اب...... میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“ عمران نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”تم صبح سے پندرہویں

عورت ہو جس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے۔"
"عورتیں تمہاری طرف بے تحاشہ جھکتی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے۔"
"کل تک تم میری زندگی کی خواہاں تھیں..... مگر..... آج..... آج کیا ہو گیا؟ بمل بی آف بوہیمیا۔" عمران نے کہا۔
"میں تمہیں مردہ نہیں دیکھنا چاہتی۔"
"کیوں؟ کیوں مردہ نہیں دیکھنا چاہتیں؟"
"میں تمہیں کسی حد تک پسند کرنے لگی ہوں۔" تھریسیا نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
پھر اچانک الفانسے وہاں آ گیا تھا اور عمران پر جھپٹ پڑا تھا کافی دیر کی لڑائی میں عمران زخمی ہو گیا تھا اور الفانسے اسے گولی مار کر ختم کرنا چاہتا تھا لیکن تھریسیا نے مخالفت کی تھی۔
"رہنے دو الفانسے اسے مارنا فضول ہے اسے مار کر ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا ابھی اس کے پاس ہمارے کاغذات ہیں پھر وہ الفانسے کے ساتھ وہاں سے چلی گئی تھی اور عمران اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔
جب عمران کو ہوش آیا تھا تو تھریسیا اس پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ عمران کی پیشانی پر تھے عمران کو ہوش آتے ہی وہ پیچھے کو ہٹی تھی اور عمران نے برا سا منہ بنا کر اپنی پیشانی کو رگڑا تھا جیسے وہاں بچھو نے کاٹ لیا ہو۔
"بڑے شریر ہو تم۔" تھریسیا نے جذبات سے بھرائی آواز میں کہا۔
"کک..... کیا..... مم..... مطلب؟" عمران ہکلایا۔
"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تمہیں کیا کروں؟ تم جیسا آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔"
"تم مجھے آدمی سمجھتی ہو تمہارا شکریہ۔"
"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ملک والے تمہاری قدر نہیں کرتے میں تمہارے متعلق ساری معلومات فراہم کر چکی ہوں تم پولیس کے لیے کام کرتے ہو لیکن اس کے باوجود بھی محکمہ سراغ رسانی کا سپرنٹنڈنٹ تمہیں پھانس لینے کی تاک میں رہتا ہے تم ان پر لعنت بھیج دو۔"
"بھیج دی۔" عمران نے جلدی سے کہا۔
"کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت ور عورت تھریسیا تمہیں چاہتی ہے۔"
"چاہتی ہے؟" عمران نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے ڈر کے مارے اس کا دم ہی نکل جائے گا۔
"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی چال چل رہی ہوں۔"
"میں نے اب تک تمہیں چلتے نہیں دیکھا سنا ہے اگر خوب صورت عورت کی چال حسین ہو تو سر پٹک معمہ نمبر ۱۱۳ کا اول انعام مبلغ ایک لاکھ روپے چار لاکھ خوش نصیبوں میں برابر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔
"عمران ڈیئر..... سنجیدگی سے..... یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے میں محسوس کرتی ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی محال ہو جائے گی۔"
"ارے باپ رے..... کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔"

''تم ڈرتے کیوں ہو؟ تھریسیا تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی اور نہ ہی تمہارے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے والدین۔''
''ہاں، میں جانتی ہوں تمہارے والد محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر جنرل ہیں اور تمہاری نالائقیوں کی بناء پر تم سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسی صورت میں وہ مجھے ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے۔''
''کیسی صورت میں؟''
''اگر مجھے بھی تم سے محبت ہو جائے، تم نہیں سمجھ سکتیں۔'' عمران نے رو دینے والی آواز میں کہا۔
''میں تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''
''اس کے لیے تمہیں میرے ماں باپ سے گفت و شنید کرنا ہوگی۔'' عمران نے پرخلوص لہجے میں کہا۔
''تم ان کا تحریری اجازت نامہ لاؤ میں تم سے محبت کرنے لگوں گا۔''
''اچھا۔'' تھریسیا دانت پیس کر بولی۔ ''میں تمہیں دیکھ لوں گی۔''
تھریسیا ہی کے سلسلے کا تیسرا ناول الفانسے ہے جس میں تھریسیا کے عمران سے عشق کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کی کئی کئی صلاحیتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جن کا علم عمران کو بھی پہلی بار ہوتا ہے۔۔۔ حیران رہ جاتا ہے۔
آدھے چاند کی پھیکی چاندنی چٹانوں پر بکھری ہوئی تھی، عمران ٹہلتا ہوا اپنے پڑاؤ سے دور نکل آیا تھا اتنے دنوں کے شور شرابے سے اکتایا ہوا ذہن اس فضا میں سکون اور گہری طمانیت محسوس کر رہا تھا فضا میں اسے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا تھریسیا اس کے سامنے کھڑی تھی۔
''کیوں؟'' اس نے اسی انداز میں پوچھا جیسے اس کا اس طرح آنا اسے گراں گزرا ہو۔
''تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟'' تھریسیا بھی شاید پہلے ہی سے جھلائی ہوئی تھی۔
''بڑی مصیبت ہے۔'' عمران پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''ارے میں خود کو بالکل چغد سمجھتا ہوں۔''
''تم سمجھتے ہو کہ تم نے تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا کو گرفتار کر لیا ہے اور قیدیوں کی طرح یہاں سے لے جا رہے ہو؟''
''تم تو ریٹا گراہمیں ہو میں کسی تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا سے واقف نہیں ہوں۔'' عمران نے کہا تو وہ مسکرائی۔
''اس وقت بھی تم تھریسیا کے رحم و کرم پر ہو یہ مت بھولو۔''
''واقعی؟'' عمران نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ارے باپ رے'' وہ بوکھلا کر اچھلا اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کوئی کتے کا پلہ اس کے پیروں تلے آ کر چیخا ہو اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہاں کچھ نہیں تھا تھریسیا ہنسنے لگی۔
''اسی طرح۔'' تھریسیا نے پرسکون آواز میں کہا۔ ''بالکل اسی طرح تمہارے گھوڑے بھڑک بھڑک کر ڈھلانوں میں چھلانگیں لگا سکتے ہیں تم سب تباہ ہو سکتے ہو، میں چاہوں تو یہ لوگ جو اس وقت پڑے سو رہے ہیں بوکھلا اٹھیں اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں بمبل بی آف بوہیمیا تنہا ہزاروں پر بھاری ہے کیا سمجھے؟''

''یہ آوازیں کیسی تھیں؟''
''میرے حلق سے نکلی تھیں۔'' تھریسیا بولی۔''اور اس میں کمال یہی ہے کہ تم نے انہیں اپنے پیروں کے نیچے محسوس کیا تھا۔''
''واقعی کمال ہے۔'' عمران کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا'' اگر میں تمہیں قیدی سمجھتا تو ہتھکڑیاں ڈال کر لے چلتا تم اس خیال کو دل سے نکال دو۔''
''پھر اس طرح لے چلنے کا مقصد؟''
''کوئی مقصد نہیں کیا میں تمہیں ان درندوں کے رحم وکرم پر چھوڑ آتا؟''
''عمران۔'' وہ قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ورنہ اس دن وہاں سے الفانسے کی بجائے تمہاری لاش ہوتی۔
''اور فرشتے مجھے براہ راست اٹھا کر آسانی سے لے جاتے۔'' عمران نے کہا۔
''میں تمہاری تحقیر نہیں کر رہی ہوں تم جیسا دلیر آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا دلیر اور ٹھنڈے دماغ والا جب تم لڑتے ہو تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہیں حریف کی طرف سے کوئی خدشہ ہو۔''
''تم کہنا کیا چاہتی ہو تھریسیا؟''
''کچھ نہیں...... یہی کہ اس کے باوجود بھی تم ایک ناکارہ آدمی ہو، میں اسے آدمی ہی نہیں سمجھتی جو کسی عورت کے جذبات کو نہ سمجھ سکے۔''
''ارے باپ رے۔''
''تم گدھے ہو۔'' تھریسیا جھلا کر بولی اور جانے کے لیے مڑ گئی عمران اسے پڑاؤ کی طرف جاتے دیکھتا رہا تھا۔
دوسری صبح تھریسیا غائب تھی ایک گھوڑا اور تھیلا غائب تھا جس میں کھانے پینے کا سامان تھا جہاں تھریسیا سوئی تھی وہاں پتھر کے نیچے ایک خط تھا جس میں تھریسیا نے عمران کو مخاطب کیا تھا۔
''میں جا رہی ہوں لیکن زندگی کے کسی بھی حصے میں نہ بھلا سکوں گی تم پر اعتماد نہیں کر سکتی ورنہ تمہارے ساتھ ہی چلتی کبھی نہ کبھی پھر ملاقات ہوگی لیکن شاید دو حریفوں کی شکل میں ہم کبھی نہ مل سکیں ٹی تھری بی کی تنظیم کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اب نہیں کہہ سکتی کہ اس زندگی کا انداز کیا ہوگا تم ہمیشہ خوش رہو اور کاش کبھی میرے متعلق بھی سوچ سکو۔''
تھریسیا کے کردار کی زیادہ تر کہانیاں یوں ختم ہوتی ہیں جیسے وہ اب دوبارہ کسی ناول میں شاید نظر نہ آئے لیکن پھر ابن صفی اگلے ناول میں اسے لے آتے ہیں مثال کے طور پر ''پیاسا سمندر'' پیش کیا جا سکتا ہے جس کا انجام بتا رہا ہے کہ وہ ختم ہو گئی اس ناول میں وہ ایک خلائی مخلوق کے روپ میں سامنے آتی ہے اور سیکرٹ سروس کی ایک ایجنٹ شمسی کو ایک ویران مقام پر اندھیرے میں ملتی ہے اس کا ابن صفی نے جو حلیہ بیان کیا ہے اسے پڑھنے کے بعد قارئین کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ تھریسیا ہو سکتی ہے ملاحظہ کریں۔
نرکلوں کی جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر اچانک وہ رک گئی اس نے کسی قسم کی غیر معمولی آواز سنی تھی جو نرکلوں میں پیدا ہونے والی سرسراہٹ سے بہت مختلف تھی آواز پھر آئی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل

کہیں قریب ہی کہیں دبی دبی آواز میں کوئی رو رہا تھا وہ آواز یقینی طور پر نسوانی تھی شمی نے ٹارچ روشن کرلی رونے والی سامنے ہی تھی شمی بے ساختہ اس کی طرف جھپٹی۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کے سنہرے بال نیچے ڈھلکے ہوئے تھے شمی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی اس کے جسم پر نیلے رنگ کا لبادہ تھا اور اس پر سنہری کشیدہ کاری تھی دونوں ہاتھ شانوں تک ننگے تھے شمی کی حیرت کی سب سے بڑی وجہ اس کے ہاتھ تھے کیونکہ ان کی رنگت سنہری ہی تھی وہ شمی کی موجودگی سے بے خبر اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے سسکیاں لیتی رہی۔

''اے...... تم کون...... ہو...... کیوں...... رو رہی ہو، میری طرف دیکھو۔'' شمی نے بچکانہ انداز میں کہا اور وہ یک بیک چونک پڑی اور سر اٹھا کر شمی کی طرف دیکھا لیکن ٹارچ کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر شمی کے ہاتھ سے بھی ٹارچ چھوٹ کر گر گئی کیونکہ وہ عورت تو سونے کی تھی اس کے ہونٹ یاقوت کی طرح سرخ تھے اور آنکھیں زمرد کے رنگ کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

''تم کون ہو؟ مجھے بتاؤ کیوں رو رہی ہو؟'' شمی نے قریب جا کر پوچھا لیکن اس نے جو کچھ کہا وہ شمی نہ سمجھ سکی کیونکہ وہ جو زبان بول رہی تھی وہ شمی نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن اس کی آواز میں جیسے گھنٹیاں سی بج رہی تھیں شمی کے کان اس کی آواز کی لذت میں کھو گئے شمی نے دیکھا وہ زخمی تھی اور اس کے پیر کے زخم سے خون بہہ رہا تھا جو سرخ تھا۔

جب عمران اس سے ملا تو اسے دیکھ کر اچھل پڑا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو اور اس لڑکی کے حلق سے بھی ایک خوفزدہ سی آواز نکلی تھی۔

''یہ لڑکی تو تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا ہے۔'' عمران نے احمقانہ انداز میں اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا لیکن وہ غافل نہیں تھا جانتا تھا کہ تھریسیا بجلی ہے ذرا نظر بچی پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔

''اپنی زبان کھولو، مجھ سے یہ سیاروں والا فراڈ نہیں چل سکے گا۔ کیا تم اب بھی گونگی ہی بنی رہو گی۔'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔'' تھریسیا مسکرائی۔

''یہ کیا قصہ ہے۔''

''کچھ بھی نہیں...... مجھے قصے کا علم نہیں...... میں تو معقول معاوضے پر کام کرتی ہوں۔''

''معقول معاوضہ، اس بار تو میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تم یاد رکھو۔''

''عمران تم میرے لیے طفل مکتب ہو۔''

''تم نے کہا تھا کہ تم اب شرافت کی زندگی بسر کرو گی؟''

''مجھ سے کوئی کمینہ پن سرزد نہیں ہوا، میں اپنے ملک کے لیے کام کر رہی ہوں اور اگر ملک کے لیے کام کرنا کمینہ پن ہے تو تم مجھ سے بھی بڑے کمینے ہو کیونکہ خود تمہاری کوئی پوزیشن نہیں تم تو اپنے ملک کے ایجنٹ ہو۔''

''میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، یہ بتاؤ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے۔''

''اس کا نام زیرولینڈ ہے یقین کرو پچھلی ملاقات سے اب تک ایک پل کے لیے بھی میرا ذہن تمہارے

خیال سے خالی نہیں ہوا میں نے آج تک اتنی شدت سے کسی کو بھی نہیں چاہا کبھی نہیں۔"
"میں یہ سوچے بغیر تم پر تشدد کروں گا کہ تم مجھے کتنا چاہتی ہو۔"
"میں یہیں موجود ہوں عمران...... تمہارے قریب...... تمہارے سامنے......" تھریسیا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم اگر مارو گے تو یہ بھی ایک طرح کی لذت ہوگی میرے لیے۔" تھریسیا نے آنکھیں بند کر لیں اور خوابناک لہجے میں بولی۔
"عمران کا ہاتھ...... میرا گال...... عمران مارو...... مجھے مارو...... جس شدت سے مجھے تم سے پیار ہے اتنی ہی قوت سے مارو...... مار۔" وہ بولتی جا رہی تھی عمران نے قہقہہ لگایا اور پھر تھریسیا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"میں تمہیں ماروں گا ڈالنگ، ارے سڑے میرا ہاتھ...... کیڑے پڑیں اس میں۔" اس کا لہجہ ٹھیٹھ دیسی بوڑھیوں کا سا تھا۔
"مکاری نہیں عمران۔" تھریسیا آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔
"تم مجھے چاہتی ہو مجھے ہی نہیں بتاؤ گی کہ زیرولینڈ کہاں ہے؟"
"نہیں تمہارا مقام الگ ہے تمہیں اس کی اجازت دے سکتی ہوں کہ تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں تمہیں زیرولینڈ کا محل وقوع بتا دوں۔" اس نے کہا اور کمرے میں بچھے بستر پر لیٹ گئی پھر اس نے چادر منہ تک اوڑھ لی تھی عمران حیرت سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اچانک اسے تھریسیا کے قہقہے کی آواز سنائی دی اس نے ایک جھٹکے سے چادر چہرے سے ہٹا دی۔
"تم ہار گئے عمران...... ہاہا...... ہار گئے۔" اس نے کہا اس کی آنکھیں بے حد نشیلی ہو گئی تھیں اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے وہ ذرا ہی دیر میں سو جائے گی۔
"آہا...... تو کیا اب یہ تمہارا بستر...... چھت پھاڑ کر اوپر نکل جائے گا۔"
"نہیں ڈارلنگ۔" تھریسیا کی آواز دردناک تھی اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ۔
"کیا مطلب۔" یک بیک عمران چونک پڑا۔
"یہ لو" تھریسیا نے ڈھیلے ہاتھ سے کوئی چیز عمران کی طرف اچھال دی عمران نے اسے ہاتھ پر روک لیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں یہ ایک چھوٹی سی شیشی تھی جس کی تہہ میں سرخ رنگ کا ایک قطرہ لرز رہا تھا اور لیبل پر تحریر تھا "زہر"
"یہ تم نے کیا کیا؟" عمران شیشی پھینک کر اس کی طرف جھپٹا۔
تھریسیا ہنسی مگر اس کی آواز میں بڑا اضمحلال تھا۔
"میں جانتی تھی کہ تم میری کسی تجویز پر عمل نہیں کرو گے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"میرے مشورے کو شبے کی نظر سے دیکھو گے تمہیں کسی بات کا یقین دلانا بہت مشکل کام ہے کیونکہ تم ضدی ہو، چلو اگر تمہارا ایک آنسو بھی میری لاش پر گر سکا تو میں یہی سمجھوں گی کہ میں نے زہر کھا کر غلطی نہیں کی تھی یہ ایک سریع الاثر زہر ہے اچھا...... جاؤ...... دور ہٹو...... ہٹ جاؤ...... مجھے مرنے......!" عمران دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھریسیا نے پھر چہرے پر چادر کھینچ لی عمران خاموش کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا مگر وہ اب بھی سوچ رہا تھا کہ وہ عورت تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا ہے دنیا کی چالاک ترین عورت۔

پھر ایک جھٹکے سے اس کی گردن دائیں جانب ڈھلک گئی تھی جسم اب بالکل ساکت تھا عمران نے اسے آوازیں دیں، نبض ٹٹولی ناک کے سامنے ہاتھ لے کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں اب کچھ نہیں تھا اس نے ابھی تک اتنی جلدی مرنے والوں کے جسم اکڑے نہیں دیکھے تھے وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔

اس ناول میں تھریسیا کے کردار نے کمال کر دیا ہے کیونکہ جب اس کی لاش اس کمرے سے ہٹالی گئی اور عمران دوسرے تفصیلات نمٹانے میں مصروف ہو گیا تو اس کے لیے فون پر ایک کال آئی جو اس نے ریسیو کی۔

''ہیلو۔''

اور جواب میں اسے کسی عورت کی ہنسی سنائی دی عمران کو بالکل ایسا ہی معلوم ہوا جیسے اس کی کھوپڑی گردن سے اکھڑ کر چھت سے جا ٹکرائی ہو کیونکہ یہ آواز اور ہنسی تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

عمران سنبھلا اور پھر اس نے بھی ہنسنا شروع کر دیا اس کے علاوہ کرتا بھی کیا اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے ڈاکٹر داور قریب ہی کھڑے اسے اس طرح گھور رہے تھے جیسے ان کی دانست میں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

''عمران ڈارلنگ۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے دوسری طرف سے ماؤتھ پیس میں ایک عدد بوسہ اڑا دیا تھا۔

''ارے باپ رے۔'' عمران بڑبڑایا۔

''میں نے تمہیں ایک شاندار موقع دیا تھا عمران۔'' آواز آئی ''لیکن تم شکوک و شبہات کا شکار رہے اب بتاؤ کیسی رہی کل کے اخبارات یہی بتائیں گے کہ تھریسیا عمران کو چکا دے کر نکل گئی اگر تم نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دی ہوتی تو میرے نکل جانے کی ذمہ داری تم پر عائد نہ ہوتی ویسے نہ میرے ہاتھ ہتھکڑیوں کے لیے بنے اور نہ ہی میں خود حوالات کے لیے۔ بولو تم سے غلطی ہوئی تھی یا نہیں؟''

''نہیں۔'' عمران نے غصیلی آواز میں کہا۔

''ارے خفا ہو گئے ڈیئر۔ سنو تو سہی تمہارے مشرق کا صرف یہی آرٹ مجھے بے حد پسند ہے اسی کی بدولت میں کئی بار کافی بڑے خطرات سے نکل گئی ہوں، تم بھی جس دم کی تھوڑی مشق بہم پہنچا لو کبھی نہ کبھی کام ہی آئے گی۔''

''میں روح قبض کرنے کا ماہر ہوں۔''

''واقعی تم غصے میں معلوم ہوتے ہو، بھئی میرا کیا قصور ہے مجھے وہاں سے ایک ایمبولینس گاڑی میں ڈال کر اسپتال لایا گیا تھا اسپتال کے کمپاؤنڈ میں گاڑی رکی اور جیسے ہی وہ لوگ مجھے اسٹریچر پر ڈالنے لگے میں نے ایک چھینک سی لی بس چھینکنا قیامت ہو گیا وہ لوگ اچھل اچھل کر بھاگے اور کمپاؤنڈ میں چاروں طرف بھوت بھوت کے نعرے گونجنے لگے مجھے بہت غصہ تم ہی سوچو کہ یہ میری شان میں کتنی بڑی گستاخی تھی بس پھر میں ان کو برا بھلا کہتی ہوئی کمپاؤنڈ سے صاف باہر نکل گئی اور اب ایک چوراہے کے پبلک ٹیلی فون بوتھ سے تمہیں کال کر رہی ہوں۔''

''اچھا اب کال کر چکی ہو تو میں ڈس کنکٹ کر دوں کیونکہ بہت کام پڑا ہوا ہے۔''

''تمہاری مرضی۔'' تھریسیا کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔
عمران نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا لیکن میز کے پاس سے ہٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ یکے بعد دیگرے کئی کالیں آئی تھیں اور مختلف ذرائع سے اسے تھریسیا کے فرار کی اطلاع دی گئی تھی۔
تھریسیا پر لکھے گئے ناولوں میں تقریباً سب ہی میں ابن صفی نے اسے ایک چالاک، شاطر اور دھوکے باز حسینہ کے روپ میں پیش کیا ہے وہ بہروپ بدلتی ہے دھوکے دیتی ہے سیکرٹ سروس کے لوگوں کے درمیان کسی بھی روپ میں موجود رہتے ہوئے بھی پہچانی نہیں جاتی اور اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔
ایک تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس کردار کے بارے میں بیان کر رہا ہے اس کے مزاج سے واقف ہو اس کے لیے اس کردار کا بغور مشاہدہ کیا ہو حتیٰ کہ اسے اس کے سوچنے کا انداز تک معلوم ہو یہ بات اس وقت زیادہ اہم ہوتی ہے جب وہ کسی ایک خاص نقطہ نگاہ کے لوگوں کا ذکر کر رہا ہو یا کسی خاص ملک کے لوگوں کا رہن سہن بیان کر رہا ہو۔ ابن صفی کے اکثر ناولوں میں منظر کشی اور کرداروں کا نقشہ بہت اچھا کھینچا گیا ہے غیر ممالک کی منظر کشی یوں کی گئی ہے جیسے وہ وہاں خود موجود رہے ہوں حالانکہ پاکستان بننے کے بعد جب وہ ہجرت کر کے یہاں آئے تو پھر کبھی پاکستان سے باہر نہیں گئے یہ ان کے عالم کا طلسم تھا کہ وہ نقشہ اس خوبی سے کھینچتے تھے جیسے خود وہاں موجود ہوں (اس کی مثالیں عمران کا لندن کا سفر یا افریقہ کے جنگلوں کا بیان ہو)
ان کے کردار عمران، سنگ ہی، فریدی اور تھریسیا انہی کی طرح پر تجسس نظر آتے ہیں ابن صفی کے ناولوں میں جہاں سچائی اور قانون کی بالادستی کا بیان ہے وہیں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے کرداروں کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے ان کا قاری ان کے توسط سے جانتا ہے کہ ان کے کردار کیسے سوچتے ہیں ان کے قاری شاید کبھی تھریسیا کا کردار نہ بھلا سکیں جس کے بتانے اور بیان کرنے میں انہوں نے خاص مہارت کا مظاہرہ کیا ہے تھریسیا جوئی تھری بی کہلاتی ہے ایک الگ دنیا میں رہتی ہے جس کے لیے ابن صفی نے ایک تخیلاتی جزیرہ زیرو لینڈ کے نام سے بنایا ہے جہاں وہ مجرموں اور معصوم لوگوں کو قید کر کے جرائم کی تعلیم دیتی ہے زیرو لینڈ دنیا والوں کے لیے ناقابل تسخیر ہے کبھی کبھی سنگ ہی اور تھریسیا مل کر بھی کام کرتے نظر آتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ دنیا کے کسی کونے میں بھی کسی جرم کی ابتدا کرنے پر عمران کو اپنے مدمقابل پاتے ہیں جو ہر لمحہ ان کے ارادوں سے باخبر ہوتا ہے۔
وہ دنیا کے واحد ادیب ہیں جن کے کرداروں پر بہت سے لوگوں نے لکھنے کی کوشش کی اور آج بھی کر رہے ہیں ابن صفی خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔
''یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسے لئے منتخب کی کہ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح مہیا کرتا رہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا رہوں میرے کردار خود بھی قانون کا احترام کرتے ہیں اور قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔
لیکن میرے خیال میں محض جاسوسی ناولوں کا پھیلاؤ اس مشن کی کامیابی کے لیے کافی نہیں ملکی قوانین

کی تعلیم کا انتظام عوامی پیانے پر ہونا چاہیے ایسا نصاب وضع کیا جانا چاہیے کہ ابتدائی مدارج سے ہی قانون کی تعلیم شروع کی جاسکے۔ (بھیانک آدمی)

اپنے تخلیق کردہ تھریسیا کے کردار پر ابن صفی نے بہت سے ناول لکھے جن میں پہلا ناول ''کالے چراغ'' تھا جو 1956ء میں لکھا گیا پھر بالترتیب درندوں کی بستی، الفانسے، ظلمت کا دیوتا، خون کے پیاسے، پیاسا سمندر، سہ رنگی موت، شوگر بینک، متحرک دھاریاں، جونک اور ناگن، ہلاکت خیز، زہریلی تصویریں، زیبرا مین اور جنگل کی شہزادی ہیں۔

ان کا یہ کردار ان کے نام کی طرح لازوال ہے جسے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا جاتا رہے گا جو عمران کے عشق میں ایک بہادر حسینہ کے ساتھ ساتھ ایک ماہر جنگجو قاتلہ بھی ہے جسے اپنے حریف پر کبھی رحم نہیں آتا جو نت نئے طریقوں سے حریفوں کی زندگی چھیننے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن عمران کے لیے سب کچھ تیاگنے کو تیار ہے۔

❁……❁……❁……❁……❁……❁

ابن صفی کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

روبینہ تبسم

جاسوسی ادب میں ابن صفی ایک ایسا معتبر ترین نام ہے جن کی مقبولیت کو اردو کا کوئی اور ناول نگار نہیں پہنچ سکا، انہوں نے اپنے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کی گہری پرتوں کو جس طرح کھولا ہے اس پر فرائڈ کے نظریات کا اثر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے یوں تو ادب میں فرائڈ سے قبل بھی انسانی جنسیات اور نفسیات کا ذکر تھا تاہم اس ضمن میں فرائڈ کا اہم کام یہ ہے کہ اس نے انسانی جنسیات کو ایک باقاعدہ ''علم'' کی شکل میں پیش کیا فرائڈ کے نظریات کے وجود میں آنے سے قبل ذہنی عوارض میں مبتلا مریضوں کو پاگل قرار دیا جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اس بات کی تحقیق کی کہ دماغی اور امراض کی وجہ مریض کی وہ ناآسودہ خواہشات ہیں جو لاشعور میں چھپ کر تلاطم برپا کرتی ہیں فرائڈ نے ان کو گرفت میں لانے کے لیے بہت سے طریقے اپنائے اور اسی طریق کار کو اس نے تحلیل نفسی یعنی (Psychanalysis) کا نام دیا فرائڈ کا بنیادی نظریہ انسان کی جنسی ونفسانی قوت (Libido) ہے جو ہمہ وقت اپنے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہے اس کا ماننا تھا کہ انسان کے اندر پیدا ہونے والی ہر خواہش کے پیچھے اس کا اعصابی تناؤ کام کرتا ہے اور جب یہ تناؤ کسی طرح دور ہوتا ہے تو پھر اس کی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے انسانی اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ مثبت یا منفی، ان دو متضاد رویوں کو فرائڈ کی اس دو اصلاحات کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے جس میں پہلا Life Instinct (جبلت حیات Eros) ہے اور دوسرا Death Instinct (جبلت موت Thanatos) ہے۔

Life Instinct میں انسان ایسی مثبت خواہشوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو اس کو قوت بخش زندگی کی جانب گامزن کرتا ہے مثلاً جنس، محبت، تہذیب، ترقی وغیرہ جبکہ death Instinct میں انسان ہمیشہ منفی خواہشوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے مثلاً قتل وغارت گری، خودکشی Incests (تزویج محرمات) ظلم، استحصال، جارحیت (Aggression) وغیرہ اس معروضے کو سگمنڈ فرائڈ کی کتاب سے اخذ کی ہوئی چند سطور کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔

Our Speculation Have Suggested that Eros Operates from the begning of life and appears as a life instinct in opposition to the death instinct which was brought in to being by the coming to life of inorgnic sbustance

وہ لوگ جن کے اندر نارمل افراد کے بالمقابل جنسی غیر ہم آہنگی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا شمار بھی Death Instinct (رجحان موت) میں ہوتا ہے یہ افراد اپنی تسکین خود اذیتی و دیگر اذیت کوش طریقوں سے کرتے ہیں، ان کے لیے فرائڈ نے Sadism (اذیت دہی) اور Macoshism (اذیت کوشی) جیسی وسیع اصطلاحیں استعمال کی ہیں Sadism میں مبتلا انسان اپنی ذاتی تسکین دوسروں کو نوچنے کھسوٹنے، بیجا تکلیف پہنچا کر اور بعض اوقات قتل کر کے حاصل کرتے ہیں جبکہ Masochism میں انسان خود اپنی ذات کو تکلیف کا نشانہ بناتا ہے اور اسی میں لذت محسوس کرتا ہے اذیت دہی اور اذیت کوشی میں مبتلا یہ افراد (Borderline Personality Disorder) B.P.D کے زمرے میں آتے ہیں یہ ایک قسم کا دماغی مرض ہے جس میں انسان کو اپنے اوپر بہت کم اختیار ہوتا ہے بنا سوچے سمجھے اچانک کوئی بھی کام کر گزرتے ہیں مزید ان کا موڈ بھی بہت جلد بدلتا ہے۔

ناول ''پتھر کی چیخ'' کی عورت ''لیڈی جہانگیر'' ایک خطرناک ایذا رسا (Sadist) ہے اس کردار کے اندر Nymphomania (جنسی بوالہوسی) جیسے رجحانات موجود ہیں۔ (Hypersexuality is Know as nymphomania when in females and satyriasis when in males) یہ ایک ایسی دولت مند بیوہ عورت ہے جو اپنے شوہر کی موت کے بعد ایک طاقت ور گروہ بناتی ہے اس گروہ کے آدمی اس کے لیے نوعمر لڑکوں کو پکڑ کر لاتے ہیں وہ ان سے اپنی ہوس کی آگ ٹھنڈا کرتی ہے اور پھر اس کے لیے نوعمر لڑکوں کو پکڑ کر لاتے ہیں وہ ان سے اپنی ہوس کی آگ ٹھنڈا کرتی ہے اور پھر ان کو درندوں کی طرح نوچ کر قتل کر ڈالتی ہے۔

لیڈی جہانگیر کی حیوانیت کو مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھیے۔

''ایک نوجوان لڑکے کی برہنہ لاش پڑی تھی اور اس کے قریب لکڑیوں کا ایک ڈھیر جل رہا تھا یہ لاش پچھلی لاشوں سے مختلف نہیں تھی اس کے جسم پر بھی نوچنے کھسوٹنے کے نشانات تھے اور گردن کسی چھری سے ریتی گئی تھی کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ جاری تھا۔''

اس جنون کو ابن صفی کے مشہور کردار کرنل فریدی کے ان الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

''یہ ایسا ہی جنون ہے اور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شہوانی جذبات اپنی انتہائی منزلیں طے کر رہے ہوں اس وقت مکمل تسکین کے لیے خون کی پیاس بڑھ جاتی ہے آدمی درندگی پر اتر آتا ہے بعض صورتوں میں تسکین کے بعد بھی مزید تسکین کے لیے اس قسم کی حیوانیت درکار ہوتی ہے۔''

ناول ''بے گناہ مجرم'' کا کردار ''پرویز'' لیڈی جہانگیر کی طرح نہ تو جنسی جنون میں مبتلا ہے اور نہ ایسا ہوس پرست ہے جو عورتوں کو اپنے جنسی جنون کا نشانہ بنائے لیکن حالات نے اس کو ایسا Sadist بنا دیا ہے کہ وہ مادہ پرندوں کو مار کر سکون حاصل کرتا ہے اور اس کے اس جذبہ تسکین کو ہم انتقامی سکون بھی کہہ

سکتے ہیں اور جنسی سکون بھی، واقعہ یوں ہے کہ پرویز کی بیوی جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا اس کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اب وہ ایک چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہر وقت انتقام لینے کے لیے تیار رہتا ہے اور اس آگ کو بجھانے کے لیے وہ جو طریقے اپناتا ہے وہ ایک نفسیاتی مریض ہی کر سکتا ہے وہ اپنی بیوی کی ہم شکل ربر کا ایک مجسمہ بنواتا ہے اور ہر روز کمرے میں جا کر اس مجسمے کو مارتا ہے اس کی بیوی کو گئے ہوئے تین سال ہو چکے تھے لیکن اس کے رویے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی ان برسوں میں اس کے نوکروں نے اسے ہنستا تو دور مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا اس کی اذیت دہی مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہو سکتی ہے۔

''وہ بعض اوقات پائیں باغ میں جال کر لگا کر ننھے ننھے پرندے پکڑتا، پھر ان میں سے نروں کو چھوڑ دیتا لیکن مادہ پرندوں کو ایسی اذیتیں دے کر مارتا کہ رانو کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ ان کا پر نوچ کر انہیں ایسی جگہ ڈال دیتا جہاں چیونٹیاں بکثرت ہوتیں پھر وہ گوشت کے ان لوتھڑوں کی پھڑک اتنی محویت سے دیکھتا جیسے اس کی روح نور کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو۔

تتلیوں کو پکڑ کر ان کے پروں کو گوند سے چپکا دیتا اور پھر ان کے ننھے ننھے پیروں کو ایک ایک کر کے بلیڈ سے کاٹتا، درختوں پر دوڑتی ہوئی گلہریوں پر چاقوؤں سے نشانہ لگاتا اور نوکیلے پھلوں والے چاقو ان کے جسموں سے گزر کر شاخوں میں پیوست ہو جاتے اور وہ اسی طرح پھنسی ہوئی پھڑ پھڑاتی اور کربناک آوازیں نکالتی رہتیں۔''

سادیت کے متضاد مساکیت میں بھی **Paraphilia** (جنسی پرورژن) ذہنیت والے افراد مبتلا ہوتے ہیں عموماً یہ جذبہ عورتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے محبت میں مبتلا عورت کا عاشق اس کی طلب سے کم پیار کرتا ہے تو وہ تحقیر ذات **(Self Disgust)** میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو سزا دینے پر اکساتی ہے یہ ایک طرح سے **Self Defeating Personality Disorder** ہے جس کو **Masocist Personality Disorder** کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اس مسئلہ کو فرائڈ کے نظریہ کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جس کا تجزیہ ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔

Masochism Comes Under our Observation In Three Forms as a condition imposed on sexual exvtation as an expression of the feminine nature and as a norm of behaviour

فرائڈ نے مساکیت کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے جو جسمانی تکلیف کی انتہائی منزلوں پر دلالت کرتا ہے ناول ''شعلہ سیریز'' (پہلا شعلہ، دوسرا شعلہ، تیسرا شعلہ، جہنم کا شعلہ) کی عورت ''تاریہ'' ایک ایسی جنسی مریضہ ہے جس کی شہوت دشمنوں کے نرغے میں بھی جاگ جاتی ہے یہ اپنے جسم پر پڑنے والی چوٹوں سے جنسی تسکین حاصل کرتی ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔

''شائیں، چمڑے کا چابک خلا میں چکرایا تاریہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔'' میں یہیں تمہاری کھال اتار

دوں گا۔" تاریہ کار کی طرف بھاگی، حمید پیچھے سے شراپ...... شراپ چابک برساتا رہا۔ یہاں تو اسے اچھا خاصا بہانا ہاتھ آیا تھا تاریہ کے لیے ایذا رسانی کی تجویز خود ڈاکٹر سلمان ہی نے پیش کی تھی اگر تاریہ فی الحقیقت مساکسٹ تھی تو ساری دنیا میں اس سے بہتر کلاسیکل مثال ملنی دشوار تھی۔

تاریہ کچھ نہ بولی اب وہ اس انداز میں مزے لے لے کر ہولے ہولے کراہ رہی تھی جیسے کوئی اس کا بدن دبا رہا ہو، پھر دفعتاً خاموش ہوکر اس طرح کانپنے لگی جیسے سردی لگ رہی ہو۔

ابن صفی کے ناولوں میں رجحان موت (Death Instinct) میں مبتلا کرداروں کی کمی نہیں ہے جو مختلف النوع نفسیاتی Complexes کے شکار ہیں یہ تخریبی ذہنیت والے کردار اپنی نت نئی ایجادات، ایٹمی اور نیوکلیئر آلات کی دریافت سے پوری دنیا میں اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتے ہیں یہ اپنے مشینی تجربات میں انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھانے میں دریغ محسوس نہیں کرتے ڈاکٹر سلمان (شعلہ سیریز) جیرالڈ شاستری (جنگل کی آگ)، ویلسن (موت کی آندھی)، ڈاکٹر سڈلر (برف کے بھوت) وغیرہ اسی نوع کے کردار ہیں۔

البتہ ایسی صورت میں جب دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں رکاوٹیں پیش آئیں تو اس وقت سادیت "مساکیت" میں تبدیل ہوجاتی ہے نیز ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے اندر ایذا طلبی اور ایذا رسانی دونوں یہ رجحانات موجود ہوتے ہیں ایسے افراد کے لیے فرائڈ نے Sado-Masochism کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

فرائڈ کے مطابق انسان کی متضاد اور پیچیدہ نفسیات کے پیچھے بچپن کی تلخ زندگی کا بہت بڑا ہاتھ ہے عہد طفولیت کی محرومی ہی ایسی وجوہ ہیں جو انسان کی زندگی میں کڑواہٹ گھولتے ہیں اور اس کو حیوانیت پر مجبور کرتے ہیں ایک بچے کے دماغ میں لاشعوری طور پر وہ ساری باتیں بیٹھ جاتی ہیں جو اس کی فطرت کے خلاف ہوں اور پھر زندگی کے ہر موڑ پر یہ اس کو پریشان کرتی ہیں۔

عمران سیریز کے تین ناولوں "دلچسپ حادثہ" "بے آواز سیارہ" اور "ڈیڑھ متوالے" کا "ہمبگ دی گریٹ" ایک ایسا ہی متضاد شخصیت کا مالک کردار ہے جس کے اندر بچپن کی محرومی نے حد درجہ Complexes پیدا کردیا ہے پیدائش کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی ماں مرگئی تھی اور جن لوگوں کے ہاتھوں اس کی پرورش ہوئی انہوں نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا جبکہ وہ اپنے بچوں کو معمولی شرارت پر مار دیا کرتے تھے لہٰذا مار کھانے کی خواہش اس کے دل و دماغ میں گرہ بن کر اٹک گئی اب اس کی شدید تمنا یہ تھی کہ وہ کسی عورت کے ہاتھوں پٹ جائے ایک دن اس کی یہ مراد "روشی" نامی ایک طوائف کے ہاتھوں پوری ہوجاتی ہے جب وہ غصے میں اسے مار بیٹھتی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہوجاتا ہے ہمبگ کو "روشی" کے چہرے پر ممتا کا نور نظر آنے لگتا ہے اب وہ ہمیشہ اسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔

"ہمبگ" کبھی معصوم اور مظلوم نظر آتا ہے تو کبھی خطرناک درندہ، کبھی خود کو دنیا کا بادشاہ کہتا ہے تو کبھی حقیر ترین شئے کبھی کہتا ہے کہ مجھے کشت و خون سے نفرت ہے میں پیار کے میٹھے گیتوں کا پجاری ہوں وہیں دوسری جانب وہ لوگوں کا قتل بھی کرتا ہے نفسیاتی طور پر اس کے اندر Delusion (فریب خیال) اور مالی خولیا جیسے رجحانات پنپنے لگتے ہیں عموماً ایسے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے چاروں طرف سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے

بہر حال وہ ایک ایسا زبردست مجرم بن جاتا ہے جو پوری انسانیت سے بدلہ لینا چاہتے ہیں اوران سب سے پیچھے اس کے ماضی کا ہاتھ ہے۔جس نے اس کو مجرم ہی نہیں بلکہ ایسا جنسی بے راہ رو بنا دیا جس کے اندر عجیب و غریب خواہشات پیدا ہونے لگی ہیں مثلاً وہ چاہتا ہے کہ لڑکیاں اس کے کوبڑ پر سواری کریں۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آؤ......میرے کوبڑ پر بیٹھ جاؤ اور اسی طرح آگے پیچھے جھولتی رہو جیسے اونٹ پر سواری کرتے ہیں۔''

جھولو......جھولو...... کبڑا موج میں آکر اور زیادہ بلبلانے لگا۔

ہائے ہائے...... کبڑا کراہا بس اسی طرح جھولتی رہو اس کے بعد وہ پھر اونٹوں کی طرح بلبلانے لگا تقریباً دس منٹ تک یہی کیفیت رہی یعنی کبڑا کراہتا اور بلبلاتا رہا اور ''روشی'' بھی ''کھی کھی'' کر کے ہنستی رہی۔

''علامہ دہشت ناک'' کا علامہ ایک ایسا منفی کردار ہے جس کا پورا وجود انتقام کا مجسمہ بن چکا ہے اس کا ماننا ہے کہ دنیا صرف ذہین لوگوں کے لیے ہے اور باقی سب کو وہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا دراصل اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ماں باپ سمیت اس کے پورے گھر کو جلا دیا گیا تھا چونکہ اس وقت وہ بچہ تھا لہٰذا لاشعوری طور پر اس کے دماغ میں انتقام کی آگ شعلہ زن تھی۔تاہم اب بھی وہ کسی دشمن کو مارنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو ایک روتا بلکتا بچہ بن جاتا ہے اور چلا چلا کر اپنے ماں بابا کو پکارنے لگتا ہے یہ علامہ کی زندگی کا وہ سچ ہے جس سے دور جانا اس کے لیے ناممکن ہے خواہ وہ کتنا ہی خونخوار درندہ کیوں نہ بن جائے۔

ناول ''پیاسا سمندر'' کی شمی کو بچپن میں وہ آزادی کبھی نہیں ملی جو ایک بچے کی خواہش ہوتی ہے وہ نہ کھل کر ہنس سکتی تھی اور نہ بلند آواز میں گفتگو کر سکتی تھی کیونکہ اس کے سائنسٹسٹ والد ڈاکٹر داور کا خیال تھا کہ ''آدمی کو کسی بھی اسٹیج میں آدمیت کی حدود سے نہ نکلنا چاہیے۔'' لہٰذا وہ بڑی ہونے کے بعد بھی بچوں کی طرح حرکتیں ہے اور ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اور اب بھی ایسی دنیا کی خواہش مند ہے جہاں وہ از سر نو بچہ بن جائے۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔

''عورت مرد سب مل کر ناچتے، گاتے اور خوشیاں مناتے تھے ان میں اکثر طرح طرح کے سوانگ بھی بھرتے اور شمی ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی پھر اسے اپنی حماقت پر افسوس ہوتا وہ سوچتی کہ وہ بھی کتنا گھٹیا ذوق رکھتی ہے سوانگ بھرنے والوں کے لچر اور لوچ جملے سن کر ہنسنا کم از کم اس کے شایان شان تو نہیں مگر وہ کرتی بھی تو کیا وہ تو ایسے مواقع پر اس بری طرح از خود رفتہ ہو جاتی کہ وہ خود کو بھی اسی طبقہ کی ایک فرد تصور کرنے لگتی تھی۔

فرائڈ نے Psychosexual Development کی پانچ Stages بتائی ہیں (۱) Oral (زبانی/ دہانی) (۲) Anal (مقعد) (۳) Phallic (لنگ) (۴) Latency (دبا ہوا) (۵) Genital (اعضائے تناسل)۔ پانچویں Stages میں لڑکے لڑکیوں میں آپسی جنسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کچھ نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہم جنسی محبت (Homosexuality) میں مبتلا ہو جاتے ہیں فرائڈ نے اس ہم جنسیت کے پیچھے عہد طفولیت کے بیجا روک ٹوک کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

اس ضمن میں ساجدہ زیدی رقم طراز ہیں۔

''فرائڈ نے طفلی جنسیت پر بہت زور دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سن بلوغ کے بہت سے مریضانہ

اعمال اور کامپلیکس وغیرہ عہد طفولیت میں جنسی رجحانات پر بے جا روک ٹوک کا نتیجہ ہوتے ہیں اس روک ٹوک سے جو گھٹن پیدا ہوتی ہے وہ اپنا اظہار بالواسطہ طریقوں سے کرتی ہے۔
عام طور پر لڑکیوں میں ہم جنسی محبت وہاں پائی جاتی ہے جہاں ان کو مخالف جنس سے آزادانہ ملنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے لیکن اب آزادانہ ماحول میں بھی یہ رجحان تیزی سے پھیل رہا ہے ناول ''دوسرا پتھر'' کی کردار ''کلارڈکسن'' لڑکیوں کی جانب کشش محسوس کرتی ہے پہلے ایک انڈونیشی لڑکی سے محبت کرتی تھی اس کے بعد وہ ایک دوسری لڑکی ''شہلا'' کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے وہ شہلا کے متعلق کہتی ہے ''بہت دنوں سے جب سے اسے دیکھا ہے وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''
درداصل اس کی اس حرکت میں جو نفسیاتی گرہ پوشیدہ ہے اس کا تعلق ماضی سے ہے وہ یہ کہ اس کا باپ بہت اذیت پسند تھا اور اس کی ماں کو بہت ستاتا تھا لہٰذا ''کلارا'' کو دنیا کے سارے مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔
ابتدا میں فرائڈ اپنے مریضوں کا علاج Electrotherapy, Massage and Therapeutic bath کے ذریعے کرتا تھا لیکن مریضوں اس طریقے سے مکمل طور پر شفایاب نہیں ہو پاتے تھے لہٰذا وہ ہپناٹزم (Hyphotism) کی جانب متوجہ ہوا اس میں وہ مریضوں کو تنویمی حالت (Hypnotic Trance) میں رکھتا اور پھر اس کے اعصابی بیماری کی علامت ختم کرنے کا مشورہ دیتا ''ہپناٹزم'' ہپناسس سے بنا ہے جس کا مطلب ہے نیند یا خمار، یہ مریض کے لاشعور کو بیدار کرنے کا ایک طریقہ ہے اس میں معمول (جس پر عمل کیا جا رہا ہو یعنی مریض) اپنے اطراف واکناف سے بے خبر ''بیداری اور خواب کی کیفیت'' میں چلا جاتا ہے محض عامل کے لیے اس کے کان کھلے رہتے ہیں ہپناٹزم گرچہ مریضوں کے علاج کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معمول مکمل طور پر عامل کا تابع اور اس کے ہر حکم کا محتاج ہو جاتا ہے بہت سے تخریبی مائل ذہنیت کے لوگ اس کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں ناول ''شعلہ سیریز'' کا ڈاکٹر سلمان انہیں میں سے ایک ہے جو اپنے مطلب کے لیے اپنی بہن ''ساحرہ'' کو ہپناسس کر کے اس کی زندگی برباد کر دیتا ہے وہ اس کو سب سے چھپا کر تنویمی حالت میں رکھ کر اس کے خوابیدہ آواز سے جرائم پیشہ لوگوں کو مسحور کر کے انہیں اپنے ساتھ ملاتا ہے اور جرائم پیشہ افراد یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی روح ہے جو پوری دنیا پر حکومت کر رہی ہے ساحرہ فلسفہ میں ایم اے ہے لیکن ڈاکٹر سلمان نے اس حد تک اس کے دماغ پر قبضہ کر لیا ہے کہ وہ عالم بیداری میں ایک لفظ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتی۔
اقتباس ملاحظہ ہو۔
''لائبریری کے فرش پر کتابوں کا ڈھیر لگائے دو زانو بیٹھی انہیں گھورتی رہتی اگر کوئی اس کی اس مصروفیت میں مخل ہوتا تو اس کے چہرے پر اندرونی کرب کے آثار صاف نظر آنے لگتے۔
اور وہ کہتی سہیل مجھے بتاؤ ان کتابوں میں کیا ہے؟
میں پاگل ہو جاؤں گی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں یہ ساری کتابیں پڑھ چکی ہوں لیکن میں ان کا ایک لفظ بھی نہیں سکتی۔
اب وہ ایک ایسی نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے جو کبھی فلسفیانہ انداز میں باتیں کرتی ہے تو کبھی بالکل پانچ سال کی بچی طرح حرکتیں کرنے لگتی ہے کبھی بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتی ہے تو کبھی کتے کے بچہ کو اپنا

بچہ کہتی ہے وہ حمید سے کہتی ہے کبھی کبھی مجھے ایسا لگنے لگتا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں میری اپنی آوواز مجھے اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے اور جب حمید کہتا ہے اس کا ذکر ڈاکٹر سلمان سے کرے تو وہ کہتی ہے کہ وہ جانتے ہیں لیکن ''جب وہ مجھ سے کہنے لگتے ہیں کہ تم سو رہی ہو گہری نیند میں سو رہی ہو تمہاری زندگی گہری ہوتی جا رہی ہے اس وقت اس وقت میں یہ محسوس کرتی ہوں اور پھر شاید مجھے سچ مچ نیند آ جاتی ہے'' (ص۔۲۰۵) ڈاکٹر سلمان کی یہ ساری باتیں دراصل معمول کو تنویمی حالت میں کرنے کا ایک طریقہ ہے (اس طریقہ کو ایما یعنی Suggustion کہا جاتا ہے اور جب مریض تنویمی حالت میں پہنچ جاتا ہے تو اس کیفیت کو بامعد تنویم ایما (Post Hypnotic Suggestion) کہتے ہیں) غرض کہ ساحرہ جب بھی اپنی کوئی الجھن ڈاکٹر سلمان کو بتاتی ہے تو وہ اس کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے تا کہ سب کچھ بھول جائے۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنی کتاب ''سائنس پارے'' میں شعور کی غفلت کی تین درجات کا ذکر کیا ہے (۱) خفیف نیند (Light Hypnosis) اس میں معمول پوری طرح ہوش میں رہتا ہے (۲) گہری نیند (Deep Hypnosis) اس میں معمول بے خبر ہوتا ہے اور جاگنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہتا (۳) تنویمی سکتہ (Hypnotic coma) اس میں معمول گہری نیند میں ہوتا ہے نہ تو اسے کچھ یاد رہتا ہے اور نہ بعد میں اسے کچھ یاد دلایا جا سکتا ہے۔

ساحرہ کی دماغی حالت کو دیکھتے ہوئے ہم اس کو اسی آخری تنویمی سکتہ کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں بہر حال اس کی حالت اب اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ وہ عالم بیداری میں بھی خواب کی کیفیت میں چلی جاتی ہے حمید سے اس کو انسیت ہے تاہم اس محبت میں وہ عجیب و غریب خواہشیں کرتی ہے وہ اس سے کہتی ہے۔ ''کاش تم ایک ننھے سے بچے ہوتے میں تمہیں تھپک تھپک کر سلاتی تمہارے لیے ننھے ننھے سوئٹر بنتی، ننھے ننھے کپڑے چھوٹی سی قمیص...... ننھی سی نیکر اس کی آنکھیں پھر ویسی ہی ہو گئی تھی جیسے بیداری میں خواب دیکھ رہی ہو۔

فرائڈ کے مطابق انسانی ذہن کے تین طبقے ہیں شعور، لاشعور، تحت الشعور اس کے نزدیک ان اقسام میں لاشعور کو فوقیت حاصل ہے جو تمام تر دبی کچلی جبلتوں کا مخزن ہے انسان اپنی جس خواہش کو دبا لیتا ہے وہ اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہے اور پھر وہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر اپنی اس دبی ہوئی خواہش کی تکمیل کرتا ہے مجرد آدمی کا جانوروں کو پالنا اور ان سے بالکل انسانوں کی طرح محبت کرنا اور خیال رکھنا اسی کا نتیجہ ہے اس رویے سے ایک غیر شادی شدہ آدمی اپنی زندگی کے خلا کو پر کرتا ہے ناول ''اشاروں کا شکار'' کی عورت ''لیڈی پرکاش'' اپنے گھر میں ایک ''چمپانزی'' کے ساتھ رہتی ہے وہ اس سے اس طرح محبت کرتی اور خیال رکھتی ہے جیسے وہ اس کا محبوب ہو حتیٰ کہ جب وہ مرتا ہے تو پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔

غرض یہ کہ جاسوسی ادب میں ابن صفی کی حیثیت ایک Legend کی ہے انسان ایک کمزور اور نازک مخلوق ہے لہٰذا ذرا سی بے توجہی سے ہزاروں نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے انہوں نے اپنے کرداروں کی انہی الجھن کے اسباب و عوامل کو سمجھنے کی کوشش ان کے یہ کردار مزید غور و فکر کے متقاضی ہیں اس تاثر کا ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ نفسیات پر گہری اور باریک نظر ہی ان کے ناولوں کو فکر بلندی عطا کرتی ہے۔

❀....❀....❀....❀....❀....❀

سائنس فکشن کی تخیلاتی اڑان اور ابن صفی

روبینہ تبسم

سائنس فکشن ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس کی بنیاد سائنسی تصورات ونظریات پر قائم ہے۔ اس میں سائنس کے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے ایسی کہانی تشکیل دی جاتی ہے جو حقیقی بھی ہو سکتی ہے اور تخیلی بھی۔ یہ مستقبل میں ہونے والی سائنسی ایجادات اور سماج پر پڑنے والے اثرات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس صنفت کے ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سائنس اور ادب جیسی دو متضاد موضوع کے درمیان بنی دوری اور خلیج کو ختم کرتا ہے۔

Encycilopedia britanica میں سائنس فکش کی تعریف یوں ہے۔

"A Form of fictkon that deals primarily with the impact of actual of imagined science upon"۱

(''کہانی کی ایک قسم جو خصوصاً سماج یا فرد پر سائنس کے حقیقی یا تخیلات اثرات سے متعلق ہو۔'')

Oxford Advanced leamer's Dictionary میں سائنس فکشن کی تعریف یوں درج ہے۔

" A type of book, film/movie dtc. that is based on imagined scientific discoveries of the future, and often deals witha space reavel and life on other planets"۲

انسان نے جب سے اس دنیا میں قدم رکھا، روز اول سے ہی آسمان، زمین، سوج، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ وغیرہ کو دیکھ کر سوالات اٹھائے۔ یہ سب کیوں ہیں؟ کیسے ہیں؟ کیا ہیں؟ وغیرہ۔ سائنس نے اپنے تخیل اور تجربے سے انہیں سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ چونکہ ادب میں دو اور دو چار والا فارمولا نہیں اپنایا جاتا لہٰذا اس میں کیوں ہے؟ کا سوال قائم نہیں کر سکتے۔ البتہ ایک ادیب اپنے غور و فکر، مشاہدہ اور تخیل کی پروازے ایسے انکشافت کرتے ہے، جس تک سائنس کو پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ Jules verne جیسے ادیب کا تخیل ہی تھا جس نے حقیقت میں انسان کے چاند پر پہنچنے سے قبل اپنے ناول کے ہیرو کو چاند پر پہنچا دیا تھا۔ فرنچ زبان میں لکھا ہوا یہ ناول 1865 میں منظر عام پر آیا اور اس کا انگریزی ترجمہ From the earth to moon کے نام سے ہوا، جب کہ چاند پر پہنچنے والا دنیا کا پہلا انسان 1966ء میں گیا۔ ناول کا سب سے اہم اور خاص نقطہ یہ ہے کہ اسمیں ہیرو کو چاند تک پہنچنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہی ساری پریشانیاں ان خلابازوں کو پیش آئیں جو حقیقت میں چاند پر گئے۔ نیز اس میں بعض ایسے انکشافات کی جانب توجہ مبذول کرائی گہی ہے جو حقیقت کے بالکل قریب ہے، وہ یہ کہ فضا سے نکلتے ہی ہر چیز بے وزن ہو جاتی ہے اور اس پر زمین کی کشش کام نہیں کرتی ہے۔

یوں تو سائنس فکشن مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے سائنسی ایجادات کے ممکنات کا نام ہے لیکن یہ

بات بھی پیش نظر رہے کہ مصنف اگراپنی بات کو ٹھوس سائنسی طریقے سے پیش کرتا ہے تو بھلے ہی وہ مستقبل میں حقیقت کا روپ نہ لے سائنس فکشن ہی کہلائے گا۔ مثلاً H.G Wells کا ناول The invisible man کا ہیرو اپنے آپ کو غائب النظر کرنے کے لیے چند سائنسی تجربے اپنا کر اپنے جسم کے تمام خلیوں (Cells) کو Transparent کر لیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ آج تک کوئی انسان اپنے آپ کو غائب نہیں کر سکا ہے اس ناول کو سائنس فکشن کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ اور سبب یہ ہے کہ اس کا ہیرو محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کے داستان ''طلسم ہوش ربا'' کے کردار عمرو کی طرح چادر لپیٹ کر یا پھر Harry Potter کی طرح چوغہ پہن کر غائب النظر نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مقصد کیلیے سائنسی طریقے اپناتا ہے۔ دراصل سائنس فکشن اور Fantasty میں یہی فرق ہے کہ Fantasy میں سارا کھیل جادو کا ہوتا ہے۔ یہاں کسی بھی عجیب و غریب بات کے لیے کوئی جواز نہیں ہوتا۔ جن، پریاں، اسم اعظم، یہ سب طلسمی کہانیوں اور داستانوں کے موضوعات ہیں جن پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔

"Isaac Asimov was a famous science fiction write. He once said that scienc fiction is possible but fantasy is not"

سائنس فکشن نگار کی سوچ ہمیشہ ''کیا ہوگا اگر............؟'' پر قائم ہوتی ہے مثلاً سورج نکلنا بند کر دے تو لوگوں کی زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی؟ زمین گردش کرنا بند کر دے تو کائنات کا کیا حال ہوگا؟ غرض کہ سورج کی حدت بڑھجانا، زمین کا درجۂ حرارت بڑھ جانا، مشینوں کا انسانوں کی طرح عمل و حرکت کرنا، انسانوں کا پرندوں کی طرح آسمان میں اڑنے لگ جانا، اڑن طشتریاں، مصنوعی سیارے، ٹائم مشین، کلوننگ (Cloning) یادداشت ختم کر دینا، روبوٹ، سائبر جرائم، جسم کی منتقلی وغیرہ سائنس فکشن کے اہم وضوعات ہیں۔ ادب کی اصناف میں اس صنف کی اہمیت اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ ہمیں آنے والے کل کی جھلک دکھاتا ہے، مزید برآں مستقبل کے اچھے اور برے ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ محض یہی نہیں بلکہ کبھی سایسا بھی ہوتا ہے کہ سائنسداں سائنسی ناولوں کی مدد سے تجربات کرتے ہیں۔ مثلاً ''ڈبلو اسپالٹ ہولز'' H.G Wells کے ناول The invisibe man کو بنیاد بنا کر مردہ جانوروں کے اضاء کو غائب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

سائنس فکشن کے آثار سب سے پہلے دوسری صدی عیسوی کے شاہی مصنف Lucian of Samosata کی یونانی زبان میں تحریر کی گئی تصنیف True History میں دکھائی دیتا ہے۔ جس میں Aliena، خلائی سفر اور سیاروں کے درمیان جنگوں کا ذکر ہے۔[۲]

البتہ پہلا حقیقی سائنس فکشن نگار Jules Veme (1828-1905) ہے، جس کو Father of science fiction کہا جاتا ہے۔ اس نے 55 سائنس فکشن ناول لکھے۔ دوسرا ناول نگار H.G Wells ہے، جس کا پہلا سائنس فکشن ناول The time (1895) Machine ہے۔

یہ سچ ہے کہ مغربی زبانوں جیسے جرمنی، انگریزی، فرانسیسی اور روسی کے بالمقابل اردو میں سائنس فکشن لکھنے والوں کی کمی رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ چند ہی ادیبوں نے مل کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ جیسے اظہار اثر، ابن صفی، مظہر کلیم، اشفاق احمد، منشی ندیم صہبائی، اکرم الہ آبادی وغیرہ کے نام اس ضمن میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اور یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اردو میں Pure Science Fiction (خالص سائنس فکشن) کی سرے سے کمی رہی ہے۔ ابن صفی جیسے مقبول ترین ناول نگار نے بھی جاسوسی پلاٹ میں سائنس فکشن کی آمیزش کے ساتھ لکھا ہے۔ اسی لیے ان کے ناولوں کو جاسوسی سائنس فکشن کہا جاتا ہے۔ دراصل ابن صفی ہی اس نوع کی کہانیوں کے موجود ہیں۔

Spy-science-fic میں ایسے پاگل اور سنکی سائنسداں ہوتے ہیں جو اپنی نت نئی ایجادات کے ذریعے پوری دنیا پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ یہ ہزاروں انسانوں کو اپنے تجربات کا نشانہ بنا کر مار ڈالتے ہیں۔ ان کے پاس عجیب وغریب ہتھیار اور مشینیں ہوتی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا (ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ ہتھیار اور adgets مستقبل میں حقیقت کا روپ دھار لیں) آخر میں ناول کا ہیرو اپنی نت نئی تراکیب اور محنت سے ان جرائم پیشہ افراد کو روکتا ہے اور ان کی تمام تر مشینوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

جاسوسی ادب میں ابن صفی کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انہوں نے روایت سے ہٹ کر لپنکالی۔ وہ اپنے ناولوں میں سنسنی خیزی اور طلسماتی کائنات کا ماحول نہیں بناتے بلکہ سائنسی انکشافات و ایجادت سے جرائم کی دنیا کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے موضوع، مواد، زبان و بیان، اسلوب اور شگفتہ تحریروں اور برجستہ محاوروں سے لاکھوں کی تعداد میں اردو پڑھنے والے پیدا کیے۔ ۲۶ سال کی عمر میں جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہونے والے اس ناول نگار نے ۲۴۵ ناول لکھے جس میں سے ۱۲۵ جاسوسی دنیا سیریز کے ناول ہیں اور ۱۲۰ عمران سیریز کے اور ان میں سے کم از کم ۷۰ ناولوں کو سائنس فکشن ناول کہا جا سکتا ہے۔

''موت کی آندھی'' (۱۹۵۳ء) ان کا پہلا سائنسی فکشن ناول ہے جس میں جرمنی کا مشہور سائنسداں ویمن (جو ہٹلر کی موت کے بعد پراسرار طریقے پر غائب ہوگیا تھا) ایک ویرانے میں تباہ کن ہتھیار بنانے کا تجربہ کرتا ہے۔ اس نے کلب الشیاطین علاقے کے چٹان میں ایک ایسا بھیانک کتا بنایا ہے جس کے منہ سے شعائیں نکلتی ہیں اور وہ اپنے اطراف میں بسنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اس نے چٹان میں ایسی مشین لگا رکھی ہے جس میں ساحلی علاقہ صاف نظر آتا ہے۔ نیز ساحل پر لوہے کے آدمی ٹہلتے جو کسی بھی آس پاس بھٹکنے والے انسان کو چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ ان آدمیوں خو سائنسداں مشین سے کنٹرول کرتے ہیں۔ ابن صفی کا مشہور زمانہ کردار کرنل فریدی اپنی کدوکاوش اور ذہانت سے یہ پتہ لگا لیتا ہے کہ کتے کے منہ سے نکلنے والی یہ شعائیں ریشمی لباس پر اثر نہیں کریں اور پھر یہیں سے ان کی بربادی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ بنیادی نکتے کی بات یہ ہے کہ ابن صفی نے اس ناول میں فولادی انسان کا تصور پیش کیا ہے۔ یو Robot سے ملتی جلتی لوہے کے آدمیوں کا تصور کافی پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن باقاعدہ طور پر سب سے پہلا digital اور programmed روبوٹ ۱۹۵۴ء میں George Devol نے ایجاد کیا۔

بوڑھا سائنسداں اپنے بنائے ہوئے فولادی آدمیوں کے ضمن میں فریدی سے کہتا ہے۔
''یہ آدمی اسی اسکیم کے تحت بنے تھے جس کے تحت جرمنی کے مشہور اور خود بخود اڑنے والے بم اور ہوائی جہاز بنائے گئے تھے۔ ان میں ریڈیائی طریقوں سے قوت عمل پیدا کی جاتی تھی لیکن افسوس کہ یہ اب بیکار ہو چکے ہیں۔''۵
ناول ''طوفان کا اغوا'' میں بھی فولادی آدمی کا تصور پیش کیا گیا ہے جسے چند بدمعاش دور بیٹھ کر کنٹرول کرتے ہیں۔ ابن صفی کے ایک دوسرے ناول ''برف کے بھوت'' میں ڈاکٹر سڈلر نامی آدمی اپنی حیرت انگیز اور خطرناک ایجادات کے ذریعے پوری دنیا میں اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتا ہے۔ وہ اب تک نہ جانے کتنے انسانوں کو اپنے تجربات کا نشانہ بنا چکا ہے۔ جو کوئی بھی اس کے کام میں رکاوٹ بنتا ہے ان کو وہ بے رحمی سے مار دیتا ہے۔ دراصل اس کے مارنے کے طریقے میں ہی اس کی ایجاد چھپی ہوئی ہے۔ اس نے برف کے بھوت بنا کر لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا تاکہ کوئی اس کی لیبارٹری تک نہ پہنچ سکے۔ وہ کہتا ہے۔
میری ایجاد دیکھو! لوگوں نے بم بنائے جن کے پھٹنے سے درجہ حرارت بڑھ جائے گا اور میں جو ایجاد کر رہا ہوں اس سے درجہ حرارت نقطۂ انجماد پر پہنچ جائے گا۔ ہر چیز جم جائے گی۔ چلتے ہوئے آدمیوں کا خون بند ہو جائے گا۔ ان کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ مرنے میں صرف چند سیکنڈ لیں گے۔''۶
آج انسان اپنی ایجادات میں اتنا آگے آ چکا ہے کہ اب ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم، حیرت انگیز شئے نہیں رہیں۔ اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ تسیل (Coning) کے ذریعے جانور بھی بنا لیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک ایک بھیڑ اور دو بندر تخلیق کئے جا چکے ہیں۔ (اس میں کسی بھی جاندار کی تولید کے لیے غیر جنسی (asexual) تولید کا سہارا لیا جاتا ہے) قصہ کہانیوں کے قاری کو کلوننگ بھی اچنبھے میں نہیں ڈال سکی، کیونکہ اس موضوع پر کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں انسان اتنی ترقی کر لے کہ بھیڑ بندروں کی طرح اپنی مرضی کے مطابق انسان بنانا شروع کر دے لیکن حقیقت میں ابھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ جب کہ ابن صفی کے ناول ''خطرناک لاشیں'' میں ایک سائنسداں دل کی دھڑکن بند ہونے کے سبب مرنے والے انانوں کے دماغ شفاف کر کے انہیں از سر نو زندہ کر دیتا ہے۔ نئی زندگی پانے والے یہ انسان اپنا ماضی بھلا کر بالکل ایک نئی شخصیت کے طور پر جنم لیتے ہیں۔ اپنے اس تجربے کے ذریعے وہ برے انسانوں کو اچھے انسانوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ناول ''جنگل کی آگ'' میں جیرالڈ شاستری جیسے سائنسداں نے قوت حیات ونمو پر قابو پالیا ہے۔ جیرالڈ اور اس کے ساتھیوں نے ایسی مشینیں ایجاد کی ہیں جس میں وہ انسانوں کو بن مانس مین تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس میں دو لنگڑے آدمیوں کو مشین کے ایک بہت بڑے رولر میں ڈالا جاتا ہے اور پھر دوسری مشین کا رولر کھول کر ایک بندر ڈالتے ہیں۔ ان آدمیوں کے جسموں کا بہترین حصہ بن مانسوں کا جزو بند جاتا ہے اور ان کا فضلہ کولتار کی شکل میں باہر آ جاتا ہے اور پھر یہ تینوں مل کر ایک بھیانک اور طاقت ور جانور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔
جیرالڈ فریدی سے کہتا ہے۔
''ہم اپنے مطالعے میں جدید ترین ہیں۔ ہم نے قوت حیات ونمو پر قابو پالیا ہے۔ مسٹر حمید کے کاندھوں پر رینگتی ہوئی چوہیاں منٹوں میں خرگوش کے برابر ہو سکتی ہیں...... ہمارے پاس ایک نہیں درجنوں

ایسی ایجادات ہیں جیرالڈ نے کہا دور کیوں جاؤ اسی کو لے لو جس میں تم مقیم ہو۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم کسی زمین دوز کمرے میں بیٹھے ہو۔ یہاں نہ کوئی کھڑکی ہے اور نہ کوئی روشندان پھر بھی تمھیں گھٹن نہیں محسوس ہوتی۔"ے

فریدی جیرالڈ کے ان ایجادات سے متحیر تھا کیونکہ واقعی سے اس کمرے میں گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اس نے ننھے منے معنوعی سورج بنا رکھے تھے اور اس کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کی روشنی اور حرارت میں وہ ساری نیچرل خوبیاں موجود ہیں جو قوت حیات و نمو کے لیے ضروری ہیں۔

ابن صفی نے اپنے تخیل سے "زیرولینڈ" جیسے عجیب و غریب ملک کا تصور پیش کیا جو بہت ترقی یافتہ ہے اور دنیا کے کسی بھی نقشے میں موجود نہیں ہے۔ اس کے باشندے اپنی ترقی اور ایجادات کے ذریعے پوری دنیا پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں ایسے پرندے پائے جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں کیمرہ فٹ ہوتا ہے۔ یہ ایسی اڑن طشتریاں استعمال کرتے ہیں جنہیں دوسرے ممالک کے لوگ راڈار اسکرینوں پہ نہیں دیکھ پاتے اور دھوکے میں ان کو **Aliens** سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ایسے آلے ہیں جو گولیوں کا رخ بدل دیتے ہیں۔ اس ملک کی سربراہ ایک حسین اور خطرناک عورت "تھریسیا بمبل بی آف بوہیما" ہے جو اپنے شاطر اور چالباز دماغ سے عمران جیسے جینئس آدمی کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ ابن صفی کنے "زیرلینڈ سیریز" ناولوں میں الیکٹرو گیس جیسی نئی چیز سے متعارف کرایا جس کی کرنیں ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہیں۔ نیز ناول مین تھریسی کے ہاتھوں میں جو لیزر گن دکھائی دیتا ہے وہ بھی اسی کی ایک قسم ہے جس کے سہارے وہ کہیں سے بھی فرار ہو جاتی ہے۔ لیزر شعائیں یا الیکٹرو گیس جیسی چیز ابن صفی کے ناول میں اس وقت دکھائی دیتی ہے جب ان کا مکمل وجود نہیں ہوا تھا، یعنی یہ سب ابھی اپنے تجرباتی مراحل میں ۔ بعد میں سائنس دانوں نے لیزر (**laser**)، (**Light amplificatnon by stimulated emisssion of rediation**) (تضخیم روشنی بہ تہیج اشہار شعاع) کے مکمل ایجاد سے اس خواب کو حقیقی میں بدل دیا۔

"لیزر ایک ایسا بصری منبع ہوتا ہے جو فوٹونز کا ایک اہم بستہ **Coherent** ستون خارج کرتا ہے۔"۸

سب سے پہلا لیزر **Theodore H Maiman** نے **1990**ء میں بنایا۔ اس کی مدد سے سخت سے سخت چیز کو آسانی سے کاٹا جا سکتا ہے۔ دور تک پھیلے ہوئے جنگلات ان شعاؤں کی مدد سے کٹ سکتے ہیں۔ جنگلوں میں ان کی مدد سے جہاز اور میزائل اڑایا جاتا ہے۔ چونکہ لیزر شعاع کسی بھی مادے کے ایٹم سے اور کسی بھی رنگ کی بنائی جا سکتی ہے لہٰذا سائنسدانوں کے لیے اس کا حصول مشکل نہیں رہا اور وہ بہت جلد حسب منشا لیزر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کا استعمال ہزاروں کاموں کے لیے ہونے لگا ہے۔ مثلاً **Barcode Scanner, Optical Disk Drivers, Laser Printer** حتیٰ کہ علاج و معالجے کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔ مثلاً **Laser surgery** وغیرہ۔

اسی طرح شعلہ سیریز (پہلا شعلہ، دوسرا شعلہ، تیسرا شعلہ، جہنم کا شعلہ) کے ناولوں میں تباہی مچانے

والوں کے پاس ایسی مشینیں ہیں جو چٹانوں کو لاوا بنا دیتی ہیں۔ان ناولوں میں ایسی کرنوں کا بھی استعمال ہے جن سے محض چمڑے کا لبادہ اوڑھ کر ہی بچا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک عجیب و غریب مشین جو پتھر کو اس طرح تراشتی چلی جاتی ہے جیسے موم کے ڈھیر سے نار گزرتا چلا جائے۔اس کی شکل زمین کھودنے اور برابر کرنے والی آہنی گاڑی کی سی تھی لیکن اس میں لگا ہوا طویل اور دھار دار پھل انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔جب وہ پتھر پر لگتا تو آگے کی سرخی سفیدی میں تبدیل ہو جاتی اور پھر وہ پتھر میں دھنستا چلا جاتا۔"9

باقی تمام ایجادات کے مثل سائنسدانوں نے دوربین ایجاد کی جس سے ہم اپنے سے کئی میل کے فاصلے کی چیزیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس دوربین سے ہم فلکی اجسام کی انہیں چیزوں کو دیکھ سکتے تھے جو روشنی خارج کرتی ہوں۔دیگر شعائیں خارج کرنے والی چیزوں کو دیکھنے سے قاصر تھے۔۱۸۸۷ء میں ہرٹز (Hertz) نامی ایک سائنسدان نے ریڈیائی لہریں دریافت کر کے اس کمی کو پورا کر دیا۔اس طرح ریڈیائی دوربین ایجاد ہوئی اور اس کی مدد سے خلا میں کئی اہم چیزوں کی دریافت ہوئی۔ابن صفی کے "ہمبگ دی گریٹ" سیریز کے تین ناولوں دلچسپ حادثہ، بے آواز سیارہ، ڈیڑھ متوالے میں ایک ڈاکٹر داور نامی سائنسداں ہیں۔ان کے پاس ایسا ٹیلی اسکوپ کیمرہ ہے جس کی مدد سے وہ چاند کے کرے کی فضا تک کی تصویریں لے سکتے ہیں۔یہ ایسا کیمرہ ہے جس کو سائنس بھی ابھی تک دریافت نہیں کر سکتی ہے۔ناول میں اس کی مدد سے انہوں نے بے آواز مصنوعی سیارے کی دریافت کی تھی جس کا سگنل صرف اسی ملک کے لوگ ہی پکڑ سکتے تھے کیونکہ باقی دنیا کے لیے وہ سیارہ بے آواز تھا۔

دنیا کا پہلا مصنوعی سیارہ Sputnik-1 سوویت یونین نے ۱۹۵۷ء میں ایجاد کیا۔جب سے ہزاروں کی تعداد میں مصنوعی سیارے آئے اور ان سے ہر طرح کا کام لیا گیا، مثلاً ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ کے پروگرام دور دور تک کے علاقوں میں نشر کیا گیا اور سمندر، پانی کے ذخائر، دور تک پھیلے ہوئے جنگلات اور قدرتی وسائل کا جائزہ لیا گیا۔ابن صفی کے ناول "پیاسا سمندر" میں مصنوعی سیاروں کے متعلق عجیب و غریب ایجادات سامنے آتی ہیں جن کا حقیقی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔یہ پورا ناول ڈاکٹر داور کے سائنسی تجربات سے پر ہے۔وہ سمندر سے ایٹمی توانائی حاصل کر کے اب تک کئی تجربات کر چکے ہیں۔اسی باعث "زیرولینڈ" ان کا دشمن بن چکا ہے۔یہاں کے باشندے ان کی بہت سی چیزیں چرانا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر داور ان سے آگے نکل جائیں۔ناول میں ہر ملک مصنوعی سیاروں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے لیکن ایک دن زیرولینڈ کا سیارہ ناقابل یقین بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے اور فضا میں ایسا چمکدار لکیر بناتا ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کا سیارہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔

لکیروں کے متعلق ڈاکٹر داور عمران کو بتاتے ہیں۔

"تم نہیں سمجھ سکتے! ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔وہ لکریں اب بھی وہیں قائم ہیں اور نہ جانے کب تک قائم رہیں! ویسے ان لکیروں میں اب چمک باقی نہیں رہی۔وہ اب دھوکے کی ٹٹی ہیں۔اگر تم اتنی بلندی پر پرواز کرنے والے کسی جہاز میں بیٹھ کر جاؤ تو صحیح سلامت واپس نہ آ سکو گے جہاز کے پرخچے

اڑ جائیں گے۔"[10]

غرض یہ کہ ابن صفی محض Spy-fic کے موجود نہیں تھے بلکہ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے "سائنس فکشن" خواص کے ساتھ ہی عوام تک پہنچانے کا سبب بنے۔ وہ جس وقت لکھ رہے تھے اس وقت چونکہ پاپولر ادب کے پڑھنے کا بہت رواج تھا۔ لہٰذا یہ ناول ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے لیکن آج ٹی وی کے دور میں لوگ کتابیں پڑھنا بھول گئے۔ اگر آج پاپولر ادب کا رواج ہوتا تو اردو میں سائنس فکشن لکھنے والوں کی کمی نہیں ہوتی، کیونکہ آج سائنس کا دور ہے اور نئی نسل بہت تیزی کے ساتھ سائنس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اس لیے عین ممکن تھا کہ سائنس کے ساتھ سائنس فکشن بھی ترقی کرتا لیکن افسوس اب نہ ابن صفی رہے اور نہ ہی پاپولر ادب کے قاری۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

ابن صفی کی معنویت آفاقی تناظر میں

روبینہ تبسم

ابن صفی وہ پہلے جاسوسی ناول نگار ہیں جنہوں نے جاسوسی ناول کو زندگی کے گوناگوں مسائل سے جوڑ کر اس کو ایک مستحکم وژن عطا کیا انہوں نے اپنے ناولوں کو اس مقام تک پہنچایا کہ وہ محض تفریحی، عوامی اور بازاری ادب نہ ہو کر ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن گیا، وہ سر آرتھر کانن ڈائل اور اگاتھا کرسٹی کی طرح تجسس، حیرت اور استعجاب تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ تفریح و تفنن کے پیرایے میں زمانے کی دکھتی رگ کو چھیڑا اور سماجی نفسیاتی پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے مزید برآں موجودہ طرف حکومت اور سماج کے ٹھیکیداروں کی قلعی کھولنے کے ساتھ روز بروز کی بڑھتی الجھنوں، بدعنوانیوں اور کرپشن پر بھرپور لکھا ہے بنیادی بات یہ ہے کہ انہوں نے سماج کا مشاہدہ صرف عصری مسائل کے تناظر میں نہیں کا ی بلکہ ہر زمانے کے مسائل کو سامنے رکھا اور اسی شعور نے ان کو ایک ایسا آفاقی ناول نگار بنایا جن کی تحریریں ہر دور سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ انہیں کسی بھی زمانے میں کوئی بھی زبان نظر انداز نہیں کر سکتی ہے ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع جرم ہے اور یہ ایک ایسا آفاقی لفظ ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے یعنی جرم کی ابتدا تو اسی وقت سے ہو گئی جب قابیل نے ہابیل کا قتل کیا تھا اور اب تک جرائم کی نہ جانے کتنی شکلیں پیدا ہو چکی ہیں جس کا لامتناہی سلسلہ گھٹنے کے بجائے دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اس طرح ابن صفی نے ایک ایسا موضوع اپنا جس کی بنیاد ٹھوس اور مستحکم ہے۔

ابن صفی کی پیدائش 26 جولائی 1927ء کو ہوئی ان کے جاسوسی ناولوں کا سلسلہ 1952ء سے شروع ہوا پہلا ناول "دلیر مجرم" 1952ء میں ماہنامہ نکہت پبلی کیشنز الٰہ آباد میں "جاسوسی دنیا" کے تحت شائع ہوا ان کا آخری ناول "صحرائی دیوانہ" (فریدی، حمید سیریز) وہ بچپن ہی سے داستان "طلسم ہوش ربا" سے بہت متاثر تھے۔

ایک جگہ انٹرویو میں کہتے ہیں۔

"طلسم ہوش ربا اور رائیڈر ہیگرڈ نے آپس میں گڈمڈ ہو کر میرے لیے ایک عجیب سی ذہنی فضا تیار کر دی جس میں ہمہ وقت ڈوبا رہتا۔

ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس۔

انہوں نے 125 (جاسوسی دنیا، فریدی، حمید سیریز) اور 120 (عمران سیریز) کے علاوہ بلدان کی ملکہ معزز کھوپڑی، شمال کا فتنہ، تزک دو پیازی، پرنس سلی، اب تک تھی کہاں؟ وغیرہ جیسے شاہکار ناول بھی لکھے عمران سیریز کی ابتدا 1955ء میں ''خوف ناک عمارت'' سے ہوئی محض یہی نہیں بلکہ افسانے شاعری اور ''طغرل فرغان'' کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے علاوہ ازیں ''سنکی سولجر'' ''پرکاش سکسینہ'' اور ''عقرب بہارستانی'' کے نام سے چند تحریریں منظر عام پر آئیں ساتویں جماعت میں انہوں نے پہلا افسانہ ''آرزو'' لکھا جو ہفت روزہ ''شاہد'' (بمبئی) میں چھپا۔ آٹھویں اور نویں جماعت میں پہنچ کر ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی، شاعری میں اسرار تخلص کرتے تھے کم سنی میں انہوں نے بہت سی دیش بھکتی کی نظمیں لکھیں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے آٹھ ناول مکمل طور پر ان کے نہیں تھے یا تو پلاٹ انگریزی سے لیے تھے یا پھر کردار، ہاں یہ ضروری ہے کہ فریدی اور حمدی جیسے لازوال کردار انہیں کے ذہن کا اختراع تھا 1959ء میں انسانی نفسیات پر ایک کتاب ''آدمی کی جڑیں'' لکھنا شروع کیا جوان کی بیماری کی وجہ سے مکمل نہیں ہو پایا۔

ابن صفی پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کے ناولوں کا اسٹرکچر (ساخت) تجسس اور استعجاب پر قائم ہے لہٰذا جب تک مجرم پردے کے پیچھے رہتا ہے قاری کی دلچسپی اس میں برقرار رہتی ہے لیکن جیسے ہی وہ پردہ سیمیں پر آتا ہے ان ناولوں کے متعلق سوچنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا ہے نہ تو قاری کے ذہن میں کسی کردار کی کوئی نفسیاتی کشمکش رہتی ہے نہ ہی کوئی سماجی و معاشرتی مسائل اور نہ ہی تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی نیز یہ بھی اعتراض ہوا کہ چونکہ ان ناولوں کا انجام پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے (یعنی ہر حال میں فریدی، حمید اور عمران کے حصے میں کامیابی آئے گی) لہٰذا ان میں یکسانیت نظر آتی ہے وہی جرائم کے کھوج کا طریقہ، وہی تشدد اور قتل کا معمہ وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ناولوں کا انجام بالکل واضح رہتا ہے تاہم اس اختتام کے پس پردہ ابن صفی کا ایک خاص مقصد پوشیدہ ہے وہ ہر صورت میں باطل کے سامنے حق کی فتح دکھا کر قاری کے دل میں جرائم کے تئیں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں یہی سبب ہے کہ انہوں نے ہر نوع کے جرائم پر قائم کی بالادستی دکھائی ہے گرچہ انہیں ان مجرموں سے ہمدردی ہے جو ظلم اور ناانصافی کے سبب اس غلط راہ پر چلنے پر مجبور ہوئے تاہم وہ ان کا ساتھ کبھی نہیں دیتے کیونکہ دنیا میں ظلم کے شکار افراد کی کمی نہیں ہے وہ مجرم کو مجرم ہی سمجھتے ہیں خواہ اس کے محرکات کچھ بھی ہوں۔

وہ خود کہتے ہیں۔

''یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے جاسوسی ناولوں کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔

انہوں نے اپنے ناولوں میں محض جرائم کی مختلف صورتیں ہی نہیں بتائیں بلکہ ان وجود سے بھی آگاہ کیا جس کی وجہ سے کردار اس کے مرتکب ہوئے نیز اس انحطاط پذیر اور انتشار زدہ اور زوال آمادہ حال کے اسباب کی جانب بھی توجہ دلائی ہے ''ناول پر اسرار وصیت'' میں ایک بھائی ناصر جب دوسرے بھائی مخدوم کی جان لینا

چاہتا ہے تو اس وقت فریدی مخدوم سے ناصر کے جرم کے سلسلے میں ایک نکتے کی بات کہتا ہے ملاحظہ ہو۔
''حرام خوری آدمی کو سنگ دل بنا دیتی ہے فریدی نے کہا اگر ناصر اپنی روزی خود کماتا ہوتا تو اس سے یہ حرکت کبھی سرزد نہ ہوتی قصور سراسر آپ کا ہے آپ کو اسے اپاہج نہ بنانا چاہیے تھا اگر یہ ایک ایماندار آدمی کی طرح اپنی روزی خود کماتا ہوتا تو اس کے بچے شرابی اور جواری نہیں ہو سکتے تھے بے مشقت ہاتھ آئے ہوئے پیسے آدمی کو شیطنیت کی طرف لے جاتے ہیں ناصر محض اس لیے آپ کی جان لینا چاہتا ہے کہ وہ جائیداد کا مالک بننے کے بعد دانش کا قرض ادا کر سکے۔
ابن صفی کا یہ ماننا تھا کہ مستقبل سے مایوسی انسان کو غلط راستے پر لے جاتی ہے اور ایک دوسرے سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ قانون کے محافظوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔
فریدی کس طرح سے جرائم کے اسباب کی جانب توجہ دلاتا ہے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھیے۔
''کرنل صاحب آخر یہ جرائم اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں؟''
''جھلاہٹ کی بنا پر۔'' فریدی بولا۔
''میں نہیں سمجھا۔''
''آبادی بڑھ گئی ہے وسائل محدود ہیں اور چند ہاتھوں کا ان پر قبضہ ہے۔''
''جھلاہٹ والی بات تو رہ ہی گئی۔''
''اسی طرف آ رہا ہوں دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کی آزادی ہے اور عوام کو قناعت پسندی کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔''
ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔
چارہ ہی چارہ ہے اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہو جائے گی ضرورت ہے کہ انہیں قناعت کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی ''خودی'' کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ممالک میں ہوا۔''
ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو۔
''کیا بات ہے؟'' حمید نے پوچھا۔
پتا نہیں یہ آدمیوں کی سوسائٹی ہے یا جانوروں کا ریوڑ اخبار اٹھاؤ تو قتل وخوں اغوا اور عصمت دری کے علاوہ کسی قسم کی خبریں نہیں دکھائی دیتیں۔''
آخر اس کی وجہ کیا ہے۔
مستقبل کی طرف سے بے اطمینانی خود اعتمادی کا فقدان۔
اس کا علاج بھی ہے کوئی؟
کافی علاج ہے مگر یہ دور ہے نئے تجربات کا ایک اسٹیج پر نئے تجربات بھی ختم ہو جائیں گے اس کے بعد پھر اسی دقیانوسی علاج کی طرف دنیا دوڑے گی۔
اعتدال قناعت اور جہد مسلسل

رہا یہ اعتراض کہ مجرم کے سامنے آتے ہی ان کے ناولوں میں تکتے کی کوئی بات نہیں رہ جاتی ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن صفی کی تحریروں میں کون سا ایسا سحر پایا جاتا ہے جو آج بھی ان کو قرات مسلسل کا ہدف بنائے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ اس نکتے کی تفہیم کے لیے ان کے ناولوں کا معروضی مطالعے کی ضرورت ہے تبھی یہ عقدہ کھلے گا کہ انہوں نے محض تحیر اور تجسس کی دنیا آباد نہیں کی بلکہ ایک ایسی دنیا بسائی ہے جو قاری کو غور وفکر اور ادراک پر مجبور کرتی ہے مثلاً ابن صفی نے آج کے انسان کے نت نئے تجربات کے ضمن میں جو نظریات پیش کیے ہیں وہ قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں انہیں اس بات کا بہت افسوس ہے کہ انسان آج اپنی ایجادات سے ترقی کی منازل طے تو کر رہا ہے لیکن وہیں دوسری جانب اپنے اقدار و روایات سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے وہ مصنوعی سیارہ ایجات کر کے چاند تک پہنچ گیا ہے لیکن اپنے معاشرے اور سماج کی پر امن زندگی کے لیے کچھ نہیں کر پایا محض حرص، خودغرضی اور لالچ اس کے اندر سرایت کر گیا۔

ناول ''پیاسا سمندر'' کا ایک کردار ڈاکٹر اور اپنی بیٹی سے کہتا ہے۔

''جانتی ہوں آدمیت کی معراج کیا ہے آدمیت کی معراج یہی ہے کہ آدمی کو داپنے ہی مسائل حل کر لے اگر اس نے مصنوعی سیارہ فضا میں پھینکنے کے بجائے سرطان کا کامیاب علاج دریافت کر لیا ہوتا تو میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کے قدم اس راہ کی طرف اٹھ گئے ہیں جس کی انتہا اس کی معراج پر ہوگی اور اگر اس نے چاند تک پہنچنے کی اسکیم بنانے کے بجائے زمین کے ہنگامے پر امن طور پر فرو کرنے کا کوئی ذریعہ دریافت کر لیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اب یہ سمندر پیاسا نہیں رہے گا بلکہ خود کو سیراب کرنے کی صلاحیت بھی اس میں پیدا ہو چکی ہے۔

آدمی کے حرص اور لالچ کے سلسلے میں ڈاکٹر داور کی زبانی ابن صفی نے کتنی موثر بات کہی ہے مندرجہ ذیل پیرائے میں دیکھیے۔

''خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بلندیوں میں ہوں یا پستیوں میں اف فوہ بے بی آدمی کتنا پیاسا ہے اور کس طرح اس کی پیاس بڑھتی رہتی ہے اور کس طرح وہ خوارج میں اپنے لیے تسکین اور آسودگی تلاش کرتا ہے مگر کیا کبھی اسے تسکین حاصل ہوتی ہے کبھی آسودگی ملتی ہے بلکہ وہ بالکل کسی سمندر ہی کی طرح موج در موج آگے بڑھتا چلا جاتا ہے کبھی چٹانوں کو کاٹتا ہے اور کبھی پہاڑوں میں رخنے پیدا کر کے ان کے پرخچے اڑا دیتا ہے اپنی بے چینی کی وجہ وہ خود ہے اور اپنی تسکین کا سامان بھی اپنے ہی دامن میں رکھتا ہے مگر وہ دوسروں کی پیاس تو بجھا دیتا ہے خود اپنی پیاس بجھانے کا سلیقہ نہیں رکھتا تم اسے پیاسا سمندر کہہ سکتی ہو بے بی جو پانی ہی پانی رکھنے کے باوجود بھی ازل سے پیاسا ہے اور اس وقت تک پیاسا ہی رہے گا جب تک کہ اسے عرفان نہ ہو جائے لیکن ابھی اس میں ہزار ہا سال لگیں گے۔

ان کے ناولوں میں کسی بھی قسم کی پوری ایک تہذیب دکھائی دیتی ہے انہوں نے ناول ''درندوں کی بستی'' میں کوہستانی علاقہ ''شکرال'' کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کے طور طریقوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے یہاں کے باشندوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ بہت صاف ستھرے رہتے ہین اور یہ لوگ گھوڑے کی پشت پر مرنا پسند کرتے ہیں اور اتنا آہستہ چلتے ہین کہ ابن صفی کے الفاظ میں ''ان کے اندازے سے ایسا لگتا جیسے کسی جگہ بیٹھے بیٹھے اٹھنے کے ارادے میں بھی دس پندرہ منٹ صرف کر دیتے ہوں۔'' (ص ۲۳۰) یہاں کی عورتوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں کے مرد کاہل ہیں لیکن

عورتیں ان کے برخلاص بہت تیز طرار ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فرمانبردار اور اطاعت شعار ہیں۔ یہ راگ رنگوں کی شوقین ہیں تاہم ان میں جنسی تشنگی نہیں پائی جاتی ہے ان کے مکانات کے بارے میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان کے مکان بہت چھوٹے ہوتے ہیں دیواریں تو پتھروں کی ہوتیں لیکن چھتیں پھوس کی اور اس کے اوپری سطح پر کھالیں منڈھی ہوتیں بستر ان کا ایسا ہوتا کہ فرش پر پلنگ کی جگہ گھیرے ہوئے لکڑی کی ایک فٹ اونچی دیوار کھڑی ہوتی اور ان کے بیچ چمڑے کے آرام دہ گدیلے پڑے ہوتے۔

ادیبوں کی نظر میں ابن صفی ہمیشہ اس لیے کھٹکتے رہے کیونکہ ادیب ان کی تحریروں کی فطری سادگی اور سادہ لوحی کو برداشت نہیں کر پاتے وہ دوٹوک جوابوں سے زیادہ ان سوالوں کو اہمیت دیتے ہیں جو پیچیدہ پائیدار اور دوررس ہوں یہ بات سچ ہے اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ تفریحی ناول (خواہ وہ ابن صفی کے ناول ہی کیوں نہ ہو) کا قاری اداس نسلیں اور ٹیڑھی لکیر جیسے پر پیچ ناولوں کا بار نہیں اٹھا سکتا اور بہت جلد اس سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے کیونکہ عام قاری زندگی کے مسائل کو اس کے تمام تر ابعاد کے تناظر میں نہیں دیکھ سکتا وہ ادب اس لیے پڑھتا ہے تا کہ اس سے مسرت وحظ حاصل کر سکے نہ کہ اس کے پیش کردہ مسائل میں الجھے البتہ ان معروضات کو بنیاد بنا کر ان کے ناولوں کو ادب کے زمرے سے خارج کرنا اور اس سے صرف نظر کرنا ایک طرح کی ناانصافی ہوگی کیونکہ ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے یہ ناول زندگی کے مسائل پر توجہ دلانے کے ساتھ ہی قاری کے ذہنی تناؤ کو کم کرنے طمانیت کا احساس دلاتے ہی۔

ایک جگہ ابن صفی کہتے ہیں۔

"کچھ احباب کا خیال ہے کہ مجھے مقصدی ادب پیش کرنا چاہیے اور میرا خیال ہے تفریح بجائے خود ایک مقصد ہے کھلے ہوئے ذہنوں کے لیے تھوڑی تفریح مہیا کردینا اگر کسی کے بس میں ہو تو اسے بھی ایک مقدس فریضہ سمجھنا چاہیے اور اس سے قطع نظر بھی میری کہانیاں مقصدی ہی ہوتی ہیں حیات وکائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔

ابن صفی کی آفاقی معنویت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو ناول کے قارئین کا اتنا وسیع حلقہ نہ تو اس سے قبل پیدا ہوا اور نہ ان کے بعد ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناولوں کے مطالعے سے شروع کیا اور ایک ادیب بن گئے اور وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے صرف ان کے ناول پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھی۔

نذیر فتح پوری اپنے انشائیہ "میں اور ابن صفی" میں رقم طراز ہیں۔

"ابن صفی کے جاسوسی ناولون کے مطالعے کے بعد ہی مجھے اردو نثر لکھنے کا حوصلہ ملا ورنہ میں نے اس وقت تک ادب اور تنقید کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔

ابن صفی خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

"آپ اس وقت میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہون۔"

بہرنوع ابن صفی نے اپنی تحریروں سے اصلاح کی شمعیں روشن کیں جنسی لٹریچر کے اس سیلاب کو روکا جو سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ تھا اور جو قاری سے غور وفکر ادراک اور اس کی انفرادی صلاحیتوں کو چھین کر

اس کے ذہن و دل پر منفی اثرات مرتب کر رہا تھا وہ معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کے قائل اور اخلاقی اقدار کے پاسباں تھے وہ ہمیشہ قدیم روایات کو سینے سے لگائے رہے اسی باعث لوگوں نے ان کو دقیانوسی خیالات کا حامی کہا وہ مغربی تہذیب اور وہاں کے آزادانہ ماحول کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے ان کے لا زوال کردار فریدی اور عمران نہ تو شراب کو ہاتھ لگانا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی مخالف صنف کو حرص بھری نظروں سے دیکھتے ہیں حمید گرچہ عورتوں میں دلچسپی رکھتا ہے وہ اپنے حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھتا ہے۔

ان کے آئیڈیل کردار فریدی کی زبان میں ابن صفی کی سوچ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

”قدامت پر پوری طرح جان دینے لگا ہوں عورتوں، مردوں، کے آزادانہ تعلقات کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ جنسی معاملات میں جذبات کی تہذیب ناممکن ہے اس سلسلے میں سائنٹفک بحث قطعی بکواس ہے بچاؤ صرف پابندیوں میں ہے بعض مغربی عالم جنہیں میں گدھا سمجھتا ہوں اس سلسلے میں بڑی سائنٹفک قسم کی بحثیں چھیڑتے ان کا تو ہے کہ پابندیاں جنسی بے راہ روی کو جنم دیتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مغرب کدھر جا رہا ہے وہاں تو اب دونوں جنسوں کے باہمی تعلقات پر کسی قسم کی بھی پابندی نہیں رہ گئی لیکن میرا دعویٰ ہے کہ بعض مغربی ممالک کا ہر پانچواں آدمی جنسی بے راہ روی کا شکار ہے۔

غرض کہ ابن صفی ایک مقبول ناول نگار ہیں اور ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ ان کے ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے مزید متعدد ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کی شہرت کی خاطر ”این صفی“ اور ”ابن صغی“ کے فرضی ناموں سے لکھا اور ان کے جیسے کردار پیش کرنے کی سعی کی اردو کے کئی ڈائجسٹوں میں ان کے کسی ایک ناول کی شمولیت محض اس لیے ہے تا کہ یہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچیں۔ مزید برآں دیگر زبانوں میں ان کے ناولوں کی ڈیمانڈ بڑھی۔ گجراتی، ہندی اور انگلش وغیرہ میں ان کے ترجمے ہوئے لیکن ان کی معنویت کا تعین محض مقبولیت کی بنا پر قائم کرنا صحیح نہیں ہے کیونہ ان کی اہمیت و معنویت کا انحصار سماجی و معاشرتی مواد کے ساتھ ساتھ تخلیقی طرق کار پر بھی ہے ان کی تحریریں محض اس لیے اہم نہیں کہ وہ تھکے تھکے بوجھل لمحات کے لیے اکسیر ہیں بلکہ ان کی اہمیت اس لیے قائم ہے کہ وہ ہر عہد کے انتشار و ابتری اور گرد و پیش کی واقعاتی کائنات سے جڑی ہیں اس نکتے کی تفہیم کے لیے ہمیں ان ناولوں کی جانب از سر نو رجوع کرنا ہوگا تا کہ ان کی تحریروں کی وساطت سے سچائی کے اس اسلوب کو دریافت کریں جو ابن صفی کا خاصہ تھا اور تب ہمیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ ابن صفی وہ قابل فراموش ناول نگار جنہوں نے داستانوی ادب سے آگے بڑھ کر اپنے تخیل کی تربیت سے ایک ایسی حقیقی زندگی کی تصویر پیش کی جس میں چھپے ہوئے سچ کے ہم آج بھی انکاری نہیں ہو سکتے ابن صفی کے شعور کی روشن لکیر اسی بنیاد پر قائم ہے کہ وہ معاشرے میں چند اساسی تبدیلیوں کے تمنائی تھے۔

❁......❁......❁......❁......❁......❁

جاسوسی ناول کا تاریخی و فنی جائزہ

روبینہ تبسم

اردو ادب میں ناول کے فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن جاسوسی ناول کی روایت، تاریخ اور فن وغیرہ پر عموماً بات نہیں کی گئی، البتہ انگلش میں دو چار کتابیں اس موضوع پر دستیاب ہیں۔ یہ بات تو سبھی کے علم میں ہے کہ ناول ہو یا افسانہ دونوں مغربی ممالک کی دین ہیں۔ اسی طرح جاسوسی ناول بھی باقاعدہ

طور پر مغرب میں ہی پروان چڑھا۔ یہ ناول کے وجود میں آنے کے بعد آہستہ آہستہ منظر عام پر آیا۔ اٹھارہویں صدی میں کتابیں اتنی قیمتی چیزیں تھیں کہ عام لوگوں کی پہنچ سے باہر تھیں، محض امیر اور تعلیم یافتہ افراد خریدتے تھے اس لیے بہت کم تعداد میں چھپتیں۔ لیکن والٹر اسکاٹ کے منظر عام پر آتے ہی یہ نظریہ بدل گیا۔ کیوں کہ اتنی زیادہ تعداد میں کتابیں چھپنے لگیں کہ ۱۸۳۷ء سے ۱۹۰۱ء تک صرف برطانیہ میں ساٹھ ہزار ناول چھپ گئے۔ اور اٹھارہویں صدی میں ناول کو ادبی صنف کا درجہ بھی مل گیا۔ اس کو ادبی صنف عطا کرنے میں ڈینیل ڈیفو، رچرڈسن اور ہینری فیلڈنگ وغیرہ کا بہت اہم رول ہے۔

حقیقی زندگی میں جاسوسی کا پیشہ قدیم ترین ہے۔ اپنے ملک وقوم کو مستحکم کرنے اور اس کے تحفظ کیلیے حکمراں ہمیشہ سے دشمن ممالک کی خفیہ راز سے واقف رہنے کے لیے جاسوسوں سے کام لیتے رہے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں چندر گپت موریہ نے پورے ملک میں سراغ رسانی کا جال بچھا رکھا تھا۔ بعد میں مغلوں نے اس کو مزید ترقی دی۔ سکندر اعظم اپنے دشمنوں کے نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لیے جاسوس رکھتا تھا۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں قومی نوعیت کی معلومات کے حصول کے لیے مختلف اصطلاحات اور شعبوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ انٹیلی جنس ایک ایسی ہی اصطلاح ہے جس سے خفیہ معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔

اردو میں لفظ Spy کے لیے جاسوسی کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور Detective کے لیے لفظ تفتیش اور کھوج کا۔ البتہ Detective کا ترجمہ لفظ جاسوس سے بھی ہوتا ہے کیونکہ تفتیش کرنے والا کبھی کبھی اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے جاسوسی بھی کرتا ہے۔ انگلش میں جاسوسی کے لیے لفظ Espionage کا استعمال ہوتا ہے اور Spy دراصل اسی کا ترجمہ ہے۔

"Espionage comes from the French word "Espionnage" mens spying and from "espionner mens to spy"

یہ بات پیش نظر رہے کہ Spy (جاسوسی) اور Detective (کھوج لگانے والا) میں بنیادی طور پر فرق ہے۔ Detective اپنے آس پاس ہونے والا جرائم کی کھوج لگاتا ہے اور ان جرائم کا تعلق اکثر قتل سے ہوتا ہے۔ جب کہ Spying میں ایک ملک کا جاسوس دوسرے ملک کے خفیہ رازوں کا پتہ لگاتا ہے۔ یعنی ایک ملک کو اپنے دشمن ملک کی بہت سی معلومات ویڈیو اور اخبارات وغیرہ سے حاصل ہو جاتی ہیں، لیکن بہت سی خفیہ معلومات ان جاسوسوں کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ فوجی وردی میں ملبوس جاسوسیس کرنے والے کو جاسوس نہیں کہا جا سکتا، بلکہ خفیہ معلومات حاصل کرنے والے عام شہری کو جاسوس کہا جائے گا۔

"Spy- A person who sectetly collects and reports imformation on the asctivites, movements, ang plans of an enemy or competitor"

"Detective fiction is a subgenre of crime

fiction and mystery fiction in which an investigatior or a detective– either professional or amateur-- investiagtes a crome, often murder."

اس میں کوئی باک نہیں کہ ناولوں کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو بہت کم ایسے ناول ہوں گے جس میں جرائم کی تفتیش کے ساتھ جاسوسی عناصر نہ ملتے ہوں۔ مثلاً ابن صفی کے ناولوں کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو عمران، فریدی اور حمید وغیرہ قتل اور اغوا جیسے جرائم کی تفتیش بھی کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر دشمن ملک کی جاسوسی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے زیر نظر مقالے میں Detective اور Spy فکشن پر مشترکہ طور پر بات کی جائے گی۔

جاسوسی کا تعلق جرائم سے بہت گہرا ہے، کیوں کہ وقوف پذیر جرائم اس کے لیے راستہ کھول دیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں مجرموں کی سوانح عمریاں اور خود نوشت سامنے آئیں جس میں ان کی چوری، ڈکیتی اور قتل وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ سوانح عمریاں Newgate کلینڈر کے نام سے جانی جاتی تھیں (دراصل Newgate لندن کی ایک جیل کا نام تھا جہاں یہ مجرم رہتے تھے) پہلا Newgate کلینڈر ۱۷۷۳ء میں ۵ جلدوں میں نکالا گیا۔ اس کلینڈر کی مدد سے جو ناول لکھے گئے ان کو Newgate ناول کہا گیا۔ ان ناولوں کو Old Baily ناول بھی کہا جاتا ہے۔ (یہ لندن کے اس کورٹ کا نام تھا جہاں مجرموں کی سال میں 8 بار سنوائی ہوتی تھی) ناول 'Newgate عناصر کے ساتھ پہلا ناول تھا جس کو Edwrd Bulwer Lyttor نے Paulcliffor ۱۸۳۰ء میں تحریر کیا۔ اس قسم کے ناولوں نے Sensation (حسیاتی) ناولوں کو بہت متاثر کیا۔ اس میں مجرموں کی کہانیوں کے ساتھ رومانیت، حقیقت، نفسیات، جنس، حیرت وغیرہ جیسے عناصر بھی شامل ہوگئے۔ ان ناولوں کا پلاٹ کڈنیپنگ، بلیک میلنگ، دھوکہ، لالچ، Bigamy (خاوند یا جورو کے جیتے جی دوسرا بیاہ کر لینا) اور قتل کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا۔ Newgate اور Sensation ناولوں میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر میں گھر کے باہر ہونے والے جرائم کو بنیاد بنایا گیا اور آخر الذکر میں گھر کے اندر ہونے والے جرائم کو۔ Sensation زیادہ تر خواتین کے ذریعے لکھے گئے جب کہ Newgate مردوں کے ذریعے۔ اور سب سے اہم بنیادی فرق یہ ہے کہ Sensation ناولوں میں جرائم کے علاوہ جاسوسی کے بھی سراغ ملتے ہیں۔ پہلا حقیقی Sensation ناول Wilkie Collins کا "The Women in White" ہے جو جاسوسی عناصر کے ساتھ لکھے گئے ناول کی پہلی مثال ہے۔ Deniel کی کتاب میں شامل شدہ Susanna کی کہانی کو بھی پہلا Detective کہانی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بعد کے Detective فکشن سے الگ ہے۔

الف لیلہ کے تعلق سے مشہور ہونے والی شہرزاد کی کہانی The Three Apple میں بھی جاسوسی عناصر ملتے ہیں۔ اس میں ایک مچھیرے کو ندی میں تابوت ملتا ہے۔ وہ اس کو عباس خلیفہ ہارون رشید کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، ہارون جب اس کو کھولتا ہے تو اس میں ایک عورت کی لاش ٹکڑوں میں رکھی ہوتی ہے۔ تب وہ جعفر بن یحیٰ کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس قتل کی تفتیش کرے۔

اردو ادب میں جاسوسی عناصر ''داستان امیر حمزہ'' میں جابجا نظر آتے ہیں۔ یہ داستان محض ایک مصنف کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کی تصنیف، ترتیب، ترجمہ اور تشہیر میں متعدد ادیبوں کا ہاتھ ہے۔ اس داستان کا پہلا سراغ دکن میں ملتا ہے، جس کو ناصر الدین محمد نے تصنیف کیا تھا۔ لیکن صحیح معنوں میں اس کا آغاز فورٹ ولیم کالج کے تحت ''خلیل علی خان اشک'' نے ۱۸۰۱ء میں کیا۔ اس کا ایک نسخہ نواب مرزا امان علی خان غالب لکھنوی نے ۱۸۵۵ کے آس پاس تصنیف کیا۔ اس کے بعد عبداللہ بلگرامی نے اور آسان زبان میں کر کے ۱۸۷۱ء میں پیش کیا۔ ۴۶ جلدوں کی اس داستان کو موجودہ شکل میں لانے میں شیخ تصدق حسین، محمد حسین جاہ اور احمس حسن قمر کا بہت اہم رول ہے۔ البتہ اس ضمن میں سب سے اہم اور مستند کام شمس الرحمن فاروقی نے کیا ہے۔ اس داستان کی بیشتر جلدیں ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ بنیادی طور پر یہ داستان لشکر اسلام کے شہنشاہ سعد بن کباد اور اسلام کے دشمن خداوندے لقا کی فوج کے درمیان لڑائی کی کہانی ہے۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالار حمزہ ہیں جو مخالف فوج کو شکست دیتے ہوئے طلسم ہوش ربا کی طرف آتے ہیں۔ اس لشکر کے پاس عیاری کا محکمہ ہے جس کے سردار خواجہ عمرو ہیں۔ اس محکمہ میں اور بھی بہت سے افراد ہیں۔ جیسے چالاک، ضرغام، جاسوس بن قراں وغیرہ۔ ان افراد کی جاسوسی سے امیر حمزہ اور اسد غازی طلسم ہوش ربا کو فتح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ طلسم ہوش ربا میں جب بدیع الزماں قید ہو جاتے ہیں تو وہاں پر اسد غازی کے ساتھ ۵ عیار ہوتے ہیں، جو جاسوسی کر کے اسد غازی کو کئی اہم سراغ سے باخبر کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ عمرو عیار اردو میں پہلے کامیاب جاسوس ہیں۔

غرض کہ مذکورہ بالا کسی بھی کہانی اور کتب کی میں Spring کو مرکز نہیں بنایا گیا ہے بلکہ ان کہانیوں میں جاسوسی عناصر کی محض جھلک دکھائی دیتی ہے۔ باقاعدہ طور پر جس میں Spying کو مرکز بنایا گیا ہے وہ James Fenimore Cooper کا ناول "The Spy" (۱۸۲۱ء) ہے اور Detective فکشن کا باقاعدہ آغاز یڈگر ایلن پو کی کہانی "The Murders in the Rus Morgus" (۱۸۴۱ء) کے ذریعے ہوا۔

ابتدا میں Gothic (خوف Horror) اور Adventure (مہم جوئی) ناول نے جاسوسی ناول کو بہت متاثر کیا۔ اول الذکر ناولوں میں خون کے دھبے، کٹے ہوئے سر، ہڈیوں کے ڈھانچے وغیرہ سے خوف پیدا کیا جاتا ہے۔ ان ناولوں کا مقصد گرچہ Terror پیدا کرتا ہے لیکن اس میں بھی جرائم اور رازوں کے theme ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ صنف انگلینڈ میں ہوریس والپول (Horace Walpole) کی کتاب ''آٹرینٹو کا قلعہ (The Coaste of Otranto)'' (۱۷۶۴ء) سے شروع ہوئی۔ اس کا سیکنڈ ایڈیشن "A Gothic Story" کے نام سے چھپا۔ اس کے بعد اس قسم کے ناول لکھنے والوں کو ایک نئی راہ مل گئی۔ Clara reeve نے "The Old English Baron" (۱۷۷۸ء) لکھا اور Becktord نے "History of the Caliph Vathek" تصنیف کیا۔ علاوہ ازیں کئی مصنفین نے اس میں طبع آزمائی کی۔ مثلاً ریڈ کلف، ایڈگر ایلن پو، لیوس براؤن وغیرہ۔ Advnture ناولوں میں جرم، سائنس فکشن اور Fantacy (خیال) وغیرہ

بھی ملتا ہے۔ چارلس ڈکنس کا ناول "A Tale of Two Cities" ایڈونچر ناول ہے۔ اردو میں "داستان امیر حمزہ" دراصل ایک Adventure داستان ہے جس میں امیر حمزہ کی مہم جوئی دکھائی گئی ہے۔ اس داستان میں بھی جاسوسی کے علاوہ جادو اور Fantacy کے عناصر دکھائی دیتے ہیں مثلاً امیر حمزہ پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا ہے، وہ صاحب اسم اعظم ہیں، ان کے پاس ایسا گھوڑا ہے جو اشک دیوزاد ہے، وہ نعرہ لگاتے ہیں تو ۶۴ کوس تک آواز جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اردو ادب میں جاسوسی عناصر دستان امیر حمزہ میں جاتے ہیں۔ داستان امیر حمزہ کی تصنیف کے طویل عرصہ بعد انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے شائع ہونا شروع ہوئے اور پھر بیسویں صدی کے آغاز سے اس قسم کے ناولوں میں لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی اور یہ دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ اردو میں بھی اوریجنل جاسوسی ناول منظر عام پر آنے لگے۔ جیسے قیسی رامپوری وغیرہ نے کئی اہم جاسوسی ناول تحریر کئے انہوں نے رومانی، نفسیاتی اور Adventure ناول بھی لکھے ہیں، ان کے رومانی ناولوں میں عمو، حور، فرزانہ، خیانت اور آبرو وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں "دوسری جنگ عظیم کے ہولناک واقعات" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور انگریزوں کے خلاف آزادی کا جھنڈا لہرانے والے ٹیپو سلطان پر باقاعدہ "ٹیپو شہید" کے نام سے ناول لکھا ہے۔ ان کے جاسوسی ناول کا نام "طلسمی فوارہ" ہے۔ اور یہی وہ پہلا جاسوسی ناول ہے جس کا ابن صفی نے مطالعہ کیا۔ ویسے اردو میں جاسوسی ناول کا باضابطہ آغاز رسوا کے ناولوں سے ہوا "خونی جورو"، "بہرا کی رہائی"، "خونی شہزادہ" وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔ جاسوسی ناولوں کی ابتدا میں ایک اہم نام فیروز دین مراد کا بھی ہے، لیکن انہوں نے صرف انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے پر اکتفا کیا۔ بعد میں ظفر عمر وغیرہ نے جاسوسی ناول تحریر کئے اور پھر جاسوسی ناولوں کا پورا ایک سلسلہ چل نکلا۔ یوں تو اس صنف کو عروج پر پہنچانے میں کئی اہم ادیبوں کا ہاتھ ہے جیسے ابن صفی ایچ اقبال، اکرم اللہ آبادی، عارف مارہروی، اظہار اثر، سراج انور وغیرہ، لیکن اس ضمن میں ابن صفی، اظہار اثر، اور اکرم الہ آبادی کا نام خصوصاً اہمیت کا حامل ہے۔ اظہار اثر نے کم از کم ایک ہزار ایسے سائنسی، جاسوسی اور سماجی ناول لکھے ہیں جن کی سحر انگیزی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ان کا پہلا ناول "ناگن" پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سائنٹیفک مزاج پانے والے اظہار اثر نے سائنس فکشن پر کئی اہم ناول لکھے ہیں جیسے آدھی قیامت، بیس ہزار سال بعد، مشینوں کی بغاوت وغیرہ۔ اکرم الہ آبادی نے ۱۹۵۳ سے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز کیا اور "خان"، "بالے" جیسا مشہور کردار تخلیق کیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان ان کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ہر خاص و عام میں ان کے ناول پسند کئے گئے۔ "جنکشن بلارا" ان کا ایک بہت اہم ناول ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جاسوسی ناول کا آغاز صحیح معنوں میں ابن صفی کے ہاتھوں ہوا جو اس کے موجد اور امام ہیں۔ ان کا پہلا ناول "دلیر مجرم" (مارچ ۱۹۵۲ء) نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد نے "جاسوسی دنیا" کے تحت شائع کیا۔

جاسوسی ناول کے فن کو موضوع بحث بنایا جائے تو اس میں بھی تقریباً وہی اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں، جو ناول کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً قصہ، پلاٹ، کردار، زبان و بیان، نقطہ نظر اور ماحول وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود ان اجزائے ترکیبی کو جاسوسی ناول میں جس طریقے سے برتا جاتا ہے وہ قدرے مختلف

ہے۔
ناول کی بنیاد کسی کہانی یا واقعہ پر ہوتی ہے۔اس کے بغیر ناول کا وجود ممکن نہیں ہے۔لیکن اگر اس کہانی میں تجسس نہ ہو تو وہ دلچسپ بھی نہیں ہوگا، کیوں کہ ''آگے کیا ہونے والا ہے'' جیسا سوال ہی قاری کو پورا ناول پڑھنے پر اکساتا ہے۔ تجسس گرچہ تمام قسم کے ناولوں میں پایا جاتا ہے تاہم یہ پراسراریت، تحیر اور تجسس جاسوسی ناولوں کا وصف خاص ہائی میں تجسس قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ الف لیلہ کی راوی ''رانی شہرزاد'' محض اپنی کہانی میں تجسس اور پراسراریت پیدا کرنے کے باعث سے ایک کامیاب انجام کو پہنچتی ہے۔

ای۔ایم فارسٹر Aspects of the Novel میں رقم طراز ہیں۔

"Ww Are all like Scheherazade's husband, in the we want to know what happen next. This is universal and that is why the backbone of a novel has to be a story Some of us want to know nothing else-- there is nothing in us but primeval curiousity, and consequently our other literary judgments are indicrous"

''ہم سب لوگ یہ جاننے کی خواہش کے معاملے میں کہ ''آگے کیا ہونے والا ہے'' شہرزاد کے شہر کی مانند ہیں۔ یہ ایک عالمگیر عنصر ہے اور یہی سبب ہے کہ کہانی ''ناول کی روح'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ہم میں سے بعض لوگ اور کچھ نہیں جاننا چاہتے، ہمارے اندر ایک تجسس کے سوا اور کچھ نہیں، نتیجتاً ہمارے دوسرے ادبی فیصلے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔''

"Aspets of the Novel" آنے کے بعد پلاٹ کو فارسٹر کی بتائی ہوئی تعریف اور مثال کے ذریعے سمجھا جانے لگا۔ یعنی ایسے واقعات کا بیان جس کی بنیاد اسباب و علل پر قائم ہو، دراصل وہی پلاٹ ہے۔کہانی اور پلاٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کہانی میں کیا ہوا؟ کی اہمیت ہے جب کہ پلاٹ میں کیوں ہوا؟ کی۔ کیا ہوا؟ میں تجسس کا عنصر چھپا ہوا ہے جب کہ کیوں ہوا؟ میں اسرار کا۔ جاسوسی ناول میں ان دونوں کی بہت اہمیت ہے۔ مثلاً کسی ناول کی کہانی قتل کی واردات سے شروع ہوتی ہے تو قاری تجسس میں پڑ جائے گا کہ اس قتل کے محرکات اور اسباب کیا ہیں؟ دراصل تجسس اور پراسراریت کسی بھی قسم کے ناولوں کی بنیادی ہے لیکن جاسوسی ناول اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کا پلاٹ Thriller (خوش ہیجان) پر قائم ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دوسرے ناولوں کے بالمقابل تجسس (Suspense)، سریت (Secret)، جوش (Excitement) وغیرہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس کی وجہ قتل، ڈکیتی، چوری، کڈنیپنگ وغیرہ جیسے جرائم ہیں۔

"Thriller is a broad genre of a

literature, film and television, having numerous subgenres, Thrillers are characterized and defined, by the mods they elicit, giving viewer heightend feeling of suspense, excitement, surprise, anticipation and anxiety-"

جاسوسی ناول نگاروں میں ابن صفی ایک ایسے ناول نگار ہیں جن کی کہانیوں کا پلاٹ فنی سطح پر مستحکم اور تہہ دار ہے۔ تجسس پیدا کرنے کا ان کا اپنا ایک الگ طریقہ ہے، ان کی تحریروں میں تجسس کی دنیا اس لیے برقرار رہتی ہے کیوں کہ ان کے بعض ناولوں کی ابتداء میں جس آدمی کو مجرم سمجھا جاتا ہے، وہ نہ ہو کر ایک ایسا آدمی مجرم ہوتا جس کو ہم مقتول کا خیر خواہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ چند ناول اس کے برعکس بھی ہیں اس میں ابتدا میں جس پر شبہ کیا جاتا ہے وہی مجرم ہوتا ہے۔ ناول ''کالی تصویر'' اس کی بہترین مثال ہے۔ لہٰذا ان دونوں اقسام کی کشمکش کے سبب آخر تک یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ مجرم کون ہے؟ اور یہی چیز قاری کو تجسس میں ڈالے رکھتی ہے۔

''سریت'' زمانی تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔ چونکہ جاسوسی ناولوں میں اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان ناولوں میں زمانی تسلسل پر خصوصاً توجہ دی جاتی ہے۔ یہ بات پیش نظر ہے کہ سریت سے ذہین قاری ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ناول میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے لیے اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ پچھلے حقائق کو ذہن میں رکھے تبھی وہ ناول کے انجام سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

جاسوسی ناول میں پلاٹ کی بنیاد ایسی سائنسی ایجادات پر رکھی جاتی ہے جو قاری کو حیرت میں مبتلا کر دے۔ مثلاً منشی ندیم صہبائی کے ناول ''نقلی رئیس'' (۱۹۳۰ء) میں ایک سرجن دماغ تبدیل کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔ وہ دو عورتوں کے دماغ کو آپس میں اس طرح تبدیل کر دیتا ہے کہ آپریشن کے بعد پاگل عورت کا دل صحیح ہو جاتا ہے اور صحیح الدماغ عورت پاگل ہو جاتی ہے۔ ابن صفی کے ناول ''جنگل کی آگ'' میں جیرالڈ شاستری جیسے سائنس داں نے ایسی مشین ایجاد کی ہے جس میں وہ انسانوں کو بن مانس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح فریدی، حمید اور عمران کو لے کر لکھنے والے مظہر کلیم کے ناول ''دہائٹ شیڈ'' میں سائنس داں ایسی سولر مائکرو چپ بناتے ہیں جس میں وہ شمسی توانائی جمع کر کے مہینوں چلاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دوسرے ناول ''کایا پلٹ'' کے پلاٹ کی بنیاد انوکھے جراثیمی ہتھیار پر رکھی ہے، اس ناول میں سائنس داں نے ایسا جرثومہ ایجاد کیا ہے جو انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ مزید برآں کچھ مادی اسباب جاسوسی ناولوں کے پلاٹ کے ساتھ ہی مخصوص ہیں۔ مثلاً ٹائم مشین جس کی مدد سے ماضی اور مستقبل میں پہنچا جا سکتا ہے۔ Humanoid روبوٹ، خلائی سفر، لیزر ہتھیار، لیزر گن، ٹرانسمیٹر Alien، ہائیڈروجن بم، دیواروں کے پار سننے والا آلہ، اڑن طشتریاں Humen cloning وغیرہ۔ اور جو جاسوسی آلات استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں۔ کیمرے، ویڈیو کیمرے، ٹیپ ریکارڈر، مائکروفون، ریڈیو ٹرانسمیٹر وغیرہ۔

جاسوسی ناول میں حقیقی اور تخلیلی دونوں طرح کے شہر اور جگہوں کے ناول موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ابن

صفی کے ناول میں جہاں ایک جانب زیرولینڈ اور شکرال جیسے تصوراتی شہر دکھائی دیتے ہیں، وہیں دوسری طرف ہندوستان اور پاکستان کے شہروں میں پائے جانے والے ہوٹل، کلبا در بر وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً دلکشا، فضارو، ٹپ ٹاپ، ہائی سرکل وغیرہ۔ علاوہ ازیں حقیقی ناموں میں الٹ پھیر بھی کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً مظہر کلیم اپنے ناولوں میں امریکہ کے لیے اکریمیا، ترکی کے ترکیہ اور پاکستان کے لیے پاکیشیا جیسے ناموں کا استعمال کرتے ہیں۔ Action (عمل) جاسوسی ناولوں کا اہم حصہ ہے، البتہ چند ناول ایسے بھی ہیں جن میں Action سے کام نہیں لیا گیا مثلاً "Le Carre" کا ناول "The Talor of panama" میں نہ تو کار ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہیں اور نہ ہی بندوق کی کوئی لڑائی ہے۔ بلکہ یہ ناول بلیک میلنگ اور سازش پر مبنی ہ

انگریزی ناول نگار آئن فلیمنگ (جو۔ James Band سیریز کے جانے جاتے ہیں) نے اپنے ناول "From Russia with Love" کے پلاٹ کی بنیاد Cold War پر رکھی ہے۔ دراصل Cold wat دو قوموں کے درمیان بنا کسی فوجی عمل اور خونی جنگ کے سیاسی اور معاشی لڑائی ہے۔ جو سوویت یونین United States کے درمیان ہوئی۔ اس موضوع نے Fleming کو یہ موقع دیا کہ وہ Cold war کے متعلق اپنی معلومات قاری تک پہنچائیں۔ اس میں انہوں نے مشرق اور مغرب کے درمیان چل رہے Spying سے باخبر ہے۔

جاسوسی ناولوں کا انجام پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ آخر میں کامیابی ہیرو یعنی جاسوس کے حصے میں آئے گی، علاوہ ازیں متعدد ناولوں کا انجام بالکل ایک ہی انداز سے اختتام کو پہنچتا ہے اور کبھی تو ایک مصنف اپنے کئی ناولوں کو ایک سوچ پر ختم کرت اہے۔ مثلاً ابن صفی کے ناول چیختے دریچے'' اور ''خطرناک ناول'' میں جس طرح کے جرم سامنے آتے ہیں اور جس طریقے ان کو سامنے لائی جاتا ہے وہ ایک جیسا ہے، اسی باعث ان دونوں ناولوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔ ''چیختے دریچے'' میں پولیس محکمہ کا ایک ڈی۔ ایس۔ پی مجرم نکلتا ہے اور ''خطرناک دشمن'' میں سر جگدیش نامی ایک ایسا آدمی مجرم ثابت ہوتا ہے جو دنیا کی نظر میں اچھا آدمی ہے۔ مزید برآں وہ ناول جس میں مجرم ابتدا سے ہی سامنے ہوتا ہے اس کو معکوس جاسوسی ناول کہتے ہیں۔ مثلاً ابن صفی کا ناول ''چالیس ایک باون'' معکوس انداز میں ہے۔ اس ناول میں گرچہ مجرم ابتداء سے ہی سامنے ہوتا ہے لیکن دلچسپی اور سنسنی خیزی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ عمران اور ڈاکٹر طارق میں دلچسپ معرکہ چلتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک دوسرا ناول ''اندھیرے کا شہنشاہ'' بھی معکوس جاسوسی ناول ہے۔

جاسوسی ناول میں کرداروں کی بڑی اہمیت ہے، ان ناولوں کے ہیرو کے ساتھ چند ایسی باتیں وابستہ ہیں جو خاص طور پر انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ان کی زندگی کا مقصد جرائم کی تفتیش کرتا ہے، انہیں سیاسی، فوجی، معاشی، سماجی، صنعت وحرفت کے متعلق ہر طرح کا علم ہوتا ہے، یہ اپنے پیشے کو بہت خوشی اور مجے کرتے ہیں، چونکہ ان کرداروں کے کام کرنے کا قانونا تحریری اصول نہیں ہوتا ہے لہٰذا یہ معلومات کے حصول کی خاطر بھیس بھی بدلتے ہیں۔ انگریزی میں کانن ڈائل، فلیمنگ اور اردو میں ابن صفی کے کردار اس حد تک مشہور ہوئے کہ اکثریت ان کرداروں سے مصنف کو جانتی ہے۔

ابن صفی کا اصلی فن کردار نگاری میں ہے۔ انہوں نے فریدی، حمید اور عمران جیسے لازوال کردار پیش کرنے کے ساتھ منفی اور سپورٹنگ کرداروں کو بھی اتنا جاندار بنا دیا ہے جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ کرنل فریدی ایک ایسا ہی سنجیدہ آدمی ہے جو غیر ضروری کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ دنیا کا کوئی ایسا کام نہیں ہے جو وہ نہیں جانتا حتی کہ اپنی معلومات میں اضافے کے خاطر وہ کتوں اور سانپوں تک پہ تجربات کرتا ہے۔ وہیں دوسری جانب حمید فریدی کے برعکس ہے، اس کی پوری شخصیت مزاح میں گدمی ہوئی ہے، یہ اپنی مزاحیہ باتوں سے قادری کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے، گرچہ اسے حسین عورتوں میں دلچسپی ہے، لیکن ان سے دوستی رکھنے میں کبھی حد سے تجاوز نہیں کرتا ہے۔ فریدی اور حمید کے بعد ابن صفی نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا جو اپنی ذات میں تنہا ہے، جس کی ظاہری اور باطنی شخصیت تہ دار اور پراسرار ہے۔ یہ ایسا جاسوس ہے جو بحیثیت ''ایکس ٹو'' کام کرتا ہے اور اس نام سے صرف اپنے ملک کے لوگ ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیم بھی دہشت زدہ رہتی ہے۔ ایکس ٹو کے رول میں عمران نے اپنی ذہانت اور ہمت کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ دراصل اس کے کردار میں فریدی اور حمید دونوں کے عکس ہیں۔ اسے نہ تو کسی سنجیدہ شخص کی ضرورت ہے اور نہ کسی کامیڈین کی، یہ حماقت کے فلسفے کا قائل ہے اور خود کو احمق بنا کر پیش کرتا ہے اور اسی حماقت اور مذاق میں اپنا مقصد بھی پورا کر لیتا ہے۔ یہ خوش مزاج ہے لیکن ضرورت پڑنے پر اس کا بھیانک روپ بھی سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کردار میں محض ہیرو نہیں بلکہ ''اینٹی ہیرو'' ہونے کے تمام عناصر ہیں۔ غرض کہ ابن صفی کے یہ تینوں کردار شرلاک ہومز اور جیمس بانڈ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ لوگ ان کو فلموں کے بالمقابل ناول کے ذریعے زیادہ جانتے ہیں۔ جب کہ رلاک اور جیمس فلموں سے زیادہ مشہور ہوئے۔ چونکہ ابن صفی مشرقی اقدار و روایات کے پاسباں تھے، لہٰذا ان کے ناولوں کے ہیرو اخلاقی اقدار کے پابند ہوتے ہیں۔ مثلاً ابن صفی کے یہ تینوں کردار نہ تو شراب پیتے ہیں اور نہ عورتوں سے جذباتی وابستگی اور دلچسپی رکھتے ہیں، جب کہ بونڈ شراب پیتا ہے اور عورتوں کے سلسلے میں اس کا کردار ''آلودہ'' ہے۔ ابن صفی کے منفی کرداروں میں ''تھریسیا'' اور ''سنگ ہی'' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ''سنگ ہی'' کردر ''خونی بگولے''، ''لاشوں کا بازار''، ''جونک کی واپسی'' میں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ''تھریسیا'' ناول ''کالے چراغ''، ''درندوں کی بستی''، ''پیاسا سمندر''، ''سہ رنگی موت'' اور ''شوگر بینک'' وغیرہ میں۔ یہ دونوں کردار کئی اہم خصوصیات کے حامل ہیں۔ ''سنگ ہی'' مارشل آرٹ کا ماہر ہے جو برستی ہوئی گولیوں میں خود کو بچا سکتا ہے۔ تھریسیا زیرولینڈ کی سربراہ ہے جو بے پناہ صلاحیتوں اور ذہانت کی مالک ہے اور اپنی اسی ذہانت کے باعث فریدی اور عمرنا کے ہاتھ کبھی نہیں آتی ہے۔ علاوہ ازیں فیاض، جوزف، صفدر، جولیا، رشیدہ وغیرہ جیسے کرداروں نے بھی ان کے ناول کو بلند معیار عطا کیا۔

جاسوسی ناول کا بیانیہ سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ ان میں کوئی ایسی پیچیدگی نہیں ہوتی جو قاری کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ ان ناولوں میں مکالمے سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس کے اپنے کچھ مخصوص Trems اور اصطلاحات ہیں جو دیگر ناولوں میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کجینس (Cove)، خفیہ ہتھیار (Secret weapon)، Double Agent

نگرانی (Surveillance) وغیرہ۔ علاوہ ازیں اس میں دیگر ناولوں کی طرح طنز (Irony)، پیکر تراشی، کلائمکس، اینٹی کلائمکس، تشبیہ، منظر کشی وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ ان فنی لوازم کو ابن صفی کے ہی ناولوں میں خوبصورت طریقے سے برتا گیا ہے۔

ناول ''برف کے بھوت'' سے تشبیہ کی ایک مثال دیکھئے۔

''سردیوں میں ساری رونق ختم ہو جاتی ہے۔ درختوں کے تنوں سے لپٹی ہوئی خوبرو بیلیں اپنے زرد، نیلے اور سرخ پھولوں سمیت سیاہ رنگ کی پتلی پتلی ڈوریوں کی شکل میں تبدیل ہو کر جھولتی رہ جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گوشت چھوڑ کر ہڈیاں پھینک دی ہوں۔''

چونکہ ابن صفی کی توجہ زیادہ تر کہانی کی طرف ہوتی تھی لہٰذا انہوں نے ضرورت کی خاطر ہی منظر کشی کی ہے۔ البتہ جہاں کہیں بھی ضرورتاً کی ہے قابل تعریف ہے۔ وہ منظر کشی مختصر ترین الفاظ میں کرتے ہیں۔

''شام کا سورج یہاں بڑی رنگینیاں بکھیر دیتا ہے۔ جھیل کے بھرے سینے پر نارنجی رنگ کے چمک دار لہریے ناچتے رہتے ہیں۔ پھلوں کی تاک میں منڈلانے والے پرندوں کی تیز سیٹیاں دور دور تک پھیلتی ہیں۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں اور رنگین جھونپڑوں کا عکس جھیل کی ہر لرزش سطح پر عجیب سا سماں پیش کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی اکتائے ہوئے مصور نے کئی رنگ کینوس پر چھڑک دیے ہوں اور انہیں بے ترتیبی سے چاروں طرف پھیلاتا چلا گیا ہو۔''

جاسوسی ناول کی خاطر بات یہ ہے کہ کئی مصنف بذات خود اس جاسوسی پیشے سے منسلک رہ چکے ہیں۔ John le carre جاسوسی اداروں Mi-5, Mi-6 میں ملازمت کر چکے ہیں۔ آئن فلیمنگ جنگ عظیم کے دوران برطانوی نیول انٹیلی جنس کے لیے کام کر چکے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کا پولیس ڈیپارٹمنٹ اپنے کاموں کے سلسلے میں ابن صفی سے مشورے لیتا تھا۔

غرض کہ آج سے چالیس سال قبل جاسوسی ادب اپنے عروج پر تھا۔ لیکن آج کسی بھی قسم کی مقبول ناولوں کی حالت اچھی نہیں ہے اور اس کی وجہ انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جاسوسی ناول نگار آج بھی اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے ہیں اور اپنی تحریروں سے اس صنف کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں John Le Carre Deighton، اور اردو میں مظہر کلیم وغیرہ بھی لکھ رہے تھے جن کا انتقال حال ہی ہوا۔ جن کا مشہور ناول ''ناقابل تسخیر''، ''خاموش چیخیں'' وغیرہ ہیں۔ انسپکٹر جمشید سیریز اور انسپکٹر کامران مرزا سے مشہور ہونے والے اشتیاق احمد کا انتقال جلد ہی ۲۰۱۵ء میں ہوا۔


۷۸۶
دائمی آرام گاہ
ابن صفی
اسرار احمد
پیدائش ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء
وفات ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء